



# میباچہ

ہمارے ملک میں ایسے قارئین کی تعداد بہت زیادہ ہے جو پراسرار اور خوفزدہ کمانیوں کے شیدائی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جتنا مجتنس شاید ہی کوئی اور ہو، ہر شے کے بارے میں تجسس اور جانے کی جستجو کرتا ہے اور اگر کوئی بھی اس کی سمجھ میں نہ آئے اور اس کی عقل سے ماوراء کوئی بات ہو جائے تو اسے پراسرار کہہ کر اپنے اندر کے تجسس کی تسلیکین کرنا چاہتا ہے۔

پراسرار، خوفناک اور ڈراونی کمانیاں لکھتا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ محدودے چند قلعکاروں نے ہی اس میدان میں طبع آزمائی کی بات کی ہے۔ محترمہ سیما غزل نے ”کال نیل“ لکھ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی بھی طرح مرد حضرات مصطفین سے کم نہیں ہے۔

سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی یہ طویل داستان اتنی دلچسپ اور اسرار انگیز ہے کہ ایک بار شروع کر کے ختم کیے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ پوری کمائی دہشت، خوت اور اسرار میں ڈوبی ہوئی ہے۔ سپنیں اتنا کہ ہر صفحے پر یہ توقع ہوتی ہے کہ کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے۔

کمائی میں خوفناک آدم خور مکثیوں نے اتنی دہشت پھیلائی ہے کہ پڑھنے والا بار بار اپنے کپڑے جھاڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کمائی کا مرکزی کردار ایک مسلمان نوجوان ہے جس پر یونان کی دیوی ”زیوسا“ جو سکس، بدی، تباہی اور سوت کی دیوی کہلاتی ہے، عاشق

# لے کر میں

”طیب! خیرت ہے نا؟“

”خیرت ہی تو نہیں ہے۔ وہ مجھے بلیک میل کر رہی ہے۔ اس نے مجھے لیشن دلانے کی کوشش کی ہے کہ میں ہی اینا کا قاتل ہوں اور اگر وہ یہ بات پولیس کو اور ایلیسا کو بتا دے تو مجھے کہیں پناہ نہیں ملتے گی۔ میں گاڑی ٹھیک کرنے کی وجہ سے گیا تھا۔ اس کے نازروں پر خون تھا اور بپر پر ڈینٹ پڑنے کے علاوہ اس کے خون کے وجہ سے اور بال پچکے ہوئے تھے۔ میں نے تمن کھٹکی کی محنت سے گاڑی صاف کی ہے مگر وہ کہتی ہے کہ وہ جب چاہے گی، گاڑی بالکل اسی پوزیشن میں پولیس کو مل جائے گی جس پوزیشن میں ایکمیڈنٹ کے بعد تھی۔“

”یار ضیاء! خدا کی قسم! وہ اچانک میرے سامنے آگئی تھی۔ میں نے اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر میں جدھر گاڑی موڑتا تھا، وہ بھی ادھر ہی بھاگتی اور بالآخر.....“

”اوہ.....!! یہ بتاؤ آگے، یہ پھر تو فون نہیں آیا اس کا؟“

”نہیں.....! شاید نہیں.....! میں نے کسی سے ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے، وہ کرے۔ یہ ہے کیا بلا یا؟“ وہ کافی پریشان تھا۔ ”اگر یہ بات کسی کو پتا چل گئی تو؟“

”تم نے کہا نہیں کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔“ میں نے پوچھا۔

”اتا ہوش کب رہا تھا۔“

”خیر.....! تم نے پتھر کا کیا کیا؟“

”یہ.....باندھ لیا.....“ اس نے دایاں بازو آگے کر دیا۔ وہ واقعی موم جامہ کر کے اسے باندھ ڈکا تھا۔

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اب تم بے گلکر ہو جاؤ۔ وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکے۔“

ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک عیسائی لڑکی ”ایلن کی بدرجہ“ ایک ساحہ کی مدد سے موت کا بازار گرم کیے ہوئے ہے اور اس نوجوان کی جان کے درپے ہے۔ ”زیوس“ اور ”ایلن“ کا تکڑا ہو جاتا ہے۔ کمالی کی اس موز پر سسپن اور بجتیں انتہا کو پہنچ باتا ہے۔

کتاب کی زیادہ تعریف کرنا مناسب نہ ہو گا کیونکہ بہترین منصف قارئین ہیں جو نہ وہ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔

طوالت کی وجہ سے کمالی دو حصوں میں پیش کی جا رہی ہے۔ قارئین سے انتہا ہے کہ اپنی قیمتی آراء اور مشورے سے نوازتے رہا کریں۔ خاص طور پر تعمیری تنقیدی خطوط کا انتظار رہے گا۔

اب میں کمالی اور آپ کے درمیان سے ہٹ جاتا ہوں۔ کمالی شروع کرنے سے پہلے اپنے آس پاس یہ ضرور دیکھ لیجئے گا کہ کوئی کمڑی تو نہیں ہے!

نیاز مند  
عبد الغفار

گیا ہے کہ ہم ایک سایہ دار جگہ میں چند لمحے ستانے کو رکے پیں مگر یہی دنیا کسی کسی کے لئے کافیوں سے بھرا میدان، کسی کے لئے خوفناک درندوں سے پا جگلن اور کسی کے لئے لق و درق پتے صحرائی طرح ہے۔ ہم یہاں سے اپنے دکھ سکھ، اپنے اعمال، تینکی اور بدی، بد نیتی اور خلوص یہ سب کچھ لے کر آگے چلے جائیں گے۔ ہمارے کردار کی مضبوطی، ہماری سیلیاں آگے آنے والے اندر ہیری را ہوں میں روشن ہو کر ہمیں راستہ دکھائیں گی۔ کیا تم ان باقوں پر بیکیو کرتی ہو؟“

میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے چہرے کے عضلات ڈھیلے پڑ گئے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں صبر ہچکو لے لینے لگا ہے۔ یہ بات میرے لئے امید افراحتی۔ اس نے دھیرے سے سر بلا دیا۔ میں نے اسے چائے آفر کی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے منع کر دیا۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلانا چاہتا تھا۔ میں دن میں اس پوری عمارت کا جائزہ لے کر دیکھ چکا تھا کہ کچن کدھر ہے۔ اس نے تشكیر انداز میں مجھے دیکھا اور لیٹ گئی۔ میں پکن میں چلا آیا۔

چائے بنتے ہوئے میں نے تمام کیبٹھ کھول کر ہر چیز کا جائزہ لیا۔ مجھے پتا تھا کہ ایسا بہت دنوں تک کچھ پکانے کے قابل نہیں ہو سکے گی۔ ہو ٹلنگ میرے لئے ناقابل برداشت تھی اس لئے میں خود ہی پکانا اور کھانا چاہتا تھا۔ میں نے چائے بنا کر ٹرے میں سامان رکھل۔ اس وقت چھپوں کی دراز کھوئی تو سامنے ہی ایک بڑی سی پچکدار چھری پر میری نگاہ پڑی۔ بجلی سی کونڈی پتا نہیں کیوں میں چند لمحے تک اسے تکتارہا حالانکہ وہ ایک عام کی چھری تھی جو کچن میں کام آتی تھی۔ اس کا پھل غالباً چاندی کا تھا جو چپک رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس چھری پر نگاہ پڑتے ہی میرا ذہن ماؤف ہو گیا ہے۔

پھر میں خود بخوبی چونک کر ٹھیک ہو گیا۔ میں نے چچھ نکال کر جھٹکے سے دراز بند کر دی۔ چائے لے کر ایسا کے پاس آیا۔ ہم نے چائے پی۔ میں ایسا کو بھلانے میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ وہ اب پسلے کی نسبت بہت تیز تھی۔

”مشتری ضیاء! سوری.....! مجھے تمہارے کام کرنا چاہیے تھے مگر.....“

”نہیں ایسا! تم میری ملازم نہیں ہو۔ یہ بھی تمہاری میران ہے کہ تم ہم سے اتنا خلوص برت رہی ہو۔ ویسے بھی میرا کام کرنا تمہاری ذیوٹی قطع نہیں تھی۔ میں ایسی بے ترتیب اور تکلیف دہ تقسیم کو پسند نہیں کرتا۔ میں اپنا کام اپنے ہاتھ سے کر کے خوش رہتا

گی۔“ میں واقعی مطمئن ہو گیا۔

”لیکن ضیاء.....! تم..... تم کیا کرو گے؟“

”میری فکر نہ کرو۔ میں آج رات یہ طے کر لوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔“

”ایسا یا کی حالت خراب ہے۔“ اس نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔

”ہا.....! میں نے اسے ڈاکٹر کو دکھایا تھا۔ اسے بہت صدمہ پہنچا ہے لیکن تم فکر نہ کرو۔ کیا تم گاڑی میں آئے ہو؟“

”ہا.....! میں فون پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔“

”اچھا کیا۔ فون پر کرنے والی بات بھی نہیں ہے۔ آئندہ بھی احتیاط کرنا اور سنو! اب اگر فون آئے تو کہہ دینا کہ میں اس کے فون کا منتظر ہوں۔ اس سے زیادہ بات نہ کرنا اور فون بند کر دینا۔ دیکھیں گے کہ اس کا اگلا قدم کیا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”تم ایسا کا خیال رکھنا۔“

”اوکے.....! تم جلدی چلے جاؤ۔“ مجھ پر اچانک ہی گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ایک عجیب سی بے چینی نہیں کی طرح مجھ میں اٹھی تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو یا کچھ ہو گیا ہو۔ میں طبیب کے ساتھ یعنی تک آیا۔ اسے گاڑی میں بٹھا کر روانہ کر دیا۔ کچھ دیر تک اس کی گاڑی کو جاتے دیکھتا رہا پھر لوٹ کر ڈرانگ روم میں داخل ہوا۔ ایسا بے سده سی صوفے پر پڑی تھی۔ میں اس کے قریب بیٹھ گیا۔

”ایسا.....! تم ٹھیک ہو نا.....؟“ میں نے دھیرے سے اسے پکارا تو اس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ وہ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

”ایسا! ہر شخص مرنے کے لئے ہی دنیا میں آتا ہے۔ کیس ایسی جگہ سے جو اس کے ذہن سے گھو ہو جاتی ہے اور آگے ہی آگے پڑھتا ہے۔ یہ ارتقاء کی منازل ہیں،“ ہمیں خوب علم ہے کہ اب اس زندگی کے بعد ہمیں کسی اور زندگی میں، کسی اور دنیا میں جانا ہے۔ جیسے ہم اب سے پسلے کے حالات سے ناواقف ہیں، ویسے ہی آنے والے واقعات سے بھی ناواقف ہیں۔ تم بھی چل جاؤ گی۔ میں بھی اور باقی سب بھی..... ہماری جگہ نے آنے والے لے لیں۔ گے۔ تم نہ پچی ہو، نہ زندگی اور موت کی حقیقت سے ناواقف..... مجھے نہیں معلوم کہ بعد از موت زندگی کا تمہارے ہاں کیا تصور ہے مگر ہمارے ہاں اس کا برا خوبصورت تصور ہے۔ ہمیں قدم قدم پر اس حقیقت کا احساس دلایا

طیب واپس گھر نہیں پہنچا ہے۔ ایسی کوئی بات انہوں نے نہ کی جس کا تعلق زیوسایا کسی قسم کے جیرتاک واقعہ سے ہو۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ میں کن انکھیوں سے ایسا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ اب کمزوری کے باعث اونگ چاہتی تھی۔ میں نے چاہا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرے گراں نے کہہ دیا تھا کہ وہاں وہ ایسا کے ساتھ رہتی تھی اس لئے بہ اس کی غیر موجودگی کو بہت زیادہ فیل کرتی ہے اور وحشت کا شکار ہو جاتی ہے اس رکھ کراں کے قریب آگیا۔

”ایسا! کیا اس کمرے اور میرے والے کمرے کے علاوہ اتنی بڑی کوششی میں دوسرا کوئی کمرا نہیں..... آئی میں بیڈ روم.....“  
”آں.....! ہے..... تمہارا روم کے بازو والا روم ہے مگر وہ گیٹ کا ہے۔ ام وہ روم یوں نہیں کرتا۔“

”یہاں اب کوئی گیٹ نہیں آئے گا۔ تم وہاں آرام کرو۔“

وہ تیار نہیں تھی مگر میں نے زبردستی اسے راضی کیا۔ اس سے چالی لے کر اوپر گیکا۔ کمرا کھولنا تو ایک منک سی چاروں طرف پھیل گئی۔ یہ کمرا اندر سے سفید رنگ سے پینٹ کیا گیا تھا اور یہاں کاسارا فرنچ بیک لکڑی کا تھا جس کے کناروں پر سنرے رنگ کی باریک پیشیاں سی بڑی تھیں۔ یہاں سفید، سنرے اور کالے ہی بہت سے کشن بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ مجھے یہ کمرا بہت اچھا لگا۔ جی چاہا کہ یہاں خود شفت ہو جاؤں اور اپنا کمرا ایسا کو دو۔ مجھے بات مالنا پڑی۔ بہانہ کیا کہ مجھے اچانک یاد آگیا ہے کہ ایک اہم فون کرنا ہے۔ اٹھنے اٹھنے میں نے ٹنک کے گھرے سائے دیکھ لئے تھے جو اس کی بوڑھی آنکھوں میں چکتے گدے پانی میں تیر رہے تھے۔ میں اس حالت میں اسے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے طیب کے گھر کا نمبر؛ انکل کیا۔ فون حسب توقع زہرہ آپانے اٹھایا۔ میں ان سے بات کرتا رہا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ رات ڈنر پر پہنچوں گا مگر رات تو میری ایسا کی تجھیز و تیفین میں گزری تھی۔ میں نے ان سے نہ پہنچنے پر مذمت کی۔ انہیں طیب کی زبانی پا چل چکا تھا کہ کیا ہوا ہے لیکن وہ اب پھر آنے کو کہہ رہی تھیں۔ میں نے آفس کے کام کے بہانہ کر کے ان سے چند روز کی چھٹی لے لی۔ انہی سے پتا چلا کہ ابھی تک

ہوں۔ مجھے کسی پر بوجھ بننے کی عادت بھی نہیں ہے۔ تم اس طرف سے کوئی فکر نہ پالو۔ نہ ذہن کو بوجھ کرو۔ بس میں تمہیں صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم صرف اتنا سوچو کہ اب تمہاری بیٹی یہاں کے سنگدل لوگوں کے درمیان نہیں ہے کہ گھٹ گھٹ کر زندگی گزارے۔ وہ اب بڑی مربیان اور رحم کرنے والی ذات، خدا تعالیٰ کے پاس ہے۔ وہ جو اپنے بندوں سے کسی بے پناہ شفیق ماں سے بڑھ کر پیار کرتا ہے۔“

”تم بہت ناکس میں ہو مسٹر ضیاء! مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے ملے بغیر، تمارے لئے بری رائے قائم کر لی تھی میری اسی غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا ملی ہے۔ اگر میں ایسا کو یوں نہ چھپا تی تو شاید وہ اس وقت میرے ساتھ چکن میں ہوتی اور بقول تمہارے، وہ یہ شرارت نہ کرتی جو اس نے میرے ساتھ کی اور ہاں، مسٹر ضیاء.....! کیا“

”کیوں نہیں.....؟“ میں جھوٹ کو صرف اس وقت اچھا سمجھتا ہوں جب وہ کسی کی بھتری کے لئے بولا جائے۔“

”جب ایسا نے تم لوگ کو اسکو اُش دیا تھا تب تم نے یا..... طیب نے اس کو ڈس ہارٹ تو نہیں کر دیا تھا کہ وہ یوں گھرچھوڑ کر چل گئی اور.....“

”نہیں ایسا! اس سے تو ہم ملے بھی نہیں تھے۔“ میں بے ساختہ کہہ بیٹھا۔ شاید اس لئے کہ میں اس سے بچ بولنے کا وعدہ کر چکا تھا۔

”مگر تم کہہ رہے تھے کہ.....“

”اوہ! وہ تو..... وہ تو.....“ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اسے کیا جواب دوں۔ مجھے بات مالنا پڑی۔ بہانہ کیا کہ مجھے اچانک یاد آگیا ہے کہ ایک اہم فون کرنا ہے۔ اٹھنے اٹھنے میں نے ٹنک کے گھرے سائے دیکھ لئے تھے جو اس کی بوڑھی آنکھوں میں چکتے گدے پانی میں تیر رہے تھے۔ میں اس حالت میں اسے خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں نے طیب کے گھر کا نمبر؛ انکل کیا۔ فون حسب توقع زہرہ آپانے اٹھایا۔ میں ان سے بات کرتا رہا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ رات ڈنر پر پہنچوں گا مگر رات تو میری ایسا کی تجھیز و تیفین میں گزری تھی۔ میں نے ان سے نہ پہنچنے پر مذمت کی۔ انہیں طیب کی زبانی پا چل چکا تھا کہ کیا ہوا ہے لیکن وہ اب پھر آنے کو کہہ رہی تھیں۔ میں نے آفس کے کام کے بہانہ کر کے ان سے چند روز کی چھٹی لے لی۔ انہی سے پتا چلا کہ ابھی تک

بلب جلا دیا مگر کچھ دیر بعد مجھے اس بلب کی روشنی بھی چینے گئی تو میں نے اٹھ کر وہ بلب بھی بجھا دیا۔ کمرے میں گھپ اندر ہرا چھا گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ دھیرے دھیرے ذہن کو سوچوں سے آزاد کر لیا اور مکمل آرام دہ نیند لینے کا ارادہ کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

اب احساس ہو رہا تھا کہ میرے اعصاب میں بے پناہ کھنکاؤ ہے۔ چند لمحے کو تو بے چینی کی رہی پھر نیند غالب آئے گئی۔ غنو دی سی چھا گئی۔ باہر گمراہنا میجھے برا پر سکون لگ رہا تھا جبکہ طیب کا گھر ایسی جگہ تھا جہاں تین اطراف بڑی مصروف سڑکیں تھیں۔ آدمی رات کو وہاں سے گزرنے والے ٹرینک کی ساعت چیڑا لئے والی آواز مجھے سخت اذیت دیتی تھی جبکہ یہاں دور تک نہ رہائشی علاقہ تھا، نہ فلیٹ جس میں دن رات بچوں کا شور گونجتا اور نہ ہی کوئی مصروف سڑک کہ ٹرینک کی آواز نیند اور سکون میں حارج ہوتی۔

میں دھیرے دھیرے جیسے انہی کنوں میں اتر رہا تھا۔ اچانک میری حس ساعت چونک اٹھی۔ عجیب سی سرسراہٹ تھی جسے میں نے پہلے پہل تو کوئی اہمیت نہ دی مگر جب مسلسل یہ آواز آئے گئی تو بت ناگوار گزیری۔ پہلے میں غنو دی میں اس کو محسوس کر رہا تھا اور ختم ہونے کا منتظر تھا پھر میں مکمل طور پر بیدار ہو گیا۔ بیدار ہو کر میں نے قوت ساعت کو اس آواز پر مروکز کر لیا۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے اور کس کی آواز ہے؟ ذرا غور کرنے پر محسوس ہوا جیسے کوئی کسی چیز کو فرش پر گھیٹ رہا ہے۔ میں نے پھر غور کیا اور اپنے اس خیال کی خود ہی تردید کر دی۔ آواز ایسی تھی جیسے کوئی چیز ریگ کر رہی ہو۔ کوئی ایسی چیز جس کے رینگنے سے ہلکی سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ پہلا خیال مجھے یہی آیا کہ سنسان علاقہ ہے۔ شاید کوئی جانور، کتا یا میل۔۔۔۔۔ یا کوئی اور جانور اپنے کسی شکار کو گھیٹ کر کسی کو نئے میں لے جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے سر اٹھا کر باہر والی کھڑکی کو دیکھا۔ یہاں بھی دونوں طرف کھڑکیاں اسی رخ پر تھیں جس رخ پر دوسرے کمرے کی کھڑکیاں تھیں۔ باہر والی کھڑکی بند تھی۔ میں نے سامنے والی اس کھڑکی کی طرف دیکھا جو ڈرائیکٹ روم کی طرف کھلتی تھی، وہ بھی بند تھی۔

مجھے یاد آگیا کہ میں نے کھڑکیاں کھوئی ہی نہیں تھیں۔ اب میں نے تائٹ بلب جلا دیا۔ اس کی روشنی اندر ہیرے میں کافی تھی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی۔

مجھے بت بھوک لگ رہی تھی۔ ایسا سوچکی تھی۔ میں نے اپنے لئے کھانا کھالا اور ویس ڈرائیکٹ روم میں پڑی ڈائیکٹ نیبل پر بیٹھ گیا۔ ابھی میں ٹھیک سے کھا بھی نہیں پایا تھا کہ کال نیبل نج اٹھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ آنے والے نے وہ کال نیبل بجائی تھی جو اندر ہونی عمارت کے لینی ڈرائیکٹ روم کے دروازے پر گئی تھی۔ ایسا مجھے بتاچکی تھی کہ باہر گیٹ والی کال نیبل کا کٹکش پکن میں ہے جبکہ ڈرائیکٹ روم کے باہر والے دروازے کی کال نیبل کا کٹکش ڈرائیکٹ روم میں، میں نے نوالہ پلیٹ میں رکھ دیا۔ اٹھ کر دروازے تک گیا اور یہی سوچتا رہا کہ بھلا کون آسکتا ہے۔

”لیب.....؟“ ایک خیال آیا۔

میں نے دروازہ کھولا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں ایک قدم آگے بڑھا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ اب عمارت کی باہر والی دیواروں کے کناروں سے اندر ہیرے پھوٹنے لگے تھے۔ میں نے باہر کی طرف لگے سوچ بورڈ کا بنن آن کر دیا۔ باہر لان کے قریب لگا بلب روشن ہو گیا۔ کہیں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے ڈرائیکٹ روم کے دروازے کی پیشانی پر لگا بلب بھی روشن کر دیکھا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ میں اندر داخل ہونے لگا بھی میری نگاہ کال نیبل کے قریب سے اندر جاتی ایک بڑی سی مکڑی پر پڑی۔ میں ٹھیک گیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اس کی جسامت تو کافی بڑی تھی مگر وہ قطعی عام سی مکڑی تھی۔ خوف کی ایک لمبجو مچھ میں اٹھی تھی، ختم ہو گئی۔ وہ یوں رینگت ہوئی اندر جا رہی تھی جیسے کال نیبل اسی کے لئے دروازہ کھولا ہو۔

مجھے ہنسی آگئی، میں نے ہنس کر کہا۔ ”بی کھڑی! بھلا کال نیبل بجائے کی کیا ضرورت تھی؟ تم دروازے کے نیچے سے ریک کر بھی آسکتی تھیں۔“ وہ اندر داخل ہو گئی۔ میں نے اسے مارنے یا بھگانے کی کوشش نہیں کی۔ جب وہ چوکھت سے ہوتی ہوئی اندر کی دیوار پر پہنچ گئی تب احتیاط ہے دروازہ بند کیا۔ واپس ڈائیکٹ نیبل پر آبیٹھا اور کھانا کھانے لگا پھر وہ مکڑی میرے ذہن سے بالکل نکل گئی۔ میں نے کھانا کھا کر برتن پکن میں رکھے اور ایسا کا کھانا فریج میں رکھ کر اپر اپنے کمرے میں آگیا۔

میں سونا چاہتا تھا نیند اور میکن بھر غالب تھی۔ میں کمرے میں آتے ہی کپڑے تبدیل کر کے لیٹ گیا۔ یہ شاید پسلا موقع تھا کہ میں اتنی جلدی لیٹا ہوں۔ ورنہ عام طور پر رات گئے تک جاتا رہتا ہوں۔ میں نے لائٹ بند کر دی۔ نائٹ

خوفناک تھیں کہ مجھے کھڑکی دوبارہ کھولنے کی ہست نہ ہو رہی تھی مگر میں یوں تو نہیں بیٹھا رہ سکتا تھا۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرتا تھا۔ اسے ڈھونڈنا تھا جو ان آوازوں کا سبب تھا۔

میں نے اس بار خود پر قابو پا کر پھر کھڑکی کھول دی۔ چپ چپڑ کی تیز اور کریسہ آوازوں نے میری سماعت اور حلقت تک میں خراشیں ڈال دیں مگر میں نے اس بار سر نکال کر ڈرائیور مک روم کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا لیکن..... میری ریڑھ کی پڑی میں برف بھینٹے گئی۔ بے پناہ شدید بدبو کے بیکے مجھے پیچھے دھکیل رہے تھے۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ اس سے پہلے ہی میں سانس روک چکا تھا۔ مجھے الٹی آنے گئی۔ میں بھاگ کر باتحہ روم میں گیا۔ لگا جیسے کیجھ منہ کے ذریعے باہر آنے کو ہے۔ آنسیں سخنچ گئیں۔ جتنا کھلا پیا تھا، سب باہر آگیا۔ بدنا پر برف جی محسوس ہونے کے باوجود میری پیشانی پر پیٹنے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ میں نے چند لمحے خود کو سنبھالنے کے لئے وقف کر دیئے پھر میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جسے میں لاٹھی کے طور پر استعمال کر سکتا۔ اب مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ نیچے کوئی کتابی ملی ہے جو اپنے شکار مخصوص رہا ہے۔ وہ بدبو بھی سڑے ہوئے گوشت کی سی تھی۔ اب میری حالت کچھ بستر ہو چکی تھی۔ میں نے کسی بھی ایسی چیز کی تلاش شروع کر دی جو اس جانور کو بھاگنے اور خود کو بچانے کے کام آسکے۔ مجھے بیٹھ کے نیچے سے ایک پچکدار راڑ مل گئی جو غالباً اپنے وغیرہ میں کام آتی ہے۔ میرا خوصلہ بڑھ گیا۔ میں دبے پاؤں نیچے چل پڑا۔ مجھے حرمت اس بات پر تھی کہ بند کرے میں وہ جانور آیا کیسے؟

میری حرمت اگلیز بینائی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ میں ایک دم نیچے نہیں اتر ا بلکہ میں نے وہیں آڑ میں کھڑے ہو کر پورے کمرے کا جائزہ لیا۔ جہاں جہاں میری نگاہ جا سکتی تھی، وہاں وہاں کچھ بھی نہیں تھا تبھی میں نے محسوس کیا کہ آواز اس کمرے سے نہیں آرہی بلکہ کہیں اور سے آرہی ہے۔ میں الجھ گیا پھر بھی میں نے بڑے محتاط انداز میں ڈائیور نیبل کے نیچے، صوفوں کے پیچھے دیکھا اور پھر چھپے چھپے کو چھان مارا۔ مگر یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ آواز مسلسل آرہی تھی۔

یہ اکٹھاف مجھ پر اچانک ہوا کہ آواز اپر سے آرہی ہے۔ بے اختیار میں نے سر انداز کر اور دیکھا۔ اور پر میرا کمرا تھا یا پھر وہ کمرا جو آج سے پہلے میرا تھا اور اس وقت اس ... ایسا یا سورہی تھی۔ میں تیزی سے یہڑھیوں کی جانب بڑھا، تاکہ اور پر جاسکوں مگر پھر میلی

فرش دیکھا، کچھ دکھائی نہ دیا۔ سب کچھ نہیک تھا۔ میں نے روشنی بجھا دی اور تکیہ کانوں پر رکھ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اب وہ سر سراہٹ یا تو ختم ہو گئی تھی یا یہ تکیے سے کان بند کرنے کا نتیجہ تھا۔ میں پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ گھری غنوگی تھی کہ میں نے چپ چپڑ کی کریسہ آبیز آوازیں نہیں۔ میں پھر ڈسٹرپ ہو گیا۔ یہ بھی یقین ہو گیا کہ شاید کوئی کتابی ملی ڈز کر رہے ہیں اور بڑی بد تیزی سے کر رہے ہیں۔ میں نے زور سے کروٹ لی۔ دوسرا تکیہ بھی اٹھا کر کان پر رکھ لیا مگر آوازیں میں جیسے تکیے میں جذب ہونے کے بعد سماعت میں اتر رہی تھیں۔ ایسی خوفناک سی اور اتنی کریسہ آوازیں تھیں کہ میرا جی متلا گیا۔ یوں لگنے لگا جیسے کوئی میرے سرہانے بیٹھا کسی وجود کو ادھیز ادھیز کر کھا رہا ہو۔ اس کا لبو چاٹ رہا ہو۔ میں نے ہر طرح کوشش کی کہ وہ آوازیں میری سماعت سے دور اور ذہن سے محروم جائیں مگر میں بڑی طرح ناکام ہو گیا تھا جبکہ وہ آوازیں اب میرے اعصاب پر، میرے حواسوں پر چھا کر مجھ سے اور قریب ..... بالکل قریب محسوس ہونے لگی تھیں۔

آخر میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے لائٹ جلانی اور سامنے لگے وال کالا پر نگاہ پڑتے ہی میری آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ گھری رات کے تین بجاء بھی تھی۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا اور پھر میں نے سرہانے رکھی اپنی رست واج اٹھا کر دیکھی۔ اس میں بھی تین ہی بجے تھے۔ اب میری توجہ پھر اسی آواز کی طرف ہو گئی جو بتدر تک بڑھ رہی تھی۔ میں نے باہر والی کھڑکی کھوئی۔ آواز کے اتار چڑھاوے میں نہ اضافہ ہوا، نہ کی ہی آتی پھر بھی میں نے چاروں طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ باہر دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ واقعی رات بت زیادہ بہت پچکی ہے مگر کیسے .....؟

اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں بستر پر لیٹا ہوں تو بے مشکل رات کے آٹھ بجے ہوں گے۔ سویا بھی نہیں تھا، اس کا بھی مجھے یقین تھا۔ میں نے زیادہ سے زیادہ طرح میرے کانوں میں نہ اتر رہی ہوتی۔ باہر نہ کوئی کتابی ملی اور نہ ہی کوئی اور جانور تھا۔ میں نے توجہ دی تو لگا کہ آواز اس سوت سے نہیں آرہی۔ اب میں نے اندر وہی کھڑکی کھوئی اور پھر ..... گھبرا کر بند کر لی کیونکہ کھڑکی کھولتے ہی آواز کسی ہوا کے طوفانی جھکڑ کی طرح اندر داخل ہوئی تھی۔ میرے روگنے کھڑے ہو گئے۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے .....؟ یہ کون ہے .....؟ کیا ذرا سمجھ کر میں آوازیں آرہی ہیں؟“ آوازیں اتنی کریسہ اور

اچھل رہا تھا۔ کبھی فون کی طرف..... کبھی سیڑھیوں کی طرف اور پھر..... میں ایک دم دروازے کی طرف بھاگا اور میں نے دروازہ کھول دیا۔

سامنے طیب کھرا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوایاں اڑ رہی تھیں۔ شاید اندر سے چیزوں کی آواز باہر جا رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ بھی جنپ کار سن کر پاگلوں کی طرح ناچ گیا۔ ”کیا..... کیا ہو رہا ہے یہ..... ضیاء..... تم ٹھیک ہو۔“

اس نے مجھے ایسے نٹلا جیسے میرے لکڑے بکھرنے کی اطلاع سن رہا ہو۔ ”طیب.....“ میں بے بس بے ساختہ چینا اور پھر سیڑھوں کی طرف لپکا۔ زہرہ آپا بے؟“ میں چینگھ کر دو رہی تھیں۔ ان کے پیچھے اور آوازیں بھی تھیں۔ ”زہرہ آپا! کیا بات ہے؟“ میں چینگھ۔ میری نگاہیں اوپر کی طرف تھیں۔ ایسا اب بھی ذبح کے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہی تھی۔ طیب آدمی سے زیادہ سیڑھیاں چڑھ کر، خوفزدہ ہو کر دوبارہ اتر آیا تھا۔ شاید اس کی اوپر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

”ضیاء! تم ٹھیک ہو نا؟“ زہرہ آپانے بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر کردا۔ ”میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو کیا ہوا ہے؟“ میں نے بات کے دروان میں ہی اس طرف جھائکنے کی کوشش کی جہاں سے ایسا یقینے کی طرف بھیکی تھی۔ وہ یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے وہ لکڑی کے فرش پر گری ہو اور اب گھست رہی ہو۔ اس کے حلقوں سے نکلنے والی آواز غرغاہت میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

”مجھے..... تمہاری فکر تھی..... یہ کیا ہو رہا ہے۔ طیب کوئی فون سن کر تمہاری طرف بھاگا ہے۔ طیب کہاں ہے؟“

”وہ پہنچ گیا ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں آپ کو کچھ دیر میں فون کرتا ہوں۔“ میں سخت پریشان ہو گیا کہ کس طرح ان کی تملی کراؤں۔

”ضیاء..... یہ کون..... کون ہے..... کون چیخ رہا ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟“ وہ اب بھی روہانی ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

”آپا! ایسا کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ پلیز، آپ خود کو سنبھالیں۔ ہم دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔ میں فون کرتا ہوں۔ پلیز.....“

”ٹھیک ہے! اپنا خیال رکھنا ضیاء.....“

فون کی تیز آواز سن کر میں اچھل پڑا۔ مجھے حیرت بھی ہوئی اور خوف سے بدن میں سُننا ہے۔ پھیل گئی میں پلانا۔ ٹیلی فون مجھے سے چند قدم کے فاصلے پر رکھی اونچی سی نیبل پر رکھا تھا جو صرف ٹیلی فون کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ بیل مسلل نج رہی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ کچھ بولا نہیں اور پھر میں زہرہ آپا کی آواز سن کر سنانے میں رہ گیا۔ وہ مجھے پکار رہی تھیں۔ زور زور سے۔ ”ضیاء.....! ضیاء!“

”زہرہ آپا!!! کیا بات ہے؟“ میں چینگا اور پھر زہرہ آپا کی آواز بے پناہ چینپ کار میں کہیں کھو گئی۔ مجھے لگا تھا جیسے اس کوٹھی میں طوفان سا آگیا ہو۔ اوپر سے ایسا یا ذبح کیے ہوئے جانور کی طرح چیخ رہی تھی۔ اس کی کرناک چینیں تیر دھار بھالے کی طرح میرے وجود میں اتر گئیں۔ ادھر زہرہ آپا وحشت ناک آواز میں مجھے پکار رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔ ریسیور پھینک کر اوپر بھاگوں یا زہرہ آپا کی بات سنوں جو کچھ اور کہنے کی بجائے صرف مجھے پکارے جا رہی تھیں پھر ان کا جملہ بدلتا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے..... ضیاء.....! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

میں بری طرح بوکھلا چکا تھا۔ اچانک اسی وقت جب یہ طوفان زوروں پر تھا، کال نل نج اٹھی۔ مجھے یوں لگا جیسے پوری کوٹھی ایک بگولے کی طرح زمین سے اٹھ کر رکھا میں گول گول پکر لگانے لگی ہو۔ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اسی لمحے ایسا یا جو کسی نہ کسی طرح کھڑی تک پہنچ گئی تھی، مجھے پکارنے لگی۔

”ضیاء.....!! مشرضا.....! غول..... غول..... غیا.....“

میں عین اسی کھڑکی کے پیچے تھا۔ دروازے پر جو بھی تھا، کال بیل پر ہاتھ رکھ کر مسلسل بجائے جا رہا تھا۔ میں نے اوپر دیکھا۔ اسی وقت میرے چہرے پر کوئی چیز گری۔ گیلی گیلی، بلجھی سی۔ میں گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ میں نے ہاتھ سے چڑھے کو صاف کیا اور اپنے ہاتھ میں گوشت کا خون میں لھڑرا ہوا نکلا دیکھ کر بے سانتہ چیخ اٹھا۔ ریسیور سے اب تک زہرہ آپا کی آواز آرہی تھی۔ ایسا یا جو کچھ رہا تھا۔ کال بیل نج رہی تھی۔ میں بوکھلا یا ہوا تھا۔ کال بیل نج رہا تھا۔ جی متلا رہا تھا۔ سنانے تھے، بجلیاں تھیں کہ دھماکے۔ بھی میرے وجود کے لکڑے بکھیر رہے تھے۔ بے پناہ طوفان تھا، آوازوں کا، ایک شور تھا جو تباہی پھیلا رہا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح

کو کیسے پا سکتا ہوں۔ میں ائے قدموں نیچے چلا آیا۔ مجھے طیب کی فکر تھی۔ خود بھی مجھے خوف محسوس ہوا تھا جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ پتھر اب میرے پاس نہیں تھا۔ پھر اپنائک مجھے خیال آیا کہ مجھے ان مکڑیوں سے بیشہ اس پتھرنے تو نہیں پچایا۔ میں نے ایک بار نہیں، ہزار بار ان مکڑیوں کو دیکھا ہے۔ مبشر کی ادھڑی ہوئی لاش سے چمنی مکڑیاں تو میں نے بہت قریب سے دیکھیں تھیں۔ انہوں نے کبھی مجھے نقصان نہیں پہنچا تھا۔

میں تو صندوچی میں مکڑی کو کہتے ہی دن تک قید رکھ چکا ہوں۔ تب ہمیں مجھے کچھ نہیں ہوا تھا۔ پھر تو مجھے شال بیانے بست بعد میں، کچھ ہی عرصہ پسلے دیا تھا۔ مبشری موت

سے ایک ہی دن پسلے.....تب میں نے اسے بازو سے باندھا نہیں تھا۔  
میں نیچے آیا تو طیب بہت نڈھاٹل تھا۔ وہ باٹھ روم سے نکلا تھا۔ بدن پر لپیٹنے کی وجہ  
سے کڑے تر ہو چکے تھے۔ اس نے چڑے پر جو چھپا کے مارے تھے، ان سے بھی قیض  
گیلی ہو چکی تھی۔ آنکھوں میں دھشت ناک سرخی تھی، چہرہ اب بھی سفید تھا۔

”طیب! تم ٹھیک ہو؟“ میں اس کے قریب چلا آیا۔  
 اس نے سراخا کر اور پر کی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ میں نے غور کیا، اب سرراہٹ  
 کی آواز تھی نہ غرغراہٹ کی۔ اور گھری خاموشی پھیل چکی تھی۔ میں نے چاروں طرف  
 دیکھا۔ باہر کا دروازہ جو میں نے طیب کے لئے کھولتا تھا، اب بھی کچھ کھلا ہوا تھا۔ یعنی بھی  
 ہمارے سانسوں کی مدھم آواز کے سوا اولی دوسری آواز نہیں تھی۔ میں نے پھر طیب کی  
 طرف دیکھا، وہ بازو کی پشت سے منہ صاف کر رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اب بھی اور اٹھی  
 ہوئی تھیں۔

"وہ..... ایلیا.....!!" اس کے منہ سے کرب انگیز سکاری نکلی۔  
 "مرچکی ہے۔" میں نے ٹھنڈے لبجے میں جواب دیا۔  
 "اوہ..... وہ تو..... مکڑیاں....." .....

”طیب!“ میں نے اس کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ابا کی موت مختلف تھی مگر باقی سب کی اموات ایسے ہی ہوئی ہیں۔ تحسین خالہ، چچا صاحب، بہتر..... اور وہ فٹی کی بیٹیاں..... سب اسی طرح مری ہیں۔ میں نے ایسی زیادہ تر اموات دیکھی ہیں۔ پہلی مرتبہ بڑی بوائے چنی مکڑیوں نے میرا بھی یہی حشر کیا تھا مگر اب..... اب میں ان سے اتنا خوف زدہ نہیں ہوا۔ تحسین بھی خونزدہ نہیں ہونا چاہتے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ عکڑیاں نہ

ممکن ہے، وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی ہوں مگر میں نے فون بند کر دیا۔ میں اتنا تو جان چکا تھا کہ وہ ٹھیک ہیں۔ وہاں سب خیریت ہے۔ ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہی میں اپر لپکا۔ طیب خوفزدہ کھڑا اور دیکھ رہا تھا۔ ایلیسا کی چیزوں کا طوفان ابھی تک نہیں تھا تھا۔ اسکی خوفناک چیزیں تھیں کہ میرا روم لرز رہا تھا۔ طیب سفید ہو چکا تھا۔ میرے پیچھے وہ بھی اور پلاکا..... مگر میریڑھیوں کے آگے آنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ میں چھلانگیں لگاتا ہوا اور پیچ کر ایلیسا والے کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک طیب نے پیچھے سے میرے ابازوں کی پلٹ کر کھینچ لے۔

”ضیاء! وہاں خطرہ ہے..... اسے کیا ہوا ہے.....؟ اندر مت جاؤ۔“ اس کے جملے بے ترتیب، اور لمحہ بے معنی تھا۔

”طیب! اے بچانا ہے۔“ میں نے جھنکے سے بازو چھڑایا۔ طیب میرے پیچھے اپر آگیا۔ میری واجہ سے غالباً اسے ڈھارس ہوئی تھی۔ ہم جو نی ایلیا والے کمرے کے دروازے پر پہنچے، بے ساختہ ہم دونوں کے حلق سے جیچ نکلی اور مجھے تو یوں لگا جیسے میرا کلیج منہ کے راستے باہر آجائے گا۔ طیب کو تو سکتہ ہو گیا۔ اس نے یہ منظر پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑائے، سفید چہرو لئے ساکت کھڑا تھا پھر جیسے اسے جھر جھری کی آئی اور ”اغنو..... غنو.....“ کرتا ہوا بھاگتا چلا گیا۔ اس نے سیڑھیاں بھی بھاگتے ہوئے عبور کیں۔ میں ایک لمحے کے لئے ایلیا سے نگاہ چراتے ہوئے خود پر قابو پا رہا تھا۔ میں نے پلت کر دیکھا۔ ایلیا کے بدن پر جیسے سوتا چڑھا ہوا تھا..... نہیں..... سونے کا پانی تھا جو بلکورے سے لے رہا تھا۔ لاکھوں، بلکہ لاتعداد سنہری مکڑیاں تھیں جو اس کے بدن کو چاٹ رہی تھیں۔ اس کا بدن جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا تھا۔ مجھے اس کی حالت دیکھ شدید چیرت اور خوف محسوس ہوا۔ اتنی چھوٹی چھوٹی مکڑیاں گوشت کے اتنے بڑے بڑے نکڑے کیسے اتار اتار سکتی تھیں؛ جتنے بڑے بڑے نکڑے اس کے بدن سے الگ ہو کر بکھرے ہوئے تھے۔ ایلیا کی بڑیانی چیختیں اب صرف غرغاہت میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ بکھر اس کی ایک آنکھ مجھ پر بھی تھی جب کہ دوسری آنکھ کی جگہ مکڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ پھر میں نے اس کی آخری بچکی..... سکلی یا کراہ..... جو بھی سمجھ لیں، سن لی۔ وہ عجیب سی آواز تھی جس نے بدن میں اٹھنے والی خوف کی لمبوان میں بُنگلی بھی بھر دی تھی۔ اب اس کی بدو کرنا بے کار تھا۔ اور میں نہیں جانتا تھا کہ میں ان مکڑیوں سے اس کی لاش

”ضیاء! یہ ہم دونوں کو قتل کے کیس میں پھنسانے کی کوشش بھی تو ہو سکتی ہے۔“  
طیب نے ہرے پتے کی بات کی تھی۔ سو فیصلہ یہی مقصد ہو گا۔ یا پھر وہ ہمیں اس طرح  
بلیک میں کرنا چاہتی ہے۔ اس لاش کو نٹکانے لگاؤ ضیاء..... ورنہ.....“

”تم یہ بتاؤ کہ ایسا یہ اس کا کوئی رشتہ دار ملنے آیا تھا؟“  
”ہاں، اس کی بنن اور ایک اینا کا انکل تھا جو کبھی یہاں آکر شراب پا کرتا تھا اور  
ایسا کے ماضی کے زخم کریدا کرتا تھا۔ ایسا اس سے بت خوش ہوتی تھی۔ اثر اسے بلا یا  
کرتی تھی۔ بنن کم آتی تھی کیونکہ ایک توہ بوڑھی ہے پھر اسے گنتھیا کا مرض بھی ہے۔  
اس کے لئے آنا کافی دشوار ہوتا ہے۔“

”نمیں..... ہاں..... ٹھرو..... وہ کسی و تسلما کمیکر نامی عورت کا ذکر کیا  
کرتی تھی۔ غالباً وہ اس کی دوست تھی۔ شاید گواہیں رہتی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھی کہ وہ  
گواہ اس کے پاس جانا چاہتی ہے مگر انپنی بیٹی اینا کی وجہ سے یہاں رہنے پر مجبور تھی۔“

و تسلما کمیکر کا نام سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ نام میرے لئے نیا نہیں  
تھا۔ رابرٹ نے اس عورت کا ذکر کیا تھا۔ گویا کڑی مل چکی تھی، و تسلما اور ایسا ایک  
دوسرے سے واقع تھیں مگر اس واقعے کا اس واقفیت سے کیا تعلق تھا؟ یہ میں جانتا تو  
نہیں تھا مگر بعلوم کرنا آسان ضرور ہو گیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ یہ اطمینان بھی ہو گیا  
کہ میں ایسا کے ملنے والے سے کہہ سکتا تھا کہ وہ گواہی ہوئی ہے و تسلما کے پاس۔

”ٹھیک ہے۔ اب تم بتاؤ تمہاری کیا کیفیت ہے؟“ میں نے طیب سے پوچھا۔

”اب بستر ہوں۔“ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”کیا اتنی بہت ہے کہ ایسا کی لاش کو نٹکانے لگانے کے لئے میری مدد کر سکو؟“  
”کیا کرو گے اس کا؟“ اس کے چہرے پر سایہ سا آکر گزگز گیا۔  
”کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ چلو انہوں مجھے کوئی کاچھلا حصہ دکھاؤ۔ بستر تو یہی ہے  
کہ ہم اسے یہیں دفن کر دیں۔ باہر لے جانا ہمارے لئے ہزاروں دشواریاں پیدا کر  
دے گا۔“

”تم..... اسے یہیں دفادر گے اور خود..... کیسے رہو گے؟“

”میں قبرستان میں بھی رہ سکتا ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔“

”ضیاء! میرا خیال ہے کہ تم واپس گھر پلے چلو۔“

تمہیں کچھ کہیں گی نہ مجھے.....“

”کیوں..... یہ یقین تمہیں کیوں؟“ وہ اب کچھ سنبھل رہا تھا۔

”میرے اس یقین کی وجہ اتنے بہت سے گزرے ہوئے میں نہیں جانتا کہ کیوں؟ لیکن میں  
ایسا جانتا ضرور چاہتا ہوں اور یہ سب جان کر رہوں گا۔“ تبھی تو اتنے یقینی لمحات ضائع کر رہا  
ہوں۔ لیکن یہ یقین کہ یہ کھلیاں تمہیں بھی کچھ نہیں کہیں گی، اس کی وجہ وہ پتھر ہے جو  
میں نے تمہیں دیا اور تم سے استعمال کروں گا کہ کسی بھی حال میں تم اسے خود سے الگ نہ  
کرنا۔ ایک بات تو طے ہے کہ تم بھی اب ان حالات کی پیٹھ میں ہو۔ خود کو سنبھالو!  
مرداگی سے حالات کا مقابلہ کرو اور خیالوں کی فضاؤں میں اڑنے کی بجائے زمین پر قدم بھا  
کر چلنا اور جینا سکھو۔“

”ضیاء! اب کیا ہو گا؟“

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے تسلی دی۔  
اچانک یوں لگا جیسے میری باتیں سنتے سنتے وہ کہیں بھلک گیا ہو۔ اس کی آنکھوں کا  
خلال پن، ویرانی کا احساس برداھا گیا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں نے تسلی دی۔

”ضیاء! اس نے اینا کو میرے ہاتھوں مروا دیا اور ایسا..... خود اس کا شکار ہو  
گئی۔ کیوں.....؟ ان دونوں کا کیا قصور تھا؟“

”ہاں..... یہی غصہ مجھے ہے۔ زیوسا کون ہے؟ میں نہیں جانتا، اس کا ان  
واقعات سے کیا تعلق ہے؟ میں اتنا جان گیا ہوں، رابرٹ کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ  
زیوسا ایک اہم چیز ہے۔ ایں سے اس کو نسبت تھی سوہہ ایں کے حق میں ہمارا پیچھا کر  
رہی ہے مگر وہ کیا چاہتی ہے، ان لوگوں کا مشکار کیوں کر رہی ہے جن کا ان واقعات سے  
قطعی براہ راست تعلق ہے نہ کسی اور اعتبار سے..... شاید وہ ہمارے اروگرد ہلچل چا  
کر مجھے خوفزدہ کرنا چاہتی ہے مگر اس کا کیا مقصد ہے، جب کہ وہ یقیناً جان پچکی ہو گی کہ  
زنجیرس میرے پاس ہیں اور میں چنانوں کا ساحcole رکھتا ہوں۔ اسے ٹھاکریے تو یہی کہ وہ  
مجھ سے بات کرے تھر..... بہر حال..... اب تمہیں مکمل طور پر میرا ساتھ دتا  
چاہیے۔ اس نے ایسا اور اینا کو ختم کر کے یقیناً اپنے لئے راستے صاف کئے ہیں۔“

ہم دونوں باہر آئے۔ باہر بھی گرانٹا تھا جس میں بولتے بولتے اچانک دم سادھ لینے والے جھینگر اس نائلے کو توڑ اور جوڑ رہے تھے۔ میں نے دیوار کے ساتھ رکھے دروازوں والے لمبے ریک کی ایک دراز سے تارچ نکال لی۔ یہ میں اس وقت دیکھ چکا تھا جب ایسا آرام کر رہی تھی اور میں نے گھر کا جائزہ لیا تھا تاکہ ہر چیز دیکھ سکوں اور کسی چیز کے لئے ایسا تو ناجمت نہ دستا پڑے۔

ہم دائیں جانب کو طرف سے ہوتے ہوئے اس طرف آگئے جمال ایسا کا کرا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لائٹ آن تھی۔ اندر ایسا کا سامان رکھا ہوا تھا۔ ایک بیگ تھا اور چند جوڑے ہیگر میں لگے دیوار پر لکھے ہوئے تھے۔ میں پسلے اندر چڑا گیا۔ طیب میرے ساتھ تھا۔ اندر جا کر میں نے اس کا سامان سینا۔ کپڑے بیگ میں ٹھونے اور بیگ کو بیڈ کے نیچے گھسا دا پھر میں باہر چلا گیا۔ طیب تارچ لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ یہاں اندر ہرا تھا اور جب میں نے ایسا کے کمرے کی لائٹ بند کر کے دروازہ بھیز دیا تو یہ اندر ہرا اور گمرا ہو گیا۔ اب ہم تارچ کے روشن دائرے کے تھاکب میں تھے۔ یہ حصہ جھاڑ جھنکاڑ سے بھرا ہوا تھا۔ دور تک پھیلے اس کچے حصے کی صفائی یوں بھی اس بوڑھی اور موٹی ایسا کے بس کی بات نہیں تھی۔ پچھلا حصہ آگے کے حصے سے کافی بڑا تھا۔ اتنا بڑا کہ اس کے اندر ایک اور کوئی تعمیر ہو سکتی تھی۔

”یہ جگہ ایک لاش نہیں بلکہ کئی لاشیں دبائے کے لئے بھی انتہائی موضوع ہے۔“  
بے سانتہ میرے منہ سے نکلا۔

”ہاں.....! لگتا ہے، جیسے قبرستان ہو۔“ طیب نے جھری جھری لے کر کہا۔  
یہاں جھینگروں کی آواز تیز ہو گئی جو کبھی کبھی ہمارے قدموں کی آہٹ پر اچانک ڈوب جاتی تھی۔ طیب تارچ سے زمین کو روشن کر رہا تھا۔ ہمیں بہت سنبھل کر چلانا پڑ رہا تھا۔ یہاں جگہ جگہ کیکش لگے تھے۔ کائنے دار جھاڑیاں بھی بکثرت موجود تھیں۔ میں ایک جگہ رک گیا۔ میں نے تارچ سے دور تک کا جائزہ لیا۔ احاطے کی دیوار کافی اوپھی تھی۔ دائیں بائیں..... آگے پیچھے کوئی عمارت نہ تھی۔ یہ میرے حق میں بستر تھا۔

”آؤ طیب!“ میں واپس لوٹ گیا۔  
”تم کیا کرنا چاہتے ہو ضیاء!“

گھر کا نام سن کر میں اچھل پڑا۔ مجھے یاد آگیا کہ زہرہ آپا میری طرف سے فکر مند تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ طیب کسی کافون سن کر میرے پاس آیا ہے۔ میں اب تک اس سے یہ نہیں پوچھ سکا تھا کہ وہ اتنی رات گئے کیوں اور کیسے آیا ہے۔ ”طیب! تم یہاں کیوں آئے تھے؟“

اور میں نے دیکھا کہ وہ خود بھی چونک اٹھا۔ شاید وہ خود بھی بھول چکا تھا۔ یہاں کے طوفان نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ ”وہ..... ہاں ضیاء..... میں تو بالکل بھول گیا۔ میں یہاں سے جا کر بہت بے چین تھا۔ سونا چاہتا تھا مگر ایسا کی لاش اور ایسا کا بلکن یاد آ جاتا تھا۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ پہا نہیں کیا وقت ہو چکا تھا۔ میری بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ میں بستر پر دراز کر دیں بدل رہا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی کھنٹی بجئے گئی۔ اتنی رات گئے کبھی ہمیں کسی نے فون نہیں کیا۔ گھر کے تمام لوگ گھری نیند میں تھے۔ اچھا ہوا کہ میں جاؤ رہا تھا۔ میں نے پہلی نیل پر ہی فون اٹھا لیا۔ دوسرا طرف وہی منہوس عورت رکھ دیا۔ میں پاگل ہو گیا۔ ہیلو ہیلو کر کے چیخنے لگا، یہ خیال بھی نہ آیا کہ میری آواز سے گھر کے لوگ اٹھ جائیں گے۔ اس نے فون بند کر دیا تھا۔ اچانک میں اخفا در یہ بھاگا۔ میں نے گاڑی کی چابی لی اور دروازہ کھول رہا تھا کہ زہرہ پچھی گھبرائی ہوئی میری طرف پکیں۔ شاید انہوں نے فون سن لیا تھا۔ وہ تمہارے بارے میں استفسار کر رہی تھیں۔ میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے پاس جا رہا ہوں۔ فون کے بارے میں بھی میں نے انہیں بتا دیا پھر وہ چیخت رہ گئیں اور میں نکل آیا۔

”ہوں.....!“ میں نے گمرا سانس لیا۔ ”میں سمجھ گیا کہ اس نے تمہیں کیوں بھیجا ہے۔“

”کیوں.....؟“ وہ بے چینی سے پلو بدل کر بولا۔  
”تمہیں خوف زدہ کرنا مطلوب تھا۔ بہرحال، تمہاری آمد سے مجھے حوصلہ ہوا ہے۔  
آؤ انہو.....! وقت ضائع کرنا خطرناک ہے۔ ہم اس کی الگی چال سے واقف نہیں ہیں۔“

میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ اب کچھ ہی دیر میں سورج کی کرنیں سارا اندر ہر انگل لیں گی۔ طیب واقعی خود کو کافی حد تک سنبھال پکا تھا۔

ہوئے بولا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا جب اسے اطمینان ہو گیا، تب پُر سکون ہوا۔

”آؤ! اور پڑھ لٹتے ہیں۔ پسلے ایسا کو دیکھ لیں پھر چیزیں ملاش کریں گے۔“ میں نے ثارج رکھ کر سیرہیوں کی طرف قدم بڑھایا۔

”نہ..... نہیں ضیاء..... یار..... میری ہمت نہیں ہو رہی۔“ وہ بھجوکا۔  
”طیب! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ پیش آنے والے حالات اس سے بھی زیادہ خوفناک ہوں۔ کیا تم عورتوں کی طرح خوف سے مر جانا چاہتے ہو؟“

”نہیں..... اس وقت ذرا.....“ وہ صوفہ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔  
”پکھ نہیں، چلو آؤ۔“ میں نے ذرا سرد لبھے میں کمل۔ ”پھوک کی طرح سے ہوئے ہو جب کہ جانتے ہو کہ نہ تمہیں کوئی گزند پہنچی ہے نہ مجھے۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میں آگے آگے تھا اور طیب میرے پیچھے۔ لکڑی کی سیرہیاں بول اٹھیں۔ پل بھر کو اس آواز سے طیب ٹھکا پھر اور پڑھنے لگا۔ میں اپنی بینائی سے کام لے کر پچھے پچھے کا جائزہ لے رہا تھا۔ سب ٹھیک، تھا۔ میں اپنے کمرے کے دروازے کے قریب سے گزراتوں میں نے احتیاطاً اپنے کمرے کے بند دروازے کو کھول کر اندر جھانکا۔

یہاں ہر طرح سکون تھا۔ میں پھر دروازہ بھیز کر آگے بڑھا۔ ایسا کمرے کے پیوں پتھر پڑی تھی۔ اس کے بدن کا آدمی سے زیادہ گوشت اگنیز بات تھی کہ اس کے بدن کا گوشت بالکل سفید تھا۔ خون کا ایک قطرہ تک نہ تھا۔ نہ فرش پر ہی پھیلا ہوا خون نظر آرہا تھا جو میں اب سے پسلے دیکھ چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے پونچھا دے کر سب کچھ صاف کر دیا ہو۔ ایسا کا چھوڑ سلامت تھا۔ ایک بھی مکڑی اس کے بدن پر یا کمرے میں نہ تھی۔ سب کچھ دیسیاں تھا جیسا میں نے پسلے دیکھا تھا۔ جو چیزیں ایسا کے تر پیسے اور اٹھنے بھاگنے کی وجہ سے بے ترتیب ہو گئی تھیں، وہ بھی جوں کی توں پڑی تھیں۔ میں نے بیٹھ کی چادر گھمیٹ کر ایسا کی لاش پر ڈال دی۔ پلٹ کر طیب کی طرف دیکھاتو وہ من پھیرے کھڑا تھا۔

”دیکھاتم نے..... ایک بھی مکڑی نہیں ہے۔ میں نے کہا تھا ماں؟“  
”مگر ضیاء.....! یہ کسی مکڑیاں ہیں یار.....! نہ کہیں پڑھا، نہ سنا، نہ“

”ایسا کی لاش کو دفن کرنا ہے۔ ہمیں پھاڑوڑا، کداں، پبلچی جیزوں کی ضرورت ہو گی۔ لان میں تازہ کھدائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں یہاں ان چیزوں میں سے کچھ نہ کچھ ضرور مل جائے گا۔ کماں.....؟ یہ دیکھنا ہے۔“

”میں جانتا ہوں تمہیں ایسی چیزوں کماں لمیں گی۔“  
”گذ..... کماں.....؟“

”یا میں طرف جو گیراج سا بنا ہوا ہے، اس طرف لکڑی کا ایک کیبن ہے۔ غالباً یہ کیبن چوکیدار کے لئے بنایا گیا ہو گا مگر ایسا اسے استور روم کی طرح استعمال کرتی تھی۔“

”مگر ضیاء! ایسا کی لاش کو ہم وہاں تک کیسے لے کر جائیں گے؟“  
”میرے بازوؤں میں بڑا دم ہے طیب.....“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”نہیں، میرا مطلب ہے کہ وہ مکڑیاں..... اور سنو.....!“ اچانک وہ خوفزدہ ہو کر رک گیا۔ میرا بازو کپڑا کر مجھے بھی روک لیا۔  
”ہاں!“

”وہ مکڑیاں پورے گھر میں بھیل جائیں گی۔ بھیل گئی ہوں گی ضیاء!“ اچانک وہ اپنے کپڑے جھاڑنے اور اندر میرے میں یوں آنکھیں پھاڑ جھاڑ کر اپنے بدن کو دیکھنے لگا جیسے ان مکڑیوں کو ملاش کر رہا ہو۔

”پکھ نہیں ہے طیب۔“ میں نے ایسا کشف سے پسلے اپنی بینائی کی اس پر اسرار قوت سے کام لے کر اس کے اور اپنے بدن پر دیکھ لیا تھا۔  
”مگر وہ گھر پر تو.....“

”نہیں ہوں گی۔ اب ایسا کی لاش کو بھی یوں ہی چھوڑ گئی ہوں گا۔ مت گھبراؤ۔“

اب ہم ڈرائیکٹ روم کے دروازے تک پہنچ گئے تھے۔ یہاں روشنی تھی۔ میرے اطمینان دلانے کے باوجود طیب نے سیرہی پر قدم رکھنے سے پسلے دیکھا۔ اس کا ایک ہاتھ اب بھی اپنے بدن کو ٹوٹ رہا تھا۔ کبھی بھی وہ کپڑے جھاڑنے لگتا تھا۔ کبھی گدی پر ہاتھ پھیرتا جیسے کسی ریگتی ہوئی چیز کو جھاڑ پڑتا ہو۔

”میں نے کہاں کہ اب کچھ نہیں ہے۔ اطمینان رکھو۔“ میں اندر داخل ہوتے

دیکھا..... ” وہ جھری جھری لے کر بولتا۔

”اب تو دیکھ لیا تا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔ مجھے یاد ہے، جب تم چچا صاحب کی موت پر آئے تو کس قدر بے چین تھے کہ کاش تم وہ تمام حالات دیکھ پاتے جس میں وہ مرے ہیں۔“

”ہاں..... مگر..... مجھے ان باتوں سے وسیٰ ہی دلچسپی تھی جیسے پُراسار کمانیاں پڑھنے سے ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ایسی خونخوار پُراساریت کو افروز نہیں کر پا رہا۔“

”چلو! وہ چیز تلاش کرتے ہیں۔“ میں واپس پلٹا۔

اب وہ کافی حد تک خود پر قابو پا چکا تھا۔ ہم پھر ثارچ لے کر باہر آگئے۔ باہم جانب بھی کافی جھاڑیاں اُگ آئی تھیں۔ پاٹا نہیں لان ٹھیک کرنے کے بعد ایسا اس حصے کی طرف کیوں توجہ نہیں دیتی تھی۔ حالانکہ یہ صفائی وہ کسی مالی سے بھی کراں تک تھی، یقیناً۔ لان بھی خود اس نے ٹھیک نہ کیا ہو گا۔ وہ کافی لیزی عورت تھی۔ تقریباً پچاس قدم کے فاصلے پر ٹین کا ایک چھپر ڈال کر گیراج بنا گیا تھا۔ اس گیراج کے ساتھ ہی لکڑی کا دہ کیبن تھا جو اس وقت بند تھا۔ یہاں باہر سے کندھی تھی مگر تلا نہیں تھا۔ میں نے باہر کوئی سوچ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ سوچ تو مل گیا مگر سارے سوچ آن کرنے کے باوجود اس حصے میں روشنی نہیں ہوئی۔ غالباً بلب نہیں لگے تھے یا خراب تھے۔ میں نے کندھی کھوئی۔ اندر جھانکا۔ کاشٹ کباڑا بھرا ہوا تھا مگر بے ترتیب نہ تھا۔ اندر کی دیوار پر ایک سوچ مل گیا۔ میں نے ٹین دیایا تو اسٹور روشن ہو گیا۔ میں نے ثارچ بجھا دی۔ پھر ہم نے جلد ہی گھاس کی مشین کے سواتیوں چیزیں اٹھائیں۔ ایک نظر پورے اسٹور پر ڈالی۔ یہاں کام کی بہت سی چیزیں موجود تھیں۔ گاڑی کی دو تین بیٹریاں بھی رکھی تھیں مگر انداز وقت نہیں تھا کہ میں ہر چیز کا جائزہ لیتا۔

ہم اپنے مطلب کی چیزیں لئے پھر اسی پچھلے حصے کی طرف آگئے۔ میں نے زمین پر مستطیل نشان لگایا اور پھاڑا طیب کے ہاتھ میں تھما کر کمل۔ ”دوسری طرف سے تم کھو دنا شروع کر دو۔“

پھر ہم دونوں نے زمین کھو دنا شروع کر دی۔ پاٹا نہیں ہم کتنی دیر تک کھو دتے رہے۔ ہمارے بدن پسینے میں شرابور ہو گئے۔ سانس بری طرح پھول گئی مگر ہم رکے

نہیں۔ میں نے کہا اس وقت پچھنکا جب اطمینان ہو گیا کہ اتنی گمراہی کافی ہے۔ طیب تو ہانپہنچ لگا تھا۔ اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ شاید اس نے پہلی بار اتنی جسمانی محنت کی تھی۔ اس کی قیض اب پسینے سے بھیک چکی تھی۔ میں اور وہ دو بڑے پتھر قریب کر کے دیں بیٹھ گئے۔ میں سانس کے قابو میں آنے کا خفتر تھا۔ چند ہی لمحوں میں، میں نے خود پر قابو پالا۔ طیب کی حالت کافی ایتر تھی پھر رفتہ رفتہ وہ بھی نارمل ہو گیا۔

”چلیں.....؟“

”ہاں!“ اس نے سرہلایا اور پھاڑا رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

ہم دونوں پھر گھر کے اندر آگئے۔ ہم نے ایسا کی لاش کو اس پر پھیلی چادر ہی میں پہننا اور بڑی مشکلوں سے بچنے لائے۔ وہ مرنے کے بعد اور زیادہ بھاری ہو گئی تھی پھر عجیب بات یہ تھی کہ اس کی لاش میں سے ایک عجیب سی بدبو آرہی تھی جو ہم دونوں کو بے پناہ ناگوار گزر رہی تھی مگر اسے اخہانا اور دفاتر اہم ارے لئے بہت ضروری تھا اس لئے برداشت کر رہے تھے۔ طیب کو تو کمی بار ایکائیاں بھی آئیں مگر وہ جانتا تھا اسے اکیلے باہر لے جانا میرے بس کا کام نہیں ہے۔ اس لئے وہ میری مدد کر رہا تھا۔ ہمیں اس کی لاش کو باہر لے جانے اور اسے دفاتر میں تقریباً گھنٹا بھر لگ گیا۔

ہم نے وہ گڑھا بھر کے اس پر کائی دار جھاڑیاں بھی ڈال دیں۔ طیب نے بتایا تھا کہ یہاں بھیڑیے بھی ہوتے ہیں۔ میں نے حفظ ماقبلہ کے طور پر بہت سی جھاڑیاں پھیلا دی تھیں ورنہ کوئی بھوکا بھیڑا۔ ایسا کی موت کا راز فاش کر سکتا تھا۔

یہ سب کرتے کرتے ہم بری طرح مذہل ہو گئے۔ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ گھری پر نگاہ ڈپی تو ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ دو ذھانی گھنٹے میں اس عمارت کے اندر ایک قیامت اُکر گزر پچھی تھی اور سارا عالم گمری نیند میں تھا مگر نہیں۔ زہرہ آپا بھی ہماری طرف سے پریشان تھیں۔ اس کا احساس اچانک بچ نہیں دالے فون نے مجھے دلایا۔ پسلے تو ہم دونوں ہی نیل سن کر اچھل پڑے۔ پھر رسیور اٹھاتے ہی میں زہرہ آپا کی آواز پہچان گیا۔ وہ اب بھی رو رہی تھیں۔ آواز بھاری ہو رہی تھی جیسے اس وقت سے اب تک رو تی رہی ہوں۔ مجھے نہ امانت ہوئی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں انہیں فون کرتا ہوں مگر..... خدا کے واسطے..... مجھے بتاؤ تم کیسے ہو؟ تم یہاں کیوں نہیں

”بہلہ ضیاء..... خدا کے واسطے..... مجھے بتاؤ تم کیسے ہو؟ تم یہاں کیوں نہیں

انکل آیا تو.....؟  
”ہاں! ہم کہہ دیں گے کہ ایسا، اینا کو لے کر گواہی ہے۔ و تسلماً کشید کے گھر۔“  
پھر میں چونک اٹھل۔ ”طیب! مگر ایسا کی بدن اور اینا کا انکل اینا کی تدفین پر کیوں نہیں آئے؟“

”پا نہیں..... ہاں واقعی..... ایسا نے کوشش بھی نہیں کی انہیں اطلاع کرتی..... شاید انہیں فون کیا ہو اور وہ نہ لے ہوں۔ پا نہیں ضیاء..... اور یہ اچھا ہی ہوا تاں! ورنہ اگر.....؟“

”ہاں! اچھا ہی ہوا مگر کیا اس کی بدن کا و تسلماً سے رابطہ نہیں ہوا ہو گا؟ یا ممکن ہے“  
بعد میں ہو جائے تب اسے پا چل جائے گا کہ ہم نے ان سے جھوٹ بولا ہے۔“

”کہہ دتا کہ ہیں سے تو یہی کہہ کر گئی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کو ان دونوں سے اتنی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کھوچ میں لگیں۔ اس کا انکل البتہ شراب کی بو سو نگہت ہوا آسکتا ہے۔ بدن شاید سال میں دو چکر لگائے۔ پلے چکر پر ہی جب اسے پا چلے گا کہ وہ اب بہاں نہیں ہے تو شاید دوسرا چکر بھی نہ لگائے۔“ طیب نے جگ سے گلاں میں پانی انہمیتے ہوئے کاما اور ایک ہی گھونٹ میں گلاں خالی کر دیا۔

میخ کے آثار نہیاں ہو رہے تھے اور مجھ پر ہی نہیں، طیب پر بھی نیند غالب آتی جا رہی تھی۔ ”چلو کچھ دیر کو سو لیتے ہیں۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”یار یہ عجیب کوئی ہے۔ اتنی بڑی ہے مگر اس میں کمرے کم ہیں۔“ طیب نے چاروں طرف دیکھا۔

”ہاں.....! یہ بات مجھے بھی عجیب لگتی ہے۔ ویسے سنو!“ میں ٹھنک گیا۔ ”جب ہم پچھلی طرف کئے تھے تو اندر وہی عمارت کافی بڑی محسوس ہوئی تھی۔ اس کا رقبہ اتنا نہیں تھا جتنا اندر سے نظر آ رہا ہے۔“ طیب بھی میری بات سن کر چونک اٹھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔

ڈر انگر روم کے پچھلے حصے کی پوری دیوار بھاری پر دوں میں چھپی ہوئی تھی۔ دروازے کے قریب دائیں جانب اور جاتی سیڑھیاں تھیں جب کہ ان سیڑھیوں سے کچھ فاسٹے پر چکن تھا۔ کچن کافی بڑا تھا۔ چار کرسیاں اور چوکور میز کچن میں بھی تھا۔ فرتوں تھا جو کافی قدم لگتا تھا۔ باہمیں طرف ایک پڑا باختہ روم تھا مگر باہر سے لگتا تھا کہ نیچے کچھ اور بھی

آ جاتے۔ طیب کمال ہے۔ کیا ہوا تھا نیاء؟“  
”پلیز زہرہ آپا!“ میں نے بڑے پر سکون اور نہرے ہوئے لبجے میں جواب دیا۔  
”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ سب ٹھیک ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور طیب بھی ٹھیک ہے۔“  
”مگر طیب کہہ رہا تھا کہ فون.....؟“

”وہ..... میرے ایک دوست نے شرارت کی تھی۔ بلاوجہ اسے پریشان کیا مگر سب ٹھیک ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں اور طیب بھی ٹھیک ہے۔“  
”اور وہ شور..... وہ جنین کس کی تھیں.....؟“ ان کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔

”اوہ! وہ.....“ میں زور سے ٹبل۔ ”وہ ایسا یہڑھیوں سے گر گئی تھی۔ میں اسی وقت جب آپ نے فون کیا تھا۔ دراصل میں سورہ تھا۔ وہ ٹبل کی آواز سن کر جلدی سے نیچے آکر فون اٹھانا چاہتی تھی کہ میری نیند خراب نہ ہو۔ مگر اسی عجلت کی وجہ سے اس کا پیر پھسل گیا۔ دوسری طرف کال ٹبل بھی بنتے لگی تھی۔ طیب آگیا تھا۔ میں سخت بوکھلا گیا تھا۔ ایک طرف آپ جیخ رہی تھیں، دوسری طرف ایسا اور یہ..... طیب مسلسل ٹبل بجارتا تھا۔ بس اتنی سی بات تھی۔“

”ضیاء.....! تم جھوٹ تو نہیں بول رہے تاں!“ وہ محفوظ تھیں۔  
”نہیں بھی.....! جھوٹ کیوں بولوں گا۔“ میں نے طیب کو اشارہ کیا اور زہرہ آپ سے ٹہل۔ ”یہ طیب سے بھی بات کر لیں تاکہ آپ کو اطمینان ہو جائے۔“ میں نے ریسیور طیب کے حوالے کر دیا۔ خود صوفیہ پر ڈھنے گیا۔

طیب نے زہرہ آپا کو اطمینان دلایا تب وہ کچھ نارمل ہوئیں۔ غالباً وہ طیب سے اصرار کر رہی تھیں کہ وہ مجھے لے کر گھر پہنچے۔ طیب نے کہہ دیا کہ مجھے آفس کافی کام ہے جو میں وہاں نہیں کر سکوں گا اور طیب بھی اب میرے ساتھ رہے گا۔ یہ بھی کہ اب انہیں بالکل مطمئن ہو جانا چاہیے۔ ریسیور کہ کر طیب بھی پاس آئیٹھ۔

”اب..... اب کیا ہو گا؟“ وہ بولا۔  
”کس بارے میں؟“ میں نے وہاں ٹبل پر پڑا سگریٹ کیس اٹھا کر سگریٹ سلاکتے ہوئے پوچھا۔  
”یہی اور اینا کے بارے میں..... میرا مطلب ہے کہ اگر اس کی بدن اینا کا

”چھوڑنے دیت۔ انگلیاں کچل جائیں گی میری۔“ میں نے دوسری طرف آتے ہوئے کہا۔

”لیکن دوسرے دن ٹھیک ہو جائیں گی۔ وہ تم ساری چیزیں سب ٹھیک کر دے گی۔ تم ہانتے ہو پھر بھی ڈرتے ہو۔“ طیب ہنسا۔

تجھے یاد آگیا کہ میرے پاؤں کا زخم ایسے بھر گیا تھا جیسے کسی نے جادو کی چھڑی گمرا دی ہو۔

”ہا! یہ تو ہے۔ مگر یاد ہے، جب زخم لگتا ہے، تکلیف تو ہوتی ہے میں؟“ طیب نے پھر زور لگایا۔ میں نے انگلیاں پھنسا کر اپنی ساری طاقت صرف کر دی۔ اچانک بڑی زور کا کھنکا ہوا۔ لگا جیسے اندر لگی کنڈی ٹوٹ گئی ہو۔ ایک جھنکا لگ۔ طیب بھی جھکے سے پچھے ہوا اور میں نے بھی یہ ساختہ اپنی انگلیاں کھینچ لیں۔ واقعی دروازہ ڈھیلا ہو گیا مگر پورا پھر بھی نہیں کھلا۔ میں نے کھونے کی کوشش کی مگر وہ جم کر رہا گیا۔ بہر حال اتنی جگہ بن گئی تھی کہ ایک آدمی آڑھا ہو کر اس سے گز سکتا تھا۔ اندر گھپ پ اندر ھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں جلدی سے ٹارچ اٹھا لایا۔ میں نے وہیں سے ٹارچ گھمائی۔ یہاں وال ٹو وال کارپٹ تھا۔ گھرے سرخ رنگ کا کارپٹ اور ویٹھ کے گھرے سرخ پردے پڑے تھے۔ سامان نام کی کوئی چیز دکھائی نہ دی۔ یہاں سے کمرے کا ایک حصہ ہی نظر آ رہا تھا۔ میں نے دوسرا حصہ دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ پورے کمرے کا جائزہ لینے کے لئے اندر جانا ضروری تھا۔

”تم یہیں ٹھہرو۔ میں اندر جاتا ہوں۔“ میں نے طیب سے کہا اور ٹارچ اس کے ہاتھ میں تھما کر فوراً اندر جانے کی کوشش کرنے لگا۔ میں آڑھا ہو گیا تھا۔ چند اچھے اندر کی طرف سرکا بھی گر مجھے اندازہ ہو گیا کہ میرا جسم کچھ فربہ ہے اور جگہ اتنی نہیں کہ میں اندر جا سکوں البتہ طیب اگر کوشش کرتا تو کامیاب ہو سکتا تھا مگر جب میں نے طیب سے کہا تو وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”نہیں یا.....! میں نہیں جاؤں گا۔“

”ارے.....! بہت بزرد ہو تم۔“

”اسی پر اسرار چیز کے سامنے ہر شخص بزرد ہوتا ہے۔“ میں نے برا مانے بغیر اعتراف کر لیا۔

ہے بلکہ اس حساب سے کہ اس رقبے کے اندر اور بھی کمرے بنائے گے تھے لگتا تو یہ بھی تھا کہ اوپر بھی کچھ اور ہونا چاہئے۔ میں جائزہ لیتا ہوا اس پچھلی دیوار کی طرف بڑھا جو بھاری پر دوں کے پیچھے تھی۔ میں نے ایک جانب لگی ڈوری کھینچی تو بہت انچھائی سے لگے بھاری پر دوے کا ایک حصہ ایک جانب ہٹ گیا۔

بھلی کا کونڈا سا پلکا۔ یہاں بھی درمیان میں لکڑی کی دیوار تھی گویا اس ڈرانگ رووم کے پچھلے حصے کو اس حصے سے علیحدہ کرنے کے لئے دیوار لگائی گئی تھی۔ اس حصے میں مجھے بظاہر کوئی دروازہ نظر نہیں آیا۔ میں نے ہاتھ سے ٹولا۔ وہ صرف دیوار تھی۔ میں نے دوسرا پر دہ بھی ہٹا دیا۔ میں اور طیب دونوں چونک اٹھے۔ یہاں لکڑی کا ایسا جوڑ تھا جیسے دروازہ ہوتا ہے مگر نہ توہینڈ تھا، نہ تاب اور نہ ہی کوئی لاک یا کنڈی۔ میں نے اس حصے کو دھکا دیا۔ لگا، جیسے وہ دروازہ ہی ہے مگر اندر سے لاک ہے۔ طیب بھی جلدی سے میرے قریب آگیا۔

”یہ دروازہ ہی ہے۔“ اس نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہا! لگ تو رہا ہے مگر.....“

”ٹھہرو!“ طیب نے کہا اور تیزی سے پکن میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں بڑی سی چکنکدار چھری تھی۔ وہی چھری جسے میں اب سے پہلے پکن کی درازی میں دیکھ چکا تھا۔ جس کا ہتھا چاندی کا تھا اور جسے دیکھ کر مجھے اپنے بدن میں سنساہست محسوس ہوئی تھی۔ اس کا چکنکدار پھل مجھے دور سے ہی نظر آگیا تھا۔ وہی سنساہست محسوس ہوئی مگر میں نے نگاہ ہٹائی تو سب ٹھیک ہو گیا۔

”ہٹو!“

طیب نے مجھے پیچھے کیا مجھے طیب کو ایکٹو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ اس نے دروازے یا لکڑی کے اس پکڑے کے وزن سے پھل ڈال کر زور لگایا۔ چوں کی آواز ہوئی اور پلی سی چھری پیدا ہو گئی مگر جوں ہی طیب کی گرفت ڈھیلی ہوئی، دروازہ دوبارہ اپنی جگہ پہنچ گیا۔ اتنا ہوا کہ ہم جان گئے کہ یہ جگہ بند کی گئی ہے۔ مگر کیوں؟ یہ جاننے کے لئے مضطرب تھے۔

”فیاء! میں پھل اندر ڈال کر زور لگاؤں گا،“ تم جھری میں انگلیاں پھنسا کر اس کھونے کی کوشش کر رہا۔ طیب نے کہا اور پھر پھل اندر گھسانے لگا۔

”کچھ نہیں ہے۔ جہاں تک نظر آ رہا ہے، وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔“

”پھر یہ بند کیوں تھا؟“ اس نے استفسار کیا۔

”ممکن ہے، کافی عرصے سے بند رہنے کی وجہ سے دروازے اور دیوار کی لکڑی سیلیں زدہ ہو کر پھیل گئی ہے اس لئے یہ اتنا سخت ہو رہا ہے۔“ میں نے دروازے کو دھکیل کر مزید کھونے کی کوشش کی مگر وہ اپنی جگہ اڈا رہا۔ ”لیکن تم اندر تو جا کر دیکھو۔“ ”نہیں یار ضیاء! مجھے میں اب ہمت نہیں ہے۔ ویسے بھی اب نیند اور تھکن سے بربی حالت ہے۔ دن میں دیکھیں گے۔“ وہ چاقو لئے پھر کچھ میں چلا گیا۔ واپس آ کر صوفے پر ڈھیر ہونے لگا مگر میں نے لیٹنے نہیں دیا۔

”اوپر چلو! میرے ساتھ، میرے کمرے میں سوتا۔“

”اس..... اس کمرے میں؟ جس میں ایسا۔“

”نہیں! نہیں! وہ کرا ایلیانے لے لیا تھا۔ میں دوسرے کمرے میں شفت ہو گیا تھا۔ خوب صورت کرا ہے۔ چلو۔“

اب طیب میں مزاحمت کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

میرے کمرے کی خوبصورتی بھی اسے متاثر نہ کر سکی، نیند کی وجہ سے اسے کچھ بھائی ہی نہیں دے رہا تھا۔ بیڈ دیکھ کر وہ اونڈھا گرا اور پھر بے حس و حرکت ہو گیا۔ میں نے اس پر کمبل ڈال دیا اور خود اس کے پہلو میں لیٹ گیا۔ فوراً ہی میں بھی نیند کی آنکھ میں چلا گیا۔

☆-----☆

یہ بے پناہ تھکن کا نتیجہ تھا کہ ہم سوئے تو شام تک سوتے رہے۔ پسلے میری آنکھ کھلی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے انخالیا گیا ہے۔ کوئی بات ہوئی ہے جس کی وجہ سے میری آنکھ کھلی ہے۔ میں چند لمحے تو بستر پر خالی الذہنی کی حالت میں پڑا رہا پھر میری نگاہ وال کلاک پر پڑی جو شام کے چھوٹے بجرا تھا۔ میں چونک کراٹھ بیٹھا۔ میں نے بستر سے اترے بغیر باہر والی کھڑکی کھوئی۔ سورج کی کرنیں زم ہو چکی تھیں۔ میں نے طیب کی طرف دیکھا، وہ اب بھی اسی پوزیشن میں بے سدھ پڑا تھا جس پوزیشن میں رات تھا۔ میں نے اسے ہلا کیا۔ کچھ دیر تک اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جب میں نے کما کہ شام ہو رہی ہے تو وہ اچھل کراٹھ بیٹھا۔

”شام ہو رہی ہے؟“ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”ہاں!“

اہبی میں بستر سے اتر ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی نج اٹھی۔ نیل کی آواز سن کر مجھے پلا خیال یہی آیا کہ شاید اب سے پسلے بھی میری آنکھ فون کی نیل سے ہی کھلی تھی۔ میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ ”بیلو!“

”بیلو ضیاء!“ دوسری طرف طاہر بھائی تھے۔

”بھی طاہر بھائی آداب!“

”آداب.....! کیا ہوا بھی! زہرہ کا فون آفس آیا تھا۔ وہ سخت پریشان ہے۔ کتنی بار تھیں فون کر چکی ہے۔ طیب بھی نہ گھر پہنچا۔“ آفس میں ہے۔“ طاہر بھائی بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

”نہیں طاہر بھائی! ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ رات ایسا کی طبیعت خراب ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ہم رات گئے تک اپنٹال میں رہے۔ پھر اس کے رشتے داروں

چکلی ورزش کر رہا تھا۔ میں اس کے قریب آگیا۔ ”باؤ.....! منہ ہاتھ دھلو۔ میں چائے بناتا ہوں۔“

”یار! کندھے شل ہو گئے پھاڑوا چلاتے چلاتے۔ یہ قبرستانوں کے گور کن بڑے مضبوط ہوتے ہوں گے۔“ اس نے تولیہ اٹھا کر باٹھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کمل۔

تولیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ جوتے پنے اور نیچے کچن میں آگیا۔ فرخ میں سے انڈے نکال کر اباۓ کو رکھے۔ چائے کا پانی رکھا اور باہر آکر ڈرائیک روم کا دروازہ کھوں دیا۔ مجھے ڈرائیک روم میں وہی بدبو محسوس ہو رہی تھی جو رات ایسا کی لاش میں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ سارے پردے بھی ہٹا کر کھڑکیں کھوں دیں۔ اترتی دھوپ کی کرنیں گو نرم ہو پکی تھیں مگر وہ کمرے میں پھیلیں تو خوشنگواری کا احساس ہوا۔ طیب تیار ہو کر نیچے آیا تو میں چائے بنا چکا تھا۔ انڈے ابلے ہوئے تھے مگر طیب سیدھا کچن میں ٹھیک گیا۔

”ان سے پیٹ بھرے گا؟“ اس نے انڈوں کی طرف اشارہ کیا۔

کچھ دیر میں وہ کچن سے باہر آیا تو میں چائے پیالیوں میں نکال چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ڈبل روٹی، مکھن، پیرو اور جام کی شیشی تھی۔ ”یہ سب کھاؤ گے؟“

”ہاں! پیٹ کیسے بھرے گا؟“ اس نے چیزیں ٹیبل پر رکھتے ہوئے کمال۔

”ہوں.....! یعنی کچھ ہی دن میں تمہارا سینہ چالیس انج اور پیٹ پینتالیس انج ہو جائے گا۔“

”یا! پیٹ اور سینہ دونوں انسان کے لئے ضروری ہیں۔ بھلے ایک دوسرے کی جگہ پر ہی کیوں نہ ہوں۔“

اس نے سلاس پر مکھن لگاتے ہوئے کما اور پھر آدھے گھنٹے تک مسلسل ناشتا کرنا رہا۔ میرا جی متلانے لگا۔ میں اس دوران میں دو کپ چائے پی چکا تھا۔ دو انڈے کھا چکا تھا اور تین سگریٹ پھونک چکا تھا۔ جیرت کی بات ہے کہ طیب کو آپ مونا نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ بے حد اسارت تھا۔ مجھ سے کم ہی ہو گا حالانکہ میری غذا بہت کم تھی۔ میں صحت کے معاملے میں کافی حساس تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد اس نے لمبی ڈکاری۔ برتن کچن میں رکھے اور ہاتھ دھو کر آگیا۔

”چلو!“ اس نے تولیے سے منہ پوچھتے ہوئے کمل۔ ”ایک مسئلہ ہو جائے گا تمہارے

کو ڈھونڈا۔ اسے وہاں پہنچایا۔ اس میں صبح ہو گئی۔ صبح سوئے تو ہوش ہی نہیں رہا۔ ابھی ابھی آنکھ کھلی ہے۔“ میں نے انسیں تسلی دی اور لمبا چوڑا جھوٹ بولا۔ ”طیب میرے ساتھ ہی ہے۔“

”طیب نے ہمیشہ غیر ذمے داری کا ثبوت دیا ہے مگر..... تم تو بین کا خیال کرتے۔ وہ ہلکاں ہو چکی ہے اور رو رہی ہے کہ آپ پتا کریں۔ ڈھونڈیں۔ اسی نے فون نمبر دیا ہے اور کہا ہے کہ میں ڈائریکٹری سے ایئر لائس نکال کر خود جا کر دیکھوں کہ کیا بات ہے۔“

”سوری طاہر بھائی! اصل میں یہاں پہنچیں ایسی ہو گئی تھی کہ.....“

”خیر.....! طیب کہاں ہے؟“

”باتھ روم گیا ہے۔“ میں نے طیب کے اشارہ کرنے پر کہ دیا تھا حالانکہ وہ اب بھی وہیں لیٹا تھا۔ ”ہم ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ رہے ہیں۔ میں زہرہ آپا کو فون کر دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے، فوراً فون کرو۔“ اتنا کہہ کر طاہر بھائی نے فون بند کر دیا۔

”ابے یاør.....! اب ہزاروں باتیں سنتا پڑیں گی۔“ طیب نے جھنجلا کر کمال۔ ”ایک تو تمہاری بین کو ہولانے کا بے حد شوق ہے۔ کوئی بات ہو، یہ ضرور ہو لاتی ہیں اور ضروری نہیں کہ بات پریشانی کی ہو یا کوئی حادثہ ہو۔ تقاریب پر بھی ماشاء اللہ یہی حال ہوتا ہے۔ کھانا کم نہ پڑ جائے۔ کوئی ناراض نہ ہو جائے۔ کسی کی مرضی کے خلاف کچھ نہ ہو جائے۔“ وہ اب اٹھ گیا تھا اور نسٹر سے پاؤں لٹکائے، میری جانب پشت کئے مسلسل بڑیرا رہا تھا۔

”اچھا! اب اٹھ جاؤ اور دیر کرو گے تو جو تے بھی پڑیں گے۔ وہ کل سے میری منتظر ہیں۔“

”اف ضیاء.....!“ اچانک وہ میری طرف مڑا۔ ”کل کا دن اور گزشتہ رات کس قدر خوفاک گزروی ہے۔“

”ہاں.....! مردوں کی زندگی میں ایسا اکثر ہوتا ہے۔“ میں نے باٹھ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کمل۔ ”بس اب حواس بحال کرو۔“

طیب نے کھڑے ہو کر زور دار انگرائی لی اور باہر کی جانب کھلی کھڑکی میں کھڑے ہو کر، سینے پر دونوں ہاتھ باندھ کر لبے لمبے سانس لینے لگا۔ میں باٹھ روم سے نکلا تو وہ ہلکی

لئے۔ اس نے میرے پیچھے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔  
”کیا؟“

”یہ اتنے برتن کون دھوئے گا؟ صفائی سترہائی کون کرے گا؟ ایسا لیزی سی، کسی  
نہ کسی طرح کام تو نہ نہیں لیا کرتی تھی۔“

”ہاں..... ان کاموں کی عادت نہیں ہے مجھے۔“ میں نے کھڑکیاں بند کرتے  
ہوئے کہا۔ طبیب بھی میری مدد کرنے لگا پھر میں نے پردے برابر کئے۔ ہر طرح کام اطمینان  
کرنے کے بعد میں اور طبیب باہر آگئے۔ ”یار پیچھے ایک نظرمار لیں۔“ میں نے گازی کی  
طرف بڑھتے ہوئے طبیب کو روک کر کہا۔

”ہاں تم دیکھو لو۔ میں گازی اسٹارٹ کرتا ہوں۔ ایکمیڈنٹ کے بعد کچھ پر الہم ہو  
گیا ہے اس میں۔“

وہ گازی کی طرف بڑھا۔ میں پیچھے چل پڑا۔ میں نے دور ہی سے اس حصے کی  
طرف دیکھا جہاں رات ایسا کو دفتاری تھا۔ سب ٹھیک تھا۔ جھاڑیاں اسی طرح رکھی تھیں  
جیسے رات میں نے رکھی تھیں۔ میں اطمینان کر کے لوٹ آیا۔ گازی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔  
ہم نے باہر نکل کر گیٹ بند کیا۔ یہاں ایک بڑا ساتھا پڑا تھا جس کی جانب ایسا نے مجھے دے  
دی تھی۔ میں نے ٹالا لگایا اور ہم گھر کی طرف چل پڑے۔

☆-----☆-----☆

طاہر بھائی پہنچ چکے تھے کیوں کہ باہر پرروج میں ان کی گازی کھڑی تھی۔ زہرہ آپا  
اب بھی ہولائی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے پر نقاہت اور وحشت تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی یہ  
وحشت ختم ہو گئی مگر تقاضہ طاری رہی۔ میں جانتا تھا کہ وہ اتنی ہی نازک مزاج ہیں جب  
کہ عصمت آپا زار اسخت دل کی اور زیادہ قوت برداشت کی مالک تھیں۔ انہوں نے بت  
سی شکایتیں کیں طاہر بھائی نے زور دیا کہ میں فوراً اپنا سامان لے کر یہاں چلا آؤں میں نے  
بہت مشکل سے انہیں قاتل کیا کہ جہاں رہ رہا ہوں، وہ میرے آفس کے ہیڈز کو اور اڑسے  
کافی قریب ہے اور وہاں مجھے بہت سی سوتیں میسر ہیں۔ بڑے جان جو کھوں اور طبیب  
سے تقدیق کروانے کے بعد ان لوگوں نے ہارمنی۔ زہرہ آپا نے کھانے کا انتظام کیا مگر ہم تو  
اس وقت ناشتا کر کے آرہے تھے۔ رات کے کھانے کے لئے البتہ رک گئے۔ یہ ضروری  
تھا۔ اگر میں آج بھی نہ رکتا تو ان لوگوں کا اصرار جاری رہتا اور میں وقت ضائع کرتا۔

آج مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ رات کو رابرٹ سے فون پر بات  
کروں گا اور اس سے جینوں کی خیریت دریافت کروں گا پھر اس کے پاس جانے کا پروگرام  
بناؤں گا۔ طبیب آج آفس نہیں جا سکتا تھا اس لئے کچھ لوگوں کو فون کرنے لگا۔ میں زہرہ آپا  
سے گھر کی خیریت پوچھتا رہا۔ انہی کی زبانی پتا چلا کہ اماں اور عصمت آپا ٹھیک ہیں۔ شجاع  
بھائی کا فون آیا تھا۔ دادا کی طبیعت بھی ٹھیک ہے اور انہوں نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ جس  
قدر جلد ہو سکے میں لوٹ آؤں۔ پھر میں یہ سن کر اچھل پڑا کہ شالی پیدا دادا کے پاس پہنچ  
تھے اور میرے لئے انہوں نے بھی یہی پیغام دیا ہے کہ ان سے میرٹھ پہنچ کر ملوں۔

اب تو میری بے قراری عروج پر پہنچ گئی۔ ہر کام کرنے سے پہلے میرا شالی بیبا سے  
ملنا ضروری ہو گی۔ میں تو خود پریشان تھا کہ ان سے کیسے ملوں گا، میں نے زہرہ آپا سے کہ  
دیا کہ ہو سکتا ہے، میں کل ہی دہلی چلا جاؤں۔ وہاں سے میرٹھ جاؤں گا۔ انہوں نے تأکید

کی کہ ان سے مل کر ہی جاؤ۔ وہ یہاں کے حکیم سے دادا کے لئے ضروری دوائیں لے کر بھجوانا چاہتی تھیں۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ رات کے کھانے پر طبیب نے بھی گھر میں بتا دیا کہ وہ جب تک میں یہاں ہوں، میرے ساتھ ہی رہے گا۔ زہرہ آپا کے سامنے اس نے دست بستہ اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ وہ ہولانا چھوڑیں یا نہ چھوڑیں مگر اسے ہولانے سے باز رہیں۔ پھر جب میں نے اسے بتایا کہ میں شاید دو چار روز کے لئے ولی اور میرٹھ جاؤں تو شالی بابا کے ذکر پر اس نے بھی اعلان کر دیا کہ وہ اب میرے ساتھ ہی جائے گا، بلکہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں جنم تک ضیاء کا ساتھ نہجاوں گا۔

”کیوں بھائی! میں نے کیا قصور کیا ہے؟“ میں نے نہ کر کمل۔

”دل ہی تو ہے، گدھے پر آگیا۔“ اس نے نوالہ چباتے ہوئے کمل۔

اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس وقت بھی وہ ایسے کھانا کھا رہا تھا جیسے یہ اسے کئی دن بعد نصیب ہوا ہو۔ بہر حال میں اس کے اندر ایک نئی امنگ، نیا حوصلہ اور واضح تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس نے تریک تبدیل کر لیا ہو۔ میرے حساب سے یہ ایک خوش آئند تبدیلی تھی۔ میں اس کے اس فیض پر خوش ہوا کہ وہ ان خوفناک حالات کے باوجود میرے ساتھ رہنے پر تیار ہے بلکہ میرے ساتھ سفر بھی آمادہ ہے۔

کھانے کے بعد ہم لوگ دیر تک باشیں کرتے رہے۔ رات تقریباً دس بجے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ زہرہ آپا نے حسب عادت اصرار کیا کہ کل صبح بھی آجاؤں مگر میں نے آفس کے کام کا بہانہ کر کے مغذرات کر لیں لیکن جانے سے پہلے آنے کا وعدہ کر لیا۔ ہم اجازت لے کر وہاں سے نکل آئے۔

طبیب نے ایک چھوٹا سا اٹپیچی کیس ساتھ لے لیا تھا جس میں اس نے اپنی ضرورت کی چیزوں رکھ لی تھیں۔

ہم اس پر اسرار کو بھی میں دس بن کر پہنچتیں منٹ پر داخل ہوئے۔ پوری کوئی ٹھپپ اندر ہیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں نے اترتے ہی سب سے پہلے باہر کا بلب جلایا۔ پھر دروازہ کھولا۔ ہاتھ پر ہماکر اندر بھی روشنی کر دی۔

”یار ضیاء! کیا یہاں بارش ہوئی ہے؟“

طبیب نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پلت کر اسے، پھر زمین کی طرف دیکھا۔ گیٹ سے دروازے تک آنے والی کچی روشن بھیگلی ہوئی تھی پھر میں نے لان پر نگاہ ڈالی۔ یہاں سے

وہاں تک پہنچنے والی روشنی میں اس کا جتنا حصہ بھی نظر آ رہا تھا، وہ گلیا تھا مگر جب ہم دونوں نے گیٹ کے باہر اور کوئی کی بائیں طرف نگاہ ڈالی تو سب خشک تھا۔

”میرا خیال ہے مالی نے چھڑ کا کیا ہے۔“ میں یہ کہتا ہوا اندر بڑھنے لگا۔ مگر طبیب نے میرا بازو پکڑ کر مجھے روک لیا۔

”کون سامالی؟“ اس نے پوچھا۔

”ہو سکتا ہے، اس نے کوئی مالی لگایا ہوا ہو۔ اتنے بڑے لان کی دیکھ بھال وہ خود تو نہیں کر سکتی ہوگی۔“ میں نے جواب دیا۔

”لیکن مالی کمال سے آیا۔ کوئی کے اندر تو کوئی نہیں ہے اور باہر گیٹ پر ہم تلا لگا کر گئے تھے۔“

اب میں چوک کر پلٹ گیا۔ چند لمحے میں نے طبیب کی آنکھوں میں جھانکنا اور سوچنا رہا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ باہر سے کسی کے آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گیٹ بھی کافی اونچا تھا۔ اب میں نے جائزہ لیا شروع کیا۔ بایہر کے جتنے بلب ٹھیک تھے سب روشن کر دیئے۔ ایک بلب لان کا بھی روشن ہو گیا۔ یہاں صرف لان اور سامنے کی روشن کو پانی دیا گیا تھا۔ پائپ لان کے ایک کونے میں لگے نکلے پر فٹ تھا اور اب بڑے سلیقے سے گولائی میں لپٹا رکھا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میرے دلاغ بیس شنسی سی پچیل گئی۔

”آؤ.....! اندر کا حال دیکھیں۔“ میں نے اندر جانے کے لئے پلتھے ہوئے کمل۔ طبیب بھی کافی حیران تھا مگر جیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے چہرے پر غوف نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے سنجیدگی سے سوچا کہ مجھے طبیب کے بارے میں اپنی رائے شاید تبدیل کرنا پڑے مگر میں اس میں کچھ وقت اور لیٹا چاہتا تھا۔ جس کی امید اب بندھ گئی تھی۔ اب میں طبیب کو قریب سے دیکھ کر جانچ سکتا تھا۔

ہم آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ لائٹ جلانی، چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ سب ٹھیک تھا۔ ویسا ہی تھا جیسا چھوڑ کر گئے تھے۔ میں اب اوپر کی طرف چلا۔ طبیب میرے پیچھے تھا۔ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو لگا میںے کچھ گڑبری ہے۔ چونکا۔ میں نے دیکھا کہ طبیب کے چہرے پر بھی ہلکی سی ابھن ہے۔ میں نے پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ اس بار جلد ہی خیال آگیا کہ کیا گڑبری ہے۔ وہ کمبل پا سنٹی پر سیلیتے سے تھہ کیا رکھا تھا تھے میں یو نہیں چھوڑ گیا تھا لیکن ”وسرے ہی لمحے یہ خیال بھی آیا کہ میں نیچے پلا گیا تھا طبیب بعد میں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ

رہا تھا۔ برتن دھلے ہوئے تھے۔ ہر چیز جو بے ترتیب پڑی تھی اب انپی جگہ پر تھی۔ ”یہ تم نے دھوئے ہیں؟“ میں نے برتوں کی طرف اشارہ کیا۔

”باؤ لے ہوئے ہو کیا؟ میں دھوؤں گا؟ ضیاء! وہ یہیں کیس ہے۔“

”کون؟“ مجھے اب حیرت کے ساتھ، الجھن بھی ہو رہی تھی۔ تجسس اپنے پنج گاڑ رہا تھا۔

”وہی جو ہماری خدمت پر مامور ہے۔ چلو! اس طرف سے تو اطمینان ہو گیا ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ کام بانت لیں یا پھر کسی دل، گردے والی عورت کا بندوبست کرنا پڑے گا۔“

”یہ سب عجیب ہے۔ میں کسی مافوق الغطرت یا مادرائی ہستی کی موجودگی کے احساس کے ساتھ یہاں رہنے میں دشواری محسوس کروں گا۔ وہ جو بھی ہے، اسے سامنے آتا پڑے گا۔“ میں نے ہونٹ دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔  
”کاش! وہ چائے بھی پنا کر رکھتی۔ کتنی آسانی ہو جاتی۔“ طیب نے یہ کہتے ہوئے چائے کا پانی رکھ دیا۔

”تمہیں کیسے پتا کہ وہ موٹت ہے؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

”ظاہر ہے، اتنا سلیقہ کسی مذکر میں تو ہو نہیں سکتا۔ خیر چائے پی کر اطمینان سے تلاش کریں گے اور ہاں.....! ابھی ہمیں وہ حصہ بھی دیکھنا ہے جو رات کھولا تھا۔“  
اس کے یاد دلانے پر میں چونکہ میرے ذہن سے تو نکل ہی گیا تھا۔ میں تیزی سے اسی چھپلی دیوار کی طرف بڑھا۔ میں نے پرده ہٹا کر دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور بالکل اسی حالت میں تھا جیسا ہمارے کھونے سے پسلے تھا۔ طیب بھی پکن کے دروازے سے ادھری دیکھ رہا تھا۔

”اف.....! پھر اتنی ہی محنت کرنا پڑے گی۔ یار! حیرت ہے۔ دوسری طرف قبضے بھی تو نہیں چیز کہ آدمی انہیں ہی کھوں لے۔ کس طرح بنایا گیا ہے؟“

میں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ بہر حال فی الوقت تو نہ ہست تھی نہ طاقت۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا۔ پھر رابرٹ کو فون کرنا بھی ضروری تھا۔ جینو کی مجھے بھی فکر تھی حالانکہ میں نے جینو کو دیکھا نہیں تھا مگر سورن سنگھ اور رابرٹ نے اس کا جس انداز میں ذکر کیا تھا اور ان میں، میں نے جینو کے لئے جس جذبے کو محسوس کیا، وہ مجھے بھی پریشان

سلیقہ مند آدمی ہو۔ اس نے تہہ کیا ہو پھر بھی میں نے اس سے پوچھا تو وہ اچھل پڑا۔  
”ہاں.....! مجھے لگ رہا ہے کہ کچھ ہوا ہے۔ میں تو کمبل یونی چھوڑ گیا تھا اور میرے کپڑے!“ اتنا کہہ کر وہ ادھر اور ہر دیکھنے لگا۔ ”کہاں تھے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں.....! بستر پر ہی چھوڑ گیا تھا۔“ وہ ڈھونڈتے ہوئے بولا پھر باٹھ روم میں گیا۔ ”مل گئے“ یہاں لٹکے ہیں۔ ”مگر یا.....! کیسے؟“ وہ سخت حیرت زدہ تھا۔

حیرت بھے بھی تھی۔ میری بھی بھج میں کچھ نہیں آ رہا تھا مگر ذہن کچھ سوچنے سے بھی انکاری تھا۔ میں بستر کے کنارے بیٹھ گیا۔ طیب آ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔  
”ضیاء.....! یہاں کوئی ہے۔“ اس نے ایسے انداز میں سرگوشی کی جیسے کوئی

برے پتے کی بات بتا رہا ہو۔

”میں نہیں پڑا۔“ ظاہر ہے، ”مگر کوئی کون؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔“

”ایسا کی لاش ہم نے دیکھی اور لا کر دندا رہا۔ ایسا کا حشر بھی ہم یہی کر چکے ہیں۔“ تیسرا یہاں کوئی تھا، نہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ بھی ایسا جو یہاں رہتا اور کوئی کا خیال رکھتا ہو۔“

”اس چور خیز کو بھول گئے جس نے استقبال کیا اور پکن سے مشروب چڑا کر ہمیں پلایا تھا؟“

”ارے ہاں.....! مگر وہ تھی کون اور کہاں گئی؟“ تم نے ایسا سے کچھ پوچھا تھا۔“

”ہاں! مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اس کی بیٹی کے سوا کوئی نہیں ہے۔ میں کو ایسا کی بیٹھی سمجھتا رہا مگر وہ..... وہ نہیں تھی۔“

”میں چائے بناتا ہوں۔ تم سوچو۔“ وہ انھ کر کھڑا ہو گیا۔  
میں باٹھ روم چلا گیا۔ نماکر اور کپڑے تبدیل کر کے رابرٹ کو فون کرنے کا ارادہ تھا۔ ابھی میں نے اندر جا کر باٹھ روم کا دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ طیب کے پکارنے کی آواز سن کر باہر آگیلے۔ وہ بیچے ہی سے مجھے آواز دے رہا تھا۔  
”کیا بات ہے؟“ میں نے اوپر ہی سے جھانکا۔

”جلدی آؤ!“ اس نے کہا اور پکن میں مگھ گیا۔  
میں تیزی سے بیچے اتر ا۔ پکن میں داخل ہوا تو سنائے میں رہ گیا۔ پورا پکن چمک

کئے ہوئے تھا۔

میں سوچ میں غرق تھا کہ طیب چائے لے آیا۔ چائے پینے سے پسلہ ہی وہ کپڑے تبدیل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اوپر چلا گیا۔ میں نے ٹیلفون انھیا اور واپس صوفے پر آبیٹھا۔ رابرٹ کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسرا جانب فوراً ہی فون انھیا لیا گیا۔ ”بیلو مسٹر رابرٹ!“ میں نے کہا۔

”اوہ لیں.....! ہاؤ آر یو مسٹر ضیاء؟“ وہ چکا۔ مجھے لگا جیسے وہ خوش ہے۔

”آپ کیسے ہیں؟“

”فائن..... مسٹر ضیاء! جینو تم سے ملنا چاہتا ہے۔“

”میں نے اسی لئے فون کیا تھا۔ میں اس کے بارے میں خیریت جانا چاہتا تھا۔“

”وہ کس حالت میں ہے، یہ تو اس نے مجھے نہیں بتایا۔ وہ بات کم کرتا ہے مسٹر ضیاء اور روتا زیادہ ہے مگر جب میں نے اسے بتایا کہ تم فرشتہ بن کر ہمارے پاس پہنچ گئے ہو تو اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اسے بھی تم سے ملا دوں گر ضیاء.....! حرمت کی بات ہے کہ اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ خود کہاں ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں حیران ہو گیا۔

”میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہا ہے۔ اپنا ایڈریلیس مجھے بتائے، میں تمہیں لے کر اس تک پہنچ جاؤں گا مگر وہ اور زور زور سے رونے لگا۔ میں نے کہا۔ میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہی جگہ ہے۔ میں ایک روز وہیں سویا تھا جہاں ہم سب ساتھ تھے مگر اگلے روز آنکھ کھلی تو لکڑی کے بنے کسی ایسے تھے خانے میں قید تھا جس میں نہ کوئی کھڑکی ہے، نہ دروازہ اور نہ ہی کوئی ایسی روازن جہاں سے باہر کچھ دکھائی دیتا ہو۔“

”کوئی روشن داں نہ ہو گا مسٹر رابرٹ.....!“

”نہیں،“ کہتا ہے، ایک سوراخ بھی نہیں ہے۔ وہ پورے قید خانے کو دیکھے چکا ہے اور مسٹر ضیاء.....! ایک بڑی خبر یہ ہے کہ وہ چل شیں سکتا۔ اس کی ٹانگیں بھی میری ہی طرح سڑک کر مڑ گئی ہیں۔“ رابرٹ کی آواز بیکی ہوئی تھی۔

”اوہ..... رابرٹ! یہ پتا چلا بہت ضروری ہے کہ وہ کہاں ہے؟ اور سنو! کیا تم مجھے اس کا فون نمبر دے سکتے ہو؟“

”ہاں.....!“ اس نے جواب دیا۔ میں نے طیب سے اشارے سے کہا کہ وہ کافی

اور پین دے۔ یہ چیزیں فون والی ٹیبل پر رکھی تھیں۔ وہ انھالا یا۔ رابرٹ نے مجھے فون نمبر لکھا دیا۔

”کیا تم اس سے بات کرو گے؟“

”ہاں، میں کوشش کروں گا کہ پتا چل سکے۔ مگر سنو رابرٹ! اگر اس جگہ کوئی روزان بھی نہیں، تو وہ زندہ کیسے ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے اور کیا وہاں کھانے پینے کا بندوبست ہے؟“

”پتا نہیں مسٹر ضیاء! اول تو مجھے یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں اس سے یہ بات پوچھتا۔ دوسرے یہ کہ وہ روتابہت ہے۔ ابھی بھلے آدمی کی کھوپڑی اڑ جاتی ہے۔ وہ بہت معصوم ہے مسٹر ضیاء! مجھے زندگی بھروس رہے گا تو صرف جینو کا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس سے رابطہ رکھوں اور پتا کروں کہ وہ کہاں ہے؟ مگر میرا ارادہ ہے کہ کل دہلی جاؤں۔“ پھر میں نے اسے شالی بیباکے بارے میں بتا دیا۔ مجھے اس وقت اس سے نفرت محسوس ہوئی جب شالی بیباکا سنتے ہی وہ جینو کا بھول گیا اور بولا۔

”اوہ مسٹر ضیاء! تم فوراً چلے جاؤ۔ وہ ہمارے لئے ضرور کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔“

”پلیز..... دیر نہ کرو۔ یہ سب کچھ بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔“

”تم بہت خود غرض اور کمینے آدمی ہو رابرٹ!“ میں نے سرد لہجے میں جواب دیا۔ ”کک..... کیا..... کیا مطلب.....؟“ وہ ایک دم ہکلانے لگا۔ جان گیا کہ میں کیا کہ رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں۔

”مطلب تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”ویکھو مسٹر ضیاء.....! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ میں اس لئے جذباتی ہو گیا تھا کہ وہ ہمیں..... سب کو اس عذاب سے نجات دا سکتے ہیں۔ جینو کو بھی..... جہاں اس نے اتنی اذیت انھیا ہے۔ ایک آدھ دن اور انھا لے گا مگر پھر اسے عذابوں سے کمل نجات مل جائے گی۔“

”اس ایک آدھ دن میں وہ مر بھی تو سکتا ہے مسٹر رابرٹ.....!“

”نہیں..... ایسا نہیں ہو گا۔“

”کیوں..... یہ یقین کیوں ہے تمہیں؟“

”اب ہمیں ساتھ ہی رہنا ہے۔“

”وہاٹ..... کون ہیں آپ.....؟ اور نئی.....؟ غالباً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ایسا کوئی نہیں ہوں جس کے ساتھ آپ کو رہنا پڑے۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ مسٹر جینو پیار پتے ہیں یہاں یا میں نے رانگ نمبر ڈائل کیا ہے؟“  
وہ فہمی اور فہمی چل گئی۔ وہی ”کھنک“ تارے سے بکھر گئے میرے آس پاس۔ ہاتھ میں ریسیور لرز گیا۔ رنگیں خیالیں سی فضاؤں میں اڑتی محسوس ہونے لگیں۔  
”لک..... کون ہو تم.....؟ سامنے کیوں نہیں آتیں.....؟“

”آئی تو تھی؟“ وہ اتنا کہہ کر شرارت سے ہنس دی۔

”کون ہو تم؟“ میں اس بار چیخا۔ ”اور کیوں سب کو پریشان کر رہی ہو۔“  
”میں سب کو پریشان کرنا چھوڑ دوں گی اگر تم..... تم مجھے اپنالو تو۔“ وہ بڑے جذباتی انداز میں بول رہی تھی۔ اس کی آواز کی بھراہٹ نے میرے پورے وجود میں عجیب کیف اور سفہی کی پھیلادی تھی۔

”ویکھیے خاتون! آپ کو سو فیصد غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے رانگ نمبر ڈائل ہو گیا ہے۔“ میں نے اس سے زیادہ بات نہیں کی اور طیب کے پڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر کے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

”کون تھی..... وہی ہو گی یا..... زیوسا.....؟“

”ہو سکتا ہے۔ مگر..... جینو! لیکن طیب،“ وہ آواز نہیں تھی جو میں نے رابرٹ کے فون پر پہلی بار سنی تھی پھر بھی..... آواز مانوس تھی۔ مجھے ایسا ہی لگا۔“

”تمسیں نام تو پوچھنا چاہئے تھا۔“ طیب جھلا گیا۔

میں نے اس کے سامنے رکھا کاغذ اخفاک دوبارہ نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف تل بچ رہی تھی۔ میں ریسیور کان سے لگائے رہا۔ دو تین بار گھنثی بختے کے بعد کسی نے ریسیور اخفاک لیا۔

”ہیلو رابرٹ.....! کیا یہ تم ہو؟“ دوسری طرف سے کسی لڑکے کی سرگوشی ابھری۔ وہ بڑی رازداری سے بات کر رہا تھا۔

”مسٹر جینو پیار!“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”لک..... کون ہو تم؟“ دوسری جانب سے گھبرا کی ہوئی آواز آئی۔

”بس..... میرا دل کھلتا ہے۔ وہ جو بھی ہے،“ ہمیں صرف اذیقیں دینا چاہتی ہے۔ مرگ کے تو اسے کچھ ملنے والا نہیں۔“

”وہ تو وہ اتنے یرسوں میں جان چکی ہو گی کہ تم لوگوں سے اسے کچھ ملنے والا نہیں۔ بھر حال، یہ فیصلہ مجھے کرتا ہے کہ مجھے کب جانا ہے اور کب ان سے مانا ہے۔ میں واپس آکر تم سے رابطہ کروں گا۔“

”سنو! پلیز فون بند نہیں کرنا۔ دیکھو مسٹر ضایع..... پسلے تم اپنا دل صاف کرلو۔“ میرا مطلب قطعی وہ نہیں تھا جو تم نے سمجھا ہے۔ میں جینو سے بست پیار کرتا ہوں۔“

”میں نے اسے بتایا اور پھر فون نمبر دیکھنے لگا جو طیب نے لکھ لیا تھا۔ میں نے نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے تل سنائی دیتی رہی پھر کافی دیر بعد میں فون رکھنے ہی والا تھا کہ کسی نے فون اٹھایا مگر ریسیور اٹھانے والا بولا نہیں۔“

”ہیلو!! ہیلو..... مسٹر جینو پیار.....؟“ میں نے سانس کی آواز سن کر پوچھا۔

”آپ.....؟ کیسے ہیں آپ؟“ مانوس کی آواز لکھی تھی اور یہ سن کر تو میں اچھل ہی پڑا تھا کہ بولنے والی کوئی لڑکی یا عورت تھی۔

”لک..... کون؟“ میں سمجھا کہ شاید میں نے بے خیالی میں کوئی غلط نمبر ڈائل کر دیا یا رابرٹ نے ہی غلط نمبر لکھوا یا ہے۔

”آپ کی دوست!“ دوسری جانب سے کھلکھلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”میری دوست؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ میں اس کی آواز پھر سنتا اور اندازہ لگاتا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور کیوں مجھے اس کی آواز مانوس محسوس ہوئی ہے۔

طیب یہ سب کچھ سن کر آگے کی طرف سرک آیا۔ وہ اشارے سے پوچھ رہا تھا کہ کون ہے؟ میں نے اشارے ہی سے بتایا کہ میں نے جینو کا نمبر ڈائل کیا ہے اور وہاں سے کوئی عورت بول رہی ہے۔ طیب نے ریسیور مجھ سے ماٹا گر میں نے نہیں دیا۔

”ہاں..... میں خاطر تھی۔“ دوسری طرف سے بڑی اپنائیت سے کما آیا۔

”مگر میں آپ کو نہیں جانتا۔“

”جان جائیں گے۔ اب تو جان ہی جائیں گے۔“ دوسرے جملہ بڑے معنی خیز انداز میں ادا کیا گیا تھا۔

”مطلوب.....؟“

دونوں ایک ہی نہیں تھیں۔ جو آواز میں نے رابرٹ کے فون پر سنی تھی وہ اس آواز سے مختلف تھی۔ دونوں کی نہیں بھی سنی تھی۔ جو نہیں اس کی تھی، اس نے مجھے جھنجھنا دیا تھا جب کہ میں رابرٹ کی فون پر جو اس کی نہیں سن چکا تھا، اس میں سفاکی اور تمثیر تھا، طنز تھا، غدر تھا۔ اگر یہ لڑکی جس نے ہمارا استقبال کیا تھا، یہی زیوسا تھی تو پھر وہ کون تھی؟ میں امتحنا چلا گیک۔ طیب مجھے دیکھتا رہا۔ اب وہ سامنے کی صوفیہ پر لیٹ گیا تھا۔ میں نے سگریٹ سٹکا لیا۔ میں گھڑی دیکھتا جا رہا تھا۔ تقریباً دس منٹ تک میں ان عورتوں کا موازنہ کرتا رہا پھر میں نے فون سرکار نمبر ڈائل کیا۔ اس بار فون پہلی ہی بیل پر اٹھا لیا گی۔ دسری جانب جینو تھا۔ اب اس کی آواز نارمل تھی بس اس میں بے تابی بہت تھی۔

”بیلو مسٹر ضیاء! یہ تم ہونا!“

”ہاں جینو..... تم کیسے ہو؟“

اتا پوچھنا غصب ہو گیا۔ وہ ایسا بلک کر رہا کہ میرا بھی بھر آیا۔ وہ روئے ہوئے کہ رہا تھا۔

”مسٹر ضیاء بائی گاؤ..... اس سارے کھلیل میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ بس جوان تھا! جذباتی ہو کر ایلن کے بیٹہ روم میں چلا گیا تھا۔ مجھے بتاؤ..... میرا کیا صورت تھا۔ ان لوگوں نے میرے ساتھ یہ سب کیوں کیا! مجھے تو دولت سے بھی پیار نہیں رہا۔ میں تو لڑکیوں پر بھی بری نگاہ ڈالنا پسند نہیں کرتا تھا مگر ایلن بہت پُرکشش عورت تھی۔ اس نے مجھے خود دعوت دی تھی۔ یقیناً وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں بے قصور ہوں پھر یہ میرے کیوں پچھے کیوں پڑی ہے؟ کیوں؟ مسٹر ضیاء! وہ مجھے مرنے بھی نہیں دیتی۔ وہ مجھے کچھ گوشت کے، خون میں لختے ہوئے نکلڑے کھلاتی ہے۔ میں قریب المrg ہو جاتا ہوں، سینہ پھٹنے لگتا ہے۔ پیٹ پھٹنے لگتا ہے مگر وہ..... پھر مجھے بچالیت ہے۔ ضیاء.....! پلیزا! مجھے بچالو یا پھر مجھے زہردے دو۔“

”میں تمہارے پاس کیسے پہنچ سکتا ہوں جینو!“

میرے سوال کرتے ہی دوسری طرف گمراہنا چھاگیا پھر یہ سناتا اس کی سکیوں ہی سے ٹوٹا۔ وہ پھر بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ”میں نہیں جانتا..... یہ میں نہیں جانتا کہ میں کہاں ہوں۔“

”میں ضیاء ہوں۔ ضیاء الرب رضوی۔ عطاء الرب رضوی کا بیٹا۔“ میرا اندازہ تھا کہ دوسری جانب جینو ہی ہے۔

”اوہ..... تم..... تم..... ضیاء ہو..... اوہ، میں بہت خوش ہو گیا ہوں۔ مجھے رابرٹ نے بتایا تھا۔ مگر سنو! تم کچھ دیر بعد فون کرنا۔ میں منتظر رہوں گا۔ فون ضرور کرنا ضیاء.....“

وہ گھبرا گھبرا کر بیول رہا تھا۔ اس کی آواز سرگوشی کی صورت میں آرہی تھی جیسے وہ کسی کی موجودگی کی وجہ سے آہستہ بول رہا ہو۔

”مسٹر جینو! کیا وہاں کوئی ہے؟ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

”بعد میں..... بعد میں.....“ اس نے پورا جواب دیئے بغیر فون بند کر دیا۔ طیب بے چلن تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ غالباً پہلی بار بھی یہی نمبر ملا تھا اور وہ کسی کی موجودگی سے خوفزدہ تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ نج کربائیں منٹ ہو رہے تھے۔ میری چائے ولی ہی رکھی تھی۔ میں نے ایک ہی گھونٹ میں کپ خالی کر دیا۔

”شاید وہ اسی عورت سے خوفزدہ ہو اور کیا پتا، وہ عورت وہی زیوسا ہو۔ یا ر‘ عورت اور خوف دو متضاد چیزیں ہیں مگر یہاں بات اتنی نظر آتی ہے۔ زیوسا خوف کی علامت بن گئی ہے۔“

”تمہارے لئے وہ خوف کی علامت ہو گی۔“ میں نے منہ بیلایا۔

”اور تمہارے لئے؟“ اس نے میرا سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر اس میں سے سگریٹ نکالتے ہوئے مجھے دیکھا۔

”چیلچیں بن گئی ہے۔ سنو!“ میں چونک اٹھا۔ ”وہ کہتی تھی کہ وہ آئی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ تم سامنے کیوں نہیں آتیں تب تھی اور بولی، آئی تو تھی۔“

”ضیاء..... کیا یہ وہ لڑکی نہیں ہو سکتی جس نے یہاں ہمارا استقبال کیا تھا! جس نے لان اور روشنی کو پانی دیا ہے، جس نے پکن صاف کیا اور برتن دھوئے ہیں۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ یقین تو مجھے ہو گیا تھا کہ زیوسا ہمارا سایہ بن گئی ہے۔ یہ بھی یقین تھا کہ طیب کی گاڑی کو ایسا سے نکرانا، اسے مروانا، ایسا کو ختم کرانا، یہ سب بھی اسی کا کام تھا۔ وہ مجھے زیچ کرنا چاہتی تھی مگر جو بات میں نے مونیکا کی موجودگی میں محسوس کی، وہی اس لڑکی کی موجودگی میں بھی محسوس ہوئی تھی۔ حالانکہ یہ

”مشرضیاء..... مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ بس آنکھوں ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے بچالو۔ مجھے اس کی قید سے نجات دلا دو مشرضیاء میں زندگی بھر تھارا یہ احسان نہیں بھولوں گا۔ پلیز!“

”ٹھیک ہے جینو.....! میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم اس قید سے نجات پالو گے مگر اس کے لئے میرا تم تک پہنچا بہت ضروری ہے۔ پلیز! مجھے اندازہ لگا کر بتاؤ کہ یہ کیسی جگہ ہے! تم کیا سنتے اور کیا محسوس کرتے ہو؟“

”وہ آتی ہے، بھتی ہے، میرا تم سفر اڑاتی ہے، مجھ پر طنز کرتی ہے کہ تم نے اپنی زندگی کی یہی اور آخری لذت آئیز رات یہیں کے ساتھ گزاری تھی۔ اب اسی کے سارے پوری زندگی گزار دو۔ وہ میری بات نہیں سنتی۔ میرے رونے پر بھتی ہے اور..... اور ہاں مشرضیاء! جب وہ مجھ سے باشیں کرتی ہے تو میرے بالکل سامنے دیوار پر ایک بڑی سی مکڑی بیٹھی رہتی ہے مگر جب وہ چلی جاتی ہے اور میں اس مکڑی کو تلاش کرتا ہوں تو وہ بھی مجھے نظر نہیں آتی۔ جب وہ آتی ہے تو میں مکڑی کو اترتے دیکھتا ہوں مگر جب وہ چلی جاتی ہے تو مکڑی جاتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی۔ اچانک نظر سے او جھل ہو جاتی ہے اور سنو.....! ایسا ہونے سے پہلے..... یعنی اس کی آمد سے پہلے مجھے کہیں دور کال یہیں بجھنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ممکن ہے، یہ میرا وہم ہو۔ ممکن ہے، یہاں قریب کوئی ایسا گھر ہو جہاں سے کال یہیں کی آواز مجھے سنائی دیتی ہو اور یہ اتفاق ہو کہ میں اسی وقت وہ آجائی ہے۔ ممکن ہے، میں پاگل ہو گیا ہوں۔ سب بے سروپا باشیں مجھے مربوط نظر آتی ہیں۔ مشرضیاء پلیز! تم..... تم میری باتوں پر دھیان نہیں دیتا۔ تم نے کہا ہے تاں کہ میں سب کچھ پتا رہوں، جو سنتا اور محسوس کرتا ہوں۔“

”ہاں جینو.....! تمہاری ساری باشیں کام کی ہیں۔ ان میں کوئی بات بے سروپا نہیں۔ تم بتاؤ، اور تم کیا محسوس کرتے ہو؟“

”بھی کبھی کسی گاڑی کے رکنے اور اشارت ہونے کی آواز بھی سنتا ہوں۔ شاید یہاں قریب ہی کوئی رہتا ہے مگر یہ کتنی اذیت ناک بات ہے مشرضیاء کہ میں پھر بھی بے بس ہوں۔ کوئی میری مدد کو نہیں آتک۔ میں نے برسوں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی رابرٹ مجھے فون کر لیتا ہے۔ ایک بار سورن سنگھ نے بھی مجھے فون کیا تھا اور آج تم.....“

”دیکھو جینو! میری بات غور سے سنو! تم مرد ہو۔ تمہیں ہمت سے کام لیتا ہو گا۔ تمہیں زندہ رہنا ہے جینو، پسلے تو یہ بات طے کر لو۔ زندہ رہنے کا ارادہ کرو گے تو ہمت اور جرات بھی پیدا کر سکو گے۔ زندگی کے لئے جس جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے جیسو وہ پسلے ایک جذبے کی شکل میں ہی آؤ میں پیدا ہوتی ہے، وہی جذبہ اسے کچھ کر گزرنے کے اکساتا ہے۔ آنسو پوچھ لو۔ وعدہ کرو کہ اب تم موت کے بارے میں نہیں، زندگی کے بارے میں سوچو گے۔“

وہ ہچکیوں کے درمیان میری بات سن رہا تھا۔ میرے خاموش ہوتے ہی اس کا سکیاں ہتم گئیں۔

”جینو! تم سن رہے ہو، میں کیا کہہ رہا ہوں!“

”ہاں..... ہاں.....“

”شاہش جینو! اب اپنے اردو گرد غور سے دیکھو۔ مجھے بتاؤ، کیا تم کسی زیر زمین جگ میں قید ہو؟“

”پتا نہیں مشرضیاء! مگر یہاں میرے تین اطراف بدبو دار لکڑی کی دیواریں ہیں۔ سلیمان زدہ فرش پر چھوٹے چھوٹے کیڑے ریکڑ رہے ہیں۔ وہی سفید کیڑے جو گندگی میں پلتے ہیں۔ پہلے مجھے ان سے خوف آتا تھا مگر اب میں ان کا عادی ہو گیا ہوں۔ یہ اب مجھے نہیں کہتے بلکہ ان کی بدن پر سرسر اہست ہی اب مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس دلانا ہے۔ میں ان سے ماوس ہو چکا ہوں۔“

”کیا یہاں تمہارے علاوہ بھی کوئی ہے؟“

”ہاں..... مگر وہ کون ہے، مجھے نظر نہیں آتی۔ صرف سنائی دیتی ہے۔ میں جا ہوں کہ میں اس کی قید میں ہوں۔ وہی میرے لئے غلط کھانے کا بندوبست کرتی ہے۔“ مشرضیاء..... وہ مجھے ہر اسال کرتی رہتی ہے۔ کیوں! یہ میں نہیں جانتا۔ میں اسے بتا ہوں کہ میں بے قصور ہوں۔ وہ بھی جانتی ہے۔ کہتی ہے کہ اسی لئے وہ میرا خیال رکھے۔ مگر مشرضیاء.....!“

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر پھر رونے لگا۔ وہ واقعی بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ میرا بھی بھر آیا۔ ”جینو! تم پریشان مت ہو۔ مجھے اس کے اور اپنے بارے میں جس قدر بتاؤ۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز..... روؤ نہیں..... مجھے بتاؤ.....“

تمہیں بھی اپنے جال میں چھائیں لے گی۔

”کیا تم نہیں چاہتے کہ تم سب اس عذاب سے نجات پا جاؤ؟“

”مگر میں احسان فرماؤش نہیں ہوں مشرضیاء، تم پر احسان کرنے والے ہو۔ مشر عطا مجھے بہت پسند تھے۔ تم ان کے بیٹے ہو۔ میں بھی نہیں چاہوں گا کہ تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو۔“

”تھیک یو جینو! میں تمہارے جذبے کی قدر کرتا ہوں۔ مگر تم میری طرف سے پریشان مت ہو۔ میں ہر طرح سے محفوظ رہوں گا۔ اور ہاں سنو! میں چار پانچ روز کے لئے ولی اور میری بھٹ جا رہا ہوں۔ وہاں سے ایسا انتظام کر کے آؤں گا کہ وہ میرا بال بھی بیکا نہیں کر سکے گی۔ تم اس سے یہی کہنا کہ وہ کچھ دن انتظار کرے۔ پھر مجھ سے بات کرے یا ملے۔“

”میک کیسٹ مشرضیاء!“

”ڈونٹ وری..... تمہیں کل پھر فون کروں گا۔ جانے سے پہلے.....“

”میں انتظار کروں گا مشرضیاء.....“

”میں نے فون بند کر دیا۔ میں جینو سے بات کر کے بہت افسرہ ہو گیا تھا۔ وہ اب یقیناً پچھے نہیں رہا ہو گا مگر مجھے یوں لگ رہا تھا یہی کہ وہ بھی پچھے ہے حالانکہ جو کمائی میں سن چکا تھا اس کے حساب سے اسے مجھ سے عمر میں پندرہ بیس بڑا ہونا چاہئے مگر وہ مخصوص تھا اس کا اندازہ مجھے اس سے بات کر کے ہی ہو گیا تھا۔“

”کیا چکر ہے یار؟“

”طیب جو صوفے پر آنکھیں موندے لیتا تھا اور ہنسے میں سمجھ رہا تھا کہ سوچ کا ہے، بول اٹھا۔ میں نے تفصیل سے اسے سب کچھ بتا دیا۔“

”کیا پتا، وہ اسی عمارت میں قید ہو جاتا سورن سگھے مکڑی کے جالے میں لپٹا رہتا ہے۔ اسے بھی تو اسی نے قید کر رکھا ہے۔“

”ہاں! یہ بھی ممکن ہے۔“ میں تو اب تک رابرٹ والی عمارت بھی پوری نہیں دیکھ سکا حالانکہ جب بھی گیا، یہ ارادہ کر کے گیا کہ اس پوری عمارت کو ایک نظر ضرور دیکھوں گا مگر بیش یہ بات وہاں جا کر بھول گیا۔ تم یاد رکھنا۔ ہمیں سورن سگھے والی اور رابرٹ والی دونوں عمارتوں کا اچھی طرح جائزہ لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے تھماری بات ہی ٹھیک ہو۔ یہ بھی

”کیا تم خود کسی کو فون نہیں کر سکتے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں.....! یہاں ڈائل والا فون نہیں ہے۔ میں صرف آنے والے فون سن سکتا ہوں۔ مجھے یہ بھی اس کی مہیاں لگتی ہے کہ اس نے اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ میں بھی کبھی تم لوگوں سے بات کر سکتا ہوں۔“

”کیا تم اندازہ کر سکے ہو کہ وہ تم سے کیا چاہتی ہے؟“

”نہیں.....! وہ بھی یہ نہیں بتا۔ میں نے کما تھا کہ مجھے مار دو۔ اگر میں قصور دار ہوں تو ایک ہی بار میری جان لے لو گرا یہی میں وہ بے حد ہمدردی سے کہتی ہے کہ اسے میری اذیت پر ترس آتا ہے۔ وہ میری تکلیفوں کو کم کرنا چاہتی ہے۔ وہ مجھے یقین دلانے لگتی ہے کہ میں قطعی بے قصور ہوں، اصل مجرم تو رابرٹ، سورن، پر کاش اور عطا ہیں اور جب میں روتا ہوں، کہتا ہوں کہ مجھے آزاد کر دو تو قسمتے لگاتی ہے۔ کہتی ہے، میں جس کی تلاش میں ہوں۔ اگر وہ مجھے نہیں ملا تو میں کسی کو بھی نہیں بخشوں گی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس کی بات کرتی ہے؟“

”کیا وہ زنجیروں کے سلسلے میں کوئی بات کرتی ہے؟“

”نہیں! وہ کسی ایسے شخص کا ذکر کرتی ہے جسے وہ چاہتی ہو اور جو اس کی دسترس سے باہر ہو۔ میں نے پوچھا بھی تھا کہ وہ کون ہے جس کے نامے کا بدلہ وہ مجھے قید کر کے لے رہی ہے مگر وہ جواب نہیں دیتی۔ بہتی ہے پھر اچانک مجھے تسلیاں دینے لگتی ہے پھر روہانی ہو کر بتانے لگتی ہے کہ وہ ایک مشکل میں گرفتار ہو چکی ہے۔ وہ بچپن ہی سے ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جس کا حصول اس کے لئے مشکل ہے۔ اس نے یہ وعدہ بھی کیا ہے کہ اگر وہ شخص اسے مل گیا تو وہ مجھے ہی نہیں، رابرٹ، پر کاش، سورن اور پیاس کو بھی معاف کر دے گی۔“

”پیاس کماں ہے؟“ میں چونک اٹھا۔ پیاس کا تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

”پتا نہیں، مگر وہ کہتی ہے وہ تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

”سنو جینو! اب جب وہ تمہیں ملے گی تو اسے میرا پیغام دے دیتا۔ اسے کہنا کہ ضیاء تمہاری مشکل حل کر سکتا ہے، وہ مجھے سے براہ راست ملے۔ کسی ڈرامے بازی کے بغیر، دو بد و پیٹھ کربات کرے۔“

”نہیں ضیاء.....“ وہ ایک دم خوفزدہ آواز میں چیخ اٹھا۔ ”ایسا نہیں کرنا۔ وہ

دھائی نہ دیا کہ کون ہے لیکن اتنا اندازہ ہوا کہ وہ کوئی آدمی ہے۔ فربہ اور لمبا۔ کال بیل کی آواز طیب نے بھی سن لی تھی۔ اس نے باٹھ روم کا دروازہ کھول کر جھانکا۔  
”کون ہے ضیاء؟“

”یہ نہیں..... کوئی آدمی ہے۔“

”ایک منٹ..... صبر کرو میں آتا ہوں۔“

پھر غالباً طیب نے جلدی جلدی کپڑے بدلتے اور باہر آگیا۔ ”کون ہو سکتا ہے؟“ میں بڑیا۔ طیب کھڑکی کے قریب آگیا۔ وہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے اپنی حیرت انگیز بینائی کا خیال کیا اور غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اس نے کال بیل پھر بجائی۔

”طیب! یہ موٹا سا کافی لمبا آدمی ہے۔ اس کا رنگ سانو لا ہے، خچلا ہونٹ موٹا اور اوپر کا پلا ہے۔ یہ ہونٹ سیاہی مائل ہیں۔ اس کی آنکھیں موٹی موٹی ہیں۔ بال سامنے سے اڑے ہوئے ہیں۔ ایک کان آگے کی طرف جھکا ہوا ہے۔ دیاں کان۔ ناک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ سگار پی رہا ہے۔“ میں نے اتنا بتا کر طیب کی طرف دیکھا۔ طیب پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”تت..... تم..... ضیاء تم..... کیا ہو؟“

”چھوڑو یہ بات، پسلے بتاؤ کہ اس حلٹے کے آدمی کو جانتے ہو؟“

”ہاں..... یہ وہی ہے اپنا کا انکل۔ وہی جو محض شراب کی خاطر ایسا کے پاس آیا کرتا تھا۔ میں جا کر اسے ملاتا ہوں۔“

طیب اب تکستے نکل گیا۔ میں کھڑا رہا۔ کھڑکی سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ چند لمحوں بعد طیب بھی مجھے نظر آگیا جواب گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ طیب کو غالباً وہ دیکھ چکا تھا اس لئے کہ میں نے اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی دیکھ لی تھی پھر طیب گیٹ پر پہنچ گیا۔ اس نے گیٹ کھولا۔ آنے والے سے مصافی کیا اور غالباً اسے بتانے لگا کہ ایسا چل گئی ہے۔ میں وہیں کھڑکی میں کھڑا دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہ سن کر چلا جائے گا مگر شاید وہ شراب کے نشے میں دمٹ تھا۔ میں نے اس کے زور زور سے بولنے کی آواز سنی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے مگر تیز آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی پھر پتا نہیں طیب نے کیا کہا۔ میں نے دیکھا کہ طیب نے اسے باہر ہی چھوڑ کر گیٹ بند کر دیا ہے۔ وہ اب بھی بول رہا تھا۔ طیب واپس چلا آیا۔ اس شخص نے سراخا کر مجھے دیکھا۔

ممکن ہے کہ وہ رابرٹ والی عمارت میں کیس قید ہو۔ میں نے ایک بار وہاں اوپر کی منزل پر کسی عورت کا سایہ بھی دیکھا تھا۔

”دبیل کا کیا پروگرام ہے؟“ طیب نے انگرائی لیتے ہوئے پوچھا۔

”کل سوچوں گا“ میرا خیال ہے کہ پرسوں سویرے نکل جاؤں۔“

”نکل جاؤں نہیں، نکل جائیں۔“ طیب نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟“ میں ہنسا۔

”تم مذاق سمجھ رہے ہو؟“ اس نے مجھے گھورا۔ ”چلو کمرے میں مجھے نیند آری ہے۔“

”ہاں.....! مجھے یقین ہے کہ کل تم اپنا ارادہ تبدیل کر دو گے۔“ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”خام خیالی ہے تمہاری۔ میں فیصلہ کرنے میں وقت ضرور لیتا ہوں۔ کسی معاملے کو کافی دن تک سنجیدگی سے بھی نہیں لیتا۔ یہ میری خامیاں ہیں لیکن میں فیصلہ کر لیتا ہوں تو پھر سوچنے کی گنجائش نہیں رکھتا۔“

وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر بڑی گھبیرتا، بڑی سنجیدگی اور لمحے میں بڑی پچھلی محسوس کی۔

”یہ آخری والی بات تمہاری خوبی ہے۔“ میں اس کے پیچھے اوپر جانے لگا۔ ”شکریہ۔ مجھے کل آفس جا کر چھٹی لینی ہو گی اور بس۔ تم کل سوچ لو۔ کیس جانا تو نہیں ہے نا۔“

”نہیں فی الحال تو کوئی پروگرام نہیں ہے۔“

”اگر تم سوئے ہوئے ہو گے تو میں نکل جاؤں گا۔ آفس ہو کر میں واپس آؤں گا، تم گھبرا نہیں۔“

اس نے یوں تسلی دی جیسے کسی چھوٹے سے بچے کو اکیلے میں نہ ڈرنے کا حوصلہ دے رہا ہو۔ میں نے آگے بڑھ کر اپنے کمرے کا دروازہ کھولا۔ طیب کپڑے بدلتے کے لئے باٹھ روم چلا گیا۔ میں جوتے اتار رہا تھا کہ اچانک نیچے کال بیل بھی۔ یہ کال بیل باہر والے گیٹ کی بجائی گئی تھی۔ میں سخت جیلان اور پریشان ہو گیا۔ میں نے باہر والی کھڑکی کھول کر دیکھا۔ گیٹ کے باہر ایک ہیولا سا کھڑا تھا۔ روشنی کم تھی اس لئے یہاں سے

یقیناً میں کمرے کی روشنی کی وجہ سے اسے کھڑکی میں کھڑا نظر آ رہا تھا۔ طیب میرے قریب پہنچا تو میں نے جھک کر پوچھا۔

”کیا بات ہے؟ یہ کیا کہ رہا ہے؟“

”پاگل ہے۔ کھتا ہے،“ ایسا نے اسے فون کر کے بلوایا ہے۔ وہ واڈا کی نئی بوتلیں لئے اس کی منتظر ہے اور وہ رات یہیں، اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہے۔ کھتا ہے کہ ہم اکثر ماضی کی باتیں کر کے دل بہلایا کرتے تھے، بالخصوص آج کے دن کیوں کہ آج ایسا کے شوہر کی برسی کا دن ہے۔“

طیب نے سراٹھا کر مجھے بیایا۔ میں نے دیکھا، وہ اب بھی کھڑا تھا اور میری اور طیب کی گفتگو سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً وہ مجھے ایسا سمجھ رہا ہو گا کیوں کہ یہاں سے گیٹ تک کافی فاصلہ تھا، اسے میں صرف ہیولے کی شکل میں نظر آ رہا ہوں گا۔ اب میری آواز سن کر اس کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی ہوگی۔ کیوں کہ جب طیب باہر آنے لگا اور میری نگاہ سے او جھل ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ پلٹ گیا مگر وہ اب بھی پلٹ کر زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ میں وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں طیب بھی میرے قریب آگیا۔

”سالا ببری طرح دھت ہے۔“ وہ بڑا دیا۔

”تم نے اسے کیا کہا؟“ میں نے بیچ سڑک پر ڈولتے ہوئے اس کے سامنے پر نگاہ جمائے جائے پوچھا۔

”میں نے کہہ دیا کہ ایسا اپنی بیٹی کو لے کر گواہی گئی ہے۔ مگر وہ کھتا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو اور یہ وہ کام ہے جو تم کرنا نہیں جانتے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایسا سب کچھ کر سکتی ہے مگر آج کا دن فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ صرف سال میں ایک بار ہی شراب کی بوتلوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔ پکن کی میز پر میرے اور اپنے شوہر کے لئے گلاس سجائی ہے پھر اس کے گلاس میں شراب بھرتی ہے۔ میرے گلاس کو بھرتی ہے پھر وہ اپنے شوہر کی طرف سے میرے گلاس سے اس کا گلاس نکراتی ہے۔ ایک گھنٹے تک روٹی ہے پھر آنسو پوچھ کر ماضی کے اوراق پڑتی ہے۔ میں جب تھک جاتا ہوں تو وہ لان میں بیٹھ کر ساری رات بتاتی ہے اور میں صوف پر لیٹ کر تھامن کو یاد کرتا رہتا ہوں۔ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ اٹھ جاتی ہے پھر میں ایک برس تک اس محفل کا انتظار کرتا ہوں۔ درمیان میں جب بھی آتا ہوں، وہ بوتلیں میرے حوالے کر دیتی ہے، خود انہیں

ہاتھ بھی نہیں لگاتی اور پتا نہیں کیا کیا کوواس کر رہا تھا۔“  
طیب اکتا کر پلٹ گیا۔ میں نے سڑک پر دیکھا۔ اب وہ موڑ پر پنج پکا تھا پھر میرے دیکھتے ہی رکھتے وہ نگاہوں سے او جھل ہو گیا۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔

”نہیں یار!.....“ طیب نے ملتے ہوئے کہا۔ ”اسے کھلا رہنے دو۔ مجھے گھسنے محسوس ہو رہی ہے۔“

”طیب! یہ ہمارے لئے مسئلہ تو نہیں بن جائے گا؟“

”نہیں! نہیں!..... جگلی آدمی ہے۔ دھت ہے۔ کہیں سڑک پر ہی پڑ کر سو جائے گا۔ ہمارے لئے مسئلہ کیسے بن سکتا ہے۔“ طیب کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

”تم سو جاؤ۔“ میں نے کاما اور لائٹ بچا دی۔ یوں بھی میں جیسو کے بارے میں سوچتا چاہتا تھا۔ اگر بہت دیر نہ ہو گئی ہوتی تو میں رابرٹ کو بھی فون کرتا مگر میں نے اس لئے فون نہیں کیا کہ وہ بھی بہت باقونی تھا۔ بے چارہ کم گو بھی ہوتا تو بات کرنے کو ترستا تھا۔ میں فون کرتا تو جان چھڑانا مشکل ہو جاتی۔ مجھے نیند تو نہیں تھی کہ صبح سے شام تک سویا تھا مگر سستی اور کسل مندی محسوس ہو رہی تھی۔ طیب بہت جلد سو گیا۔ اس نے ”خراٹے لینے شروع کر دیئے۔ میں جو سونے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے خراٹوں سے عاجز آ کر کرے سے باہر نکل آیا۔ یہاں کتابوں کی الماری کوئی بھی نہیں تھی البتہ ہر جگہ شراب کی بوتلیں بھی ہوئی تھیں۔ ان سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں ڈرائیکٹ روم میں آ کر صوفے پر لیٹ گیا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے پونے دونوں چکے تھے۔ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔

پھر شاید مجھے نیند آگئی۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے شاید جھنکا گا تھا۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔ اٹھ گیا تو اور پر چلا گیا اور طیب کے برابر میں لیٹ گیا۔ نیند نے جلد ہی مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ مجھے نہیں پتا کہ میں کتنی دیر سویا تھا۔ اٹھا تو میرا سر جھੱختا رہا تھا۔ یوں جیسے کسی تیز آواز کی وجہ سے میری آنکھ کھلی ہے۔ کچھ دیر تو میری کچھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ میں نے طیب کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سویا ہوا تھا۔ اچانک میں نے کسی کی آواز سنی۔ آواز بہت قریب سے آئی تھی۔ میں چونکہ اٹھل پسلے کرے کا جائزہ لیا پھر میں نے کمرے کی وہ کھڑکی کھوئی جو اندر ڈرائیکٹ روم میں کھلتی تھی، پیچے جھانکا کے لائٹ بدل رہی تھی۔ شاید میں نیند کے غلبے کی وجہ سے لائٹ جبلی چھوڑ

”ہو سکتا ہے ایسا نے اختیاطاً اسے چالی دے رکھی ہو۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں وہ چالی اس سے لیتا ہو گی طیب۔“ میں نے پھر باہر جھانکا۔ اب وہ گلاس اٹھا کر ہونوں سے لگا رہا تھا۔

”ہاں..... یہ تو گزبرد والی بات ہے۔ اس سے چالی.....“ ابھی طیب کا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ ہم دونوں چونک اٹھے۔ وہ بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا۔ ”ایسیا! تمہیں ان دونوں سے کہہ دینا چاہئے کہ وہ کل اسی دن میں اس کوٹھی کو خالی کر دیں۔ مجھے وہ آدمی بہت بد تیز اور بد تنذیب لگا تھا جس نے گیٹ پر آکر جھوٹ بولا تھا کہ تم اپنا کو لے کر جا پچکی ہو۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ ایسا بس کچھ کر سکتی ہے مگر آج کی رات بھی فراموش نہیں کر سکتی۔ چیز۔“

اس نے اپنا گلاس ہوا میں یوں لہرایا جیسے کسی گلاس سے ٹکرا رہا ہو اور حریت انگیز بات یہ تھی کہ میں نے گلاسوں کے ٹکرانے کی آواز بھی سنی تھی حالانکہ سامنے والا گلاس اب بھی نہیں پر جوں کا توں رکھا تھا۔ میں نے طیب کی طرف چونک کر دیکھا۔ لگ رہا تھا کہ آواز اسے بھی غالی دی ہے۔ اس کا رنگ فت ہو رہا تھا۔ آنکھیں خوف اور دہشت سے پھیل گئی تھیں۔

”آؤ۔“ میں نے تیزی سے کما اور دروازے کی پلکا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے لپک کر مجھے پکڑ لیا۔

”اس بڈھے سے پوچھنے کے یہ اندر کیسے آیا اور یہاں کیا کر رہا ہے۔“ میں نے اس سے اپنا بازو چھڑوادتے ہوئے جواب دیا۔

”باو لے ہو گئے ہو کیا؟“ وہ جھلا گیا۔

”اس میں باو لے پن کی کون سی بات ہے۔“

”یہاں جو کچھ اب تک ہو چکا ہے، اس میں یہ واقعہ کوئی اچھبے کی بات نہیں ہے۔“ تم نے سنا نہیں کہ اس کے گلاس سے کوئی ان دیکھا گلاس ٹکرایا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا واقعی اس رات کو فراموش نہیں کر سکتی ہو۔ اس کی روح یہ غم منانے کے لئے باہر آئی ہو۔ اسی نے بڈھے کو اندر بلا لیا ہو گا۔“

میں دوسرے ہی لمحے پر سکون ہو گیا۔ اس وقت طیب مجھ سے زیادہ پر دیا و نظر آ رہا تھا۔ واقعی یہاں جو بھی ہوتا، کم تھا۔ ”لیکن ہمیں جا کر دیکھنا اور پوچھنا تو چاہئے۔“ میں نے

کر اور پر آگیا تھا۔ میں نے کان لگائے، وہاں سنا تھا پھر مجھے خیال آیا کہ شاید آواز باہر لان کی طرف سے آئی ہے۔ میں نے بہت آہستی سے باہر والی کھڑکی کھوی۔ میرے کمرے میں ناش بلب روشن تھا۔ جسے میں نے کھڑکی کھولنے سے پسلے ہی بجا دیا تھا۔ میں نے آہستہ سے باہر جھانکا اور لان میں نگاہ پڑتے ہی اچھل پڑا۔ وہاں دو کریساں اور میز رکھی تھی۔ یہ دہ میز کریساں تھیں جو یکجہ میں رکھی ہوئی دیکھی تھیں۔ ایک کرسی پر وہی موٹا کر بھیں بر جھان کھا۔ اس کے سامنے رکھی میز پر واڈا کا کی بوتل اور گلاس رکھا تھا جب کہ دوسرا گلاس اس کے سامنے والی کرسی کے سامنے رکھا تھا مگر وہ کرسی خالی تھی۔ میں نے گھبرا کر طیب کو جھنجورا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ ”کیا ہوا یار؟“

”ہش.....!“ میں نے اشارہ سے اسے چپ کرایا۔ مجھے دیکھے ہی اور اشارہ سمجھتے ہی طیب الرث ہو گیا۔ ”کیا ہے؟“ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

”باہر والی بڑھا بیٹھا شراب نوشی کر رہا ہے۔“ میں نے بھی دیکھی آواز میں جواب دیا۔

”کیا؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس نے خود کلامی کے سے انداز میں گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”میں نے دیکھا، گھڑی کی سویاں چار بج کر گیا رہ منٹ کا اعلان کر رہی تھیں۔“

”آؤ..... دیکھتے ہیں۔ یہ اندر آیا کیسے..... یہ ہے کہاں؟“ طیب نے کھڑکی میں سے جھنکا۔ ”ارے..... یہ یہاں۔“

”سنو! پسلے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ میں اس کی آواز بن کر اٹھا ہوں۔“ میں نے کھڑکی کے پٹ کی اوٹ میں ہوتے ہوئے کہا۔ طیب دوسری طرف کھڑا ہو گیا۔ پھر حریت سے بولا۔

”یار ضیاء! یہ کریساں اور نہیں کہاں سے آگئیں۔“

”یہ کچن میں رکھی تھیں۔“ میرے جواب نے اسے چونکا دیا۔

”کچن میں..... مگر..... کیا یہ اندر بھی آیا تھا مگر کیسے؟ گیٹ میں نے بند کیا تھا۔ پھر یہ دروازہ بھی لاک کر کے آیا تھا۔ وہ اندر کیسے آیا؟ کیا اس کے پاس ایک شراچالی ہے۔“

مگر یہ..... تھامن کے لئے انوار تو ہے کہ میں بھی رونے لگتا ہوں۔“

”بات سنو! بوڑھے عاشق..... تم اندر کیسے آئے؟“ اس بار طیب نے اس کی ہاں سے ناک ملا کر پوچھا۔

اس نے زور دار قسمہ لگایا۔ ”ارے تم مذاق سمجھ رہے ہو!! مجھے ایسا نے بلوا یا ہے۔ ہم اتنے برسوں سے یہ رات یہاں ایک ساتھ گزارتے ہیں۔ آج رات میں اپنے آپ کو جوان محوس کرتا ہوں مگر یہ بڑھا۔..... مجھے میرے بڑھا پے کا مکمل احساس دلا کر مجھے نڈھال کر دیتی ہے لیکن ایک بات ہے، ‘سرور، غم اور خوشی کی اس درمیانی کیفیت میں بھی بہت ہے۔“

”سرور کے پیچے!“ طیب نے اسے گرباں سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا گلاس تھا جو چلک گیا اور وہ جنم اٹھا۔

”اے.....! تم میری جان لے سکتے ہو گراس کا ایک قطرہ بھی اگر ضائع ہو گیا تو اشیاں نکال دوں گا۔“ اس نے آنکھیں نکالیں۔

”کیا کر رہے ہو طیب؟“ میں نے اس کا گرباں چھڑایا پھر اس کو کرسی پر بھا دیا۔ ”آپ بیٹھیں!“

”تھیک یو.....! تم تندیب یافتے لگتے ہو۔“ اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا پھر منہ بنا کر طیب کی طرف دیکھا اور چونک کر بولا۔ ”تم..... تم وہی ہو نا جس نے گیٹ سے مجھے بھاگ دیا تھا۔ یہ جھوٹ بول کر کہ ایسا چل گئی ہے۔ مجھے ہر بارے شخص سے مل کر دکھ ہوتا ہے۔ غصہ نہیں آتا مگر تم میں اخلاق کی کمی بہت زیادہ ہے۔ تمیں مہماںوں سے بات کرنے کی تیز نہیں ہے۔ تم نے صرف مجھ سے جھوٹ بولا بلکہ مجھ سے بد اخلاقی سے بھی پیش آئے ہو۔ مجھے تمہاری موجودگی پسند نہیں ہے۔ مجھے تم پر غصہ بھی آ رہا ہے۔“

”وہ جھوٹ نہیں تھا مشر عاشق! حق تھا۔ ایسا ایسا کو لے کر تین روز پسلے ہی گواجا چکلی ہے اور کہہ گئی ہے کہ وہ اب بھی یہاں واپس نہیں آئے گی۔ اب اپنے شوہر کی موت کا دن وہ گواہیں منیا کرے گی۔“ طیب نے دانت کچکچا کر جواب دیا۔

”بد تندیب بیٹے! تمیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ میں بد دل ہو کر گھر چلا گیا تھا اور وہیں غم منانے کا اہتمام کر رہا تھا کہ ایسا کافون آگیا۔ اس نے شکوہ کیا کہ میں اب تک یہاں کیوں نہیں پہنچا۔ میں نے اسے تمہاری کارستائی کے بارے میں بتایا تو وہ پڑھ رانے لگی

زم انداز میں جواب دیا۔

”یہ اور بات ہے کہ ہمیں جانا چاہئے مگر جس انداز میں تم جا رہے ہے تھے ویسے نہیں۔“ طیب نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

ہم آگے پیچھے چلتے ہوئے میرھیوں تک پہنچ۔ ہمیں اوپر ہی سے کچن کی روشنی نظر آگئی۔ میں آگے بڑھ گیا۔ میں نے نیچے پیچتے ہی کچن میں نگاہ دوڑائی۔ کرسی میز واقعی عاشر تھی۔ ڈرائیگ روم کا پیرونسی دروازہ پورا کھلا ہوا تھا اور وہ بوڑھا ہمیں یہاں سے بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ اب وہ لٹک لٹک کر کوئی گاتا گارہ تھا جس میں ماضی کی رنگیں را توں اور لبے لبے سفر پر نکلنے کی تیاریوں کا ذکر تھا جو نہیں یہے جوڑے ہی مون کے نام پر اختیار کرتے ہیں۔ اس میں محبوب کے انتظار میں بار بار دروازے پر جاتی اور بے قراری سے مشتعل ہوئی لڑکی کا بھی ذکر تھا اور اچانک آکر دبوچ لینے والی موت کا بھی۔ جو آدمی کو جھپٹا مار کر دبوچ لیتی ہے اور وہ اپنے محبوب کو خدا حافظ بھی نہیں کر پاتا۔

”اے مسٹر!“ میں دروازے سے باہر نکلتے ہیں تکارا۔ میں نے لان والا بلب بھی جلا دیا تھا۔ میری آواز اور ساتھ ہی ہونے والی روشنی نے اسے چونکا دیا۔ وہ لہرایا، پلتا اور پھر مجھے دیکھ کر جھومنے لگا۔

”آؤ مسٹر..... تم بھی آؤ۔ آؤ! آج ہم اداس ہیں۔ میں جب اداس ہوتا ہوں تو شراب میری اداس کو ختم کر دیتی ہے مگر یہ..... ایسا..... یہ مجھے پھر اداس کر دیتی ہے۔ میں ایک اور جام پیتا ہوں، جیسے ہی خوش ہوتا ہوں..... یہ پھر شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر جام بھر..... پی۔“

اتنی دیر میں ہم اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ”تم کون ہو؟“ میں نے اس کے بالکل سامنے جا کر پوچھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر لڑکھا کر پھر بعد سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”میں..... تھامن کا دوست ہوں مگر مشریں میں شراب کی بے حرمتی سمجھتا ہوں اگر یہ پی کر آدمی سچ چھپانے لگے۔ میں اس کا دوست ضرور ہوں مگر میں ایسا کو بھی پسند کرتا ہوں۔ یہ بات میں نے ہیشہ ایسا سے چھپائی مگر تھامن کی موت کے بعد پہلی برسی مناتے ہوئے میں نے صاف گوئی نے اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس نے برا نہیں مانا۔ اب ہم دونوں اس کا سوگ مل کر مناتے ہیں۔ میں خوش ہو کر اس سے اطمینان جمعت کرنا چاہتا ہوں

گالو نبلہ ۵۹

سونے جا بچی ہوگی۔ آپ بھی اب گھر پلے جائیں۔ اب صبح ہونے والی ہے۔“  
”نہیں.....! اس نے مجھے تاکید کی ہے کہ میں یہیں رہوں۔ کمیں بھی نہ  
جاوں۔“ اس نے جھوٹتے ہوئے کہا۔

”ابے اٹھتا ہے یا دوں ایک جھانپڑ۔“

طیب پھر دانت سچکا کر اس کی طرف پکا گریں نے اسے درمیان میں ہی کپڑا لیا۔  
اسے گھورا۔ اس نے بڑی دستے ہوئے اپنارخ دوسری طرف کر لیا۔

”طیب، پلیز! تم مجھے پریشان کرنے والی حرکتیں کرو ہے ہو۔ یہ اپنے آپ میں نہیں  
ہے۔“

”میں گاؤں نکالتا ہوں۔ اس حرامزادے کو کمیں چھینک کر آنا پڑے گا۔“ طیب بھی  
باولا ہو رہا تھا۔

”صرکرو۔“ میں جیخ اٹھا۔ وہ سر جھکتا ہوا کچھ دور چلا گیا۔ میں نے دیکھا، ڈگل  
اب کری پر سنبھل نہیں رہا تھا۔ سامنے رکھی اتنی بڑی بوتل اب خالی ہو چکی تھی۔ اس  
نے پیچی ہوئی شراب بھی گلاس میں انڈیلی لی تھی۔ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا اگر  
وہ گلاس کو اس مضبوطی سے پکڑے تھا جیسے اس کی جان اس چھکلتی شراب میں ہو۔

”اٹھو مشرڈ گلس!“ میں نے بغل میں ہاتھ ڈال کر اسے کھڑا کر دیا۔ اس نے  
کھڑے ہوتے ہوئے بھی وہ گلاس منہ سے لگا کر خالی کر دیا۔

”ایا کر رہے ہو تم..... مشرڈ؟“

”تمہیں آرام دہ بستر لٹاؤں گا۔“ میں نے جواب دیا۔

”یار ضیاء! یہ کیا کر رہے ہو تم..... اسے فری نہ کرو ورنہ یہ زندگی بھر نہیں  
جائے گا اور اگر چلا بھی گیا تو ہر دیک اینڈ پر تمہارے سامنے ہو گا۔“ طیب کو وہ بڑھا زہر  
لگ رہا تھا۔

”اسے یہاں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”میں اب تمہاری عمر کے کسی بھی آدمی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ“  
سب بھی جھوٹے ہوں۔“ شراب نے اس کا بر احال کر دیا تھا۔ اب وہ بیٹھے بھی نہیں پارا  
ہو سکتے۔“ میں نے پر پنچ کریں سیدھا ہو گیا۔ ”مشرڈ اسے ڈالنے کا انتگر روم میں آیا۔ اسے  
تھا۔“ میں نے اسے جھوڑا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

کہ اسے کبھی تم پسند نہیں آئے اور تمہاری ساری حرکتیں ایسی ہی ہیں پھر اسی نے مجھے  
فوراً پوچھنے کی ہدایت کی۔ میں پوچھا۔ وہ گیٹ کھولے، لان میں میز کری لگائے، گلاس اور  
بوتل سجائے، میری خفتر تھی۔ سمجھے تم، جھوٹے لڑکے؟“

طیب نے یہ سن کر تمہوک نگلا۔ میں خود بھی دم بخود کھڑا تھا۔ اس کا کامہا ہوا حرف بہ  
حرف سچ لگ رہا تھا۔ وہ گھر میں کیسے آسکتا تھا اور اگر اس کے پاس چالی تھی بھی تو وہ یہ  
دیکھ کر کہ میں اور طیب یہاں موجود ہیں، اتنی جرات کیسے کر سکتا تھا۔ پھر میں نے اس سے  
پوچھا۔ ”اور ایسا نے کچھ نہیں کہا۔“

”کیا مطلب؟ اب تم ہماری باتیں بھی پوچھو گے؟“

”نہیں..... وہ ہے کمال؟“

”ابھی ابھی اس طرف گئی ہے۔“ اس نے کوئی کے اس حصے کی طرف اشارہ کیا  
جہاں ہم نے کل رات اسے دفاتریا تھا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لبردوڑ گئی۔  
”ہمک..... کیوں؟“ میری بجائے طیب بول اٹھا۔

”مسٹر.....!!“ میں نے جلدی سے اسے مخاطب کیا۔

”ڈگل..... تم ڈگل کہہ سکتے ہو۔ میں اجنیبوں کو یہی نام بتاتا ہوں۔“ اس  
نے نہایت صاف گوئی سے بتا دیا کہ وہ اپنا نام ہمیں بتانا نہیں چاہتا۔

”مسٹر ڈگل! کیا یہ تذیب میں شامل ہے کہ آپ اتنی رات گئے کسی کے گھر میں  
اکر اتنا شور شرایا کریں۔“

”کسی کا گھر! تمہارا مطلب کیا ہے اس سے؟“ اس نے یہاں سامنہ بنایا اور ایک طویل  
گھونٹ لے کر گلاس میز پر رکھ دیا۔

”یہ ایسا کا گھر نہیں ہے۔ ہمارا ہے۔ وہ یہاں ملازم تھی اور اب جا چکی ہے۔ اگر  
تم سے کسی نے مذاق کیا ہے تو وہ ضرور کوئی چیزیں ہو گی جس نے تم کو پسند کر لیا ہو گا۔“  
طیب نے جمل کر کہا۔

”میں اب تمہاری عمر کے کسی بھی آدمی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ“  
”شраб نے اس کا بر احال کر دیا تھا۔ اب وہ بیٹھے بھی نہیں پارا  
ہو سکتے۔“ میں نے پر پنچ کریں سیدھا ہو گیا۔ ”مشرڈ اسے ڈالنے کا انتگر روم میں آیا۔ اسے  
تھا۔“ میں نے اسے جھوڑا۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔

طیب ڈرائیک روم کا دروازہ بند کر کے اور جا رہا تھا۔ ڈلکس بے سدھ پر گیا تو میں

بھی اور پر چا آیا۔ طیب بیٹہ پر شم دراز سگریٹ پی رہا تھا۔

”طیب! کیا واقعی اسے ایسا نے فون کر کے بلا یا ہو گا؟“ میں نے سگریٹ کیس میں

سے ایک سگریٹ منتخب کرتے ہوئے پوچھا۔

”ایسا کا تعلق زیوسا کے خاندان سے نہیں تھا ضایع! نہ وہ کوئی مادرانی مخلوق تھی۔

وہ مر چکی ہے۔ اسے تو اس وقت تھامن کے ساتھ وقت گزارنا چاہئے نہ کہ اس بڑھے

کے ساتھ۔ میرا خیال ہے کہ اس نے گھر میں بھی اچھا خاصا غم منالیا تھا، وہ بہک کر یہاں

چلا آیا۔ اسے تھامن کا غم نہیں، ایسا سے اظہار محبت کا حوصلہ یہاں لایا ہو گا۔ بڑھا

بدر کروار!“

”ایسا اور زیوسا..... کتنے ملے جلتے تھا ہیں۔“ میں نے چونک کر کمل۔ طیب!

کوئی اڑ نہیں ہوا۔ ”مگر اس کے لجے میں بچ زیادہ تھا۔ میں نے سنا ہے کہ شراب پی کر

لوگ جھوٹ نہیں بولتے۔“

”اگر خصلت کے کینے نہ ہوں تو۔“ طیب نے سگریٹ کا آخری کش لے لے

سگریٹ کو محلی ہوئی کھڑکی سے باہر اچھالتے ہوئے جواب دیا۔ پھر چونک کر مجھے دیکھا۔“

تم مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟“ اس کے انداز میں تمثیر تھا۔

”نہیں..... میں تو اپنا خیال ظاہر کر رہا ہوں۔“

”مطلوب بآواز بلند سوچ رہے ہو۔“

”ہا۔“

”سو جاؤ یار..... حرام خور نے نیند بر باد کر دی۔ نائم کیا ہوا ہے۔“ طیب۔

لیٹتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی صبح ہونے میں دیر ہے اور تمہیں کون سا کہیں جانا ہے۔“ میں بھی لیٹت گے

”جانا ہے۔ آفس جاؤں گے۔ چھٹی لوں گا۔“

”جب اٹھو گے، چلے جائے۔ چھٹی ہی تو لینی ہے۔ اس میں وقت کی پابندی کرنے

کیا ضرورت ہے؟“ میں نے کروٹ لے لی۔ مجھے یقین تھا کہ اب نیند نہیں آئے گی

جانے کب میں سو گیا۔

کسی نے مجھے جنبھوڑا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو طیب دھشت زدہ چہرہ لئے میرے

بھکا ہوا تھا۔

”ضایع..... نیچے..... نیچے دیکھو۔“

”اک..... کیا بات ہے۔“ میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

”نیچے۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں چھلانگ لگا کر کھڑکی کی طرف بھاگا۔ نیچے

بھاگنا تو میرے روئے کھڑے ہو گئے۔ کافوں میں سیٹیاں سی بننے لگیں۔

دن کا اجالا بھیل چکا تھا۔ ڈرائیک روم میں کافی روشنی تھی اور میرے سامنے

ڈلکس بہت سے نکڑوں کی شکل میں خون میں لٹھرا چڑا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ چھری

پڑی تھی جسے دیکھ کر میرے بدن میں سُسُنی دوڑا کرتی تھی۔

”آؤ!“ میں سیڑھوں کی طرف بھاگا۔

”ضایع..... پاگل ہوئے ہو۔“ طیب بچنا اور اس نے نیچے سے میری شرٹ پکڑا

کر مجھے روک لیا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔ رنگ سفید ہو رہا تھا۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ میں حواس کھو بیٹھا تھا۔ ”کس نے مارا ہے اسے؟“

”ضایع.....! کیا تم نے دیکھا نہیں۔“

طیب کی آواز سن کر میں ایک دم چونک اٹھا۔ میں نے پسلے خود پر قابو پا لیا۔

”ہا۔.....! ڈلکس.....“

”نہیں! اس کے قریب..... دامیں طرف..... کیا تم نے نہیں دیکھا؟“

اور میں اس کی بات سمجھ کر پھر کھڑکی تک پہنچ گیا۔ اب میں نے نیچے بھاگنا تو دم

بخود رہ گیا۔ پھر طیب کے پیچھے کے باوجود اسے دھکا دے کر نیچے بھاگا۔ میں اسے بھاگنے

نہیں دینا چاہتا تھا۔ طیب میرے پیچھے چلا آتا ہوا آرہا تھا۔ ابھی میں نے آخری سیڑھی کو عبور

بھی نہ کیا تھا کہ کال بیل نج اٹھی۔

میں نے دروازے پر باہر جانے کی بجائے صوفی کے پیچھے چھلانگ لگائی مگر میرے

وہاں پیچھے سے پسلے ہی وہ عجیب و غریب انسان کہیں غائب ہو چکا تھا۔ ہا۔.....! وہ

انسان ہی تھا مگر تڑا مڑا۔ یوں جیسے انسان تھے ہو۔ بھیڑا ہو۔ خونخوار بھیڑا۔ جب میں نے

طیب کے کہنے پر کھڑکی سے اندر بھاگنا تو اسے ایک کونے میں دکا دیکھ کر میرے روئے

کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں گوشت کا ایک کلڑا تھا اور مذہ خون میں

لٹھرا ہوا تھا۔ وہ ایسی جگہ بیٹھا تھا کہ روشنی اس پر براہ راست نہیں پڑ رہی تھی مگر چھپن کر

آدمی وہیں، اندر چلا گیا ہو حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ دروازہ کھلا ہی نہیں تھا ورنہ اپر سے نظر آ جاتا یا پھر نئے آگر جب میں نے اس طرف چھلانگ لگائی تھی تبھی میں اسے کھلتا اور بند ہوتا دیکھ لیتا مگر نہیں..... اس اکشاف نے تو میری حالت ہی خراب کر دی کہ وہ جو چیز بھی تھی، لکڑی کے اس دروازے کے نیچے نی جھری سے اندر گئی تھی اور یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ وہ خوفناک سوال تھا جو مجھے ہوا لئے دے رہا تھا۔ وہ جو بھی چیز تھی، میں بتا چکا ہوں کہ بھیڑا نما تھی اور بھیڑا کسی دروازے کے نیچے جھری سے رینگ کر اندر نہیں جا سکتے۔ مگر ایسا یہی ہوا تھا۔

”ضیاء! یہ تو..... یہ تو.....“

طیب نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا تو میں اس کی موجودگی سے واقف ہوتے ہوئے بھی یوں اچھل پڑا جیسے اچانک اکیلے میں کسی نے آگر مجھے ڈرا دیا ہو۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر دیا۔

”یہ وہی جگہ ہے جو ہم نے رات دیکھی تھی طیب..... اب اسے کھولنا ضروری ہے۔“ میں نے چند لمحے خود پر قابو پانے میں لگائے پھر پڑ عزم لجھے میں کہا۔

”نہیں ضیاء! ایامت کرنا۔ یہ ہمارے لئے بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔“  
”کیا تم نے اسے دیکھا تھا؟“ میں نے اپنے ہاتھوں میں پینا محوس کر کے اپنے ہتھیلیاں کپڑوں سے ملاتے ہوئے طیب سے پوچھا۔

”ہا۔“ اس نے جھر جھری۔ ”وہ کون تھا ضیاء اور گیا کیسے؟“  
”خدا جانے۔“ میں ادھر سے پلانا اور ڈگل کا ادھڑا ہوا بدن میرے سامنے بکھرا پڑا تھا جسے غالباً میں اور طیب اس عجیب الخلق شخص کو دیکھ کر بھول گئے تھے۔ طیب بھی اب اس طرف متوجہ تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا اور آنکھوں میں بلاکی وحشت تھی۔

”ضیاء! اب..... ایک اور قبر۔“

میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ٹھیک کرتا تھا۔ اب ہمیں ایک اور قبر کھو دنا تھی۔

”ضیاء! یہاں..... یہاں تو کھڑیاں.....“ طیب اتنا کہتے ہوئے اچھل کر دور پلا گیا۔ اس لئے کہ اس کے دائیں جانب صرف دو قدم کے فاصلے پر رکھے صوف پر گل کی لاش کے کچھ حصے پڑے تھے۔ وہ اسی صوف پر سویا تھا۔

آنے والی روشنی نے اسے اور زیادہ دہشت تک بنا دیا تھا۔ سفید رنگ، سرفتی ماں بھورے بکھرے ہوئے بڑے بڑے بال، چوڑے کاندھے اور چوڑا سینہ۔ وہ ایسے بیٹھا تھا جیسے بھیڑا اپنی چھپلی ٹانگوں کو موڑ کر بیٹھتا ہے۔ بھکر ہوئے کندھوں کے درمیان اس کا سر جھوم رہا تھا، بالوں کی لمبی لمبی لٹوں نے بھی اس کے چہرے کے نظر آنے والے حصے یہ اندھیرا سا بھیڑا رکھا تھا مگر وہ پھر بھی مجھے صاف دکھائی دے گیا تھا لیکن جب تک میں اور طیب میزدھیاں پھاند کر نیچے پہنچے، وہ غائب ہو پکا تھا مگر کہاں.....؟ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ طیب دروازے پر ساکت کھڑا تھا۔ اب کال بیل نہیں نجع رہی تھی۔ طیب بہت خوفزدہ تھا۔ اس کی دہشت بھری ٹانگیں بھی اس عجیب الخلق بھیڑیے نما آدمی کو کمرے میں تلاش کر رہی تھیں۔

”کون ہے وہاں؟“ میں نے طیب کو ساکت کھڑے دیکھ کر پوچھا اور چاروں طرف اسے تلاش کرنے کے لئے نگاہیں دوڑانے لگا۔

”پتا نہیں..... میں..... میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ وہ..... کمال گیا؟“  
”سن طیب.....! دروازہ مت کھولنا۔“ اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ میں کسیں چھپا ہوا ہے اور دروازہ کھلتے ہی بھاگ سکتا ہے۔ دروازے پر جو بھی تھا شاید اب واپس جا چکا تھا۔ میں نے صوفے کی چھپلی دیوار والی میز پر رکھا لیپ آن کر دیا۔ تیز روشنی نے میرے بدن پر چھپتی ہوئی سر درہ سری دوڑا دی۔ پورا صوفہ خون سے تر تھا۔ ڈکلس کے گوشت کے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی ادھڑی ہوئی خون میں لٹ پت ٹانگ اب صوفے کے چیچے اسی جگہ پر پڑی تھی جمال میں نے اپر سے اس بھیڑیے نے آدمی کو دیکھا۔ میں اس طرف بڑھا اور پھر یہ دیکھ کر میرے بدن میں پھیلی سنی میں اضافہ ہو گیا کہ زمین پر خون آلود کپڑوں کے گھینیے جانے کے سے نشان صوفے کے نیچے اس دیوار تک چلے گئے تھے جہاں رات ہم نے لکڑی کا دروازہ دیکھا تھا اور جو ہماری پوری کوشش کے باوجود نہیں کھلا تھا۔ میں دہشت سے لرزتے ول اور ڈمگاتے قدموں کے ساتھ لکڑی کی دیوار تک پہنچ گیا اور پھر جو کچھ میں نے دیکھا، وہ شاید طیب نے بھی دیکھا؟ جو جانے کب میرے چیچے چلا آیا تھا۔

خون آلود جسم کے گھینیے جانے کے نشان دروازے تک آکر یوں اس دیوار کے دوسری طرف چلے گئے تھے جیسے اب سے پلے وہ دروازہ کھلا ہوا ہو اور وہ عجیب الخلق

پھر دادا کی طرف سے بھی پریشان تھا۔ میں الجھ گیا، بیزار ہو گیا، میرے اعصاب آہنی نہیں تھے کہ میں ان بیت ناک تماشوں کا متھل ہو سکتا۔ جن، بھوت، مجزے، اور بھی جتنے اس قسم کے معاملے تھے، یہ ان سب سے مختلف تھا۔ یہ گھڑیاں جادوئی نہیں تو کس کی دسترس میں تھیں، میں نہیں جانتا تھا۔ ایں ایسی کون سی خاص چیز تھی کہ ایک اس کے قتل سے اتنے بہت سے لوگ تماشا بن چکے تھے۔ اس دنیا میں ہزاروں قتل ہوتے ہیں مگر ایسا کسی کے بھی ساتھ نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں میرے اندر کی بیزاری کو بیدار کر گئیں۔

”چلو اٹھو یار.....! اے دفا کر کرے کو صاف کرنے میں نجح ہو جائے گی۔“

”مگر ضایع.....! یہ سب کب تک؟“ طیب اب بھی نہ ٹھال اور خوفزدہ ساتھ  
”صح تک.....“ میں نے دو ٹوک انداز میں جواب دیا۔ میرے جواب نے اس میں پھر تی بھردی۔ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

”چلو۔ تارچ کمال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ورا ز میں۔“ اتنا کہہ کر میں آگے بڑھا۔ میں نے ایک جانب رکھی سینٹل نیل کے نیچے لگی لو ہے کی چپٹی راڑ اٹکا لی۔ اس کے لئے مجھے اس میں لگے اسکرو گھولنا پڑے پھر میں نے اس چپٹی پٹی کی مدد سے ڈگلس کے جسم کے نکڑے ایک جگہ ڈھیرے کی ٹھلل میں جمع کر لئے۔ طیب تارچ لے کر باہر جا چکا تھا۔ اس لمحے مجھے خیال آیا کہ جانے کوں آیا تھا، کس نے نیل بجائی تھی؟ کیوں چلا گیا؟ بھر حال ان باتوں کا کوئی جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے ڈگلس کے جسم کے نکڑوں کو میز پوش میں جمع کیا۔ انسیں گھینٹا ہوا کرے سے باہر لے آیا گواں طرح گھینٹے سے سارا فرش خراب ہو رہا تھا۔ گھنٹہت نہ تھی کہ اس گھنٹوں کو اٹھا کر کندھے پر رکھ لیتا۔ یہ اتنا کہہ سے آمیز کام تھا جو شاید میرے سوا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

میں باہر کوٹھی کی چھپلی جانب پہنچا تو طیب ضرورت کی چیزوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔

”میں اب ان چیزوں کو اسٹور میں نہیں رکھوں گا۔ روز ڈھونڈتا اور اٹھا کر یہاں لانا ہوتا طلب کام ہے۔“ وہ بڑا بڑا تھا۔

میں نے ایلیا کی قبر کے برادر میں اس گھنٹوں کو رکھ دیا۔ طیب نے کوئی بات کئے بغیر زمین کھوڈنا شروع کر دی۔ میں بھی چھاؤ را اٹھا کر شروع ہو گیا۔ معلوم نہیں کہتنی دیر لگی مگر

”میں نے بے غور دیکھا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔ کوئی گھڑی نہیں تھی اور اب سے پہلے جب میں نیچے اترا تھا بھی میں نے وہاں کوئی گھڑی نہیں دیکھی تھی۔“ ”نہیں طیب!“ موت بالکل مختلف ہے، یہاں گھڑیاں نہیں۔ اسے درندے نما انسان نے مارا ہے۔“

”ضایع! یہاں سے چلو۔“ طیب نے ایک دم کاما اور میں چونک اٹھا۔ وہ ٹھیک کہہ تھا۔ یہاں گزرنے والا ہر لمحہ ہمیں ایک نئے حادثے، ایک نئے سانچے سے دو چار کرو تھا۔ یہ بڑی خوف ناک اور پُر اسرار کوٹھی تھی۔ حد درج پُر اسرار، پتا نہیں، کس لمحے ہونے والا تھا۔ شال پا بامجھے پیغام دے چکے تھے۔ دادا میرے منتظر تھے۔ اب مجھے واقتی نہیں کرنا چاہئے تھی۔

”ہاں طیب.....! یہاں سے نکلا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ یا ر یا آخر کس کوٹھی ہے۔ ایسی خوفناک۔“

”یہ خوفناک تھی نہیں..... جب سے تم نے یہاں قدم رکھا ہے، یہ پُر اسرار، ہو گئی ہے اور خوفناک بھی۔ میں ایک عرصے یہاں رہا ہوں۔ ہم نے رقص و سرورِ محفلیں جنمائی ہیں یہاں۔ ڈرمنک پارٹیز کی ہیں۔ راتیں جاگ کر اور دن سو کر گزارے پڑے ایک بڑھیا ایلیا کے علاوہ مجھے یہاں کسی چیز میں نہ کبھی پُر اسراریت محسوس ہوئی تھی کسی چیز سے کبھی ابھجن ہوئی۔ بھر حال ضایع..... میں زندگی کو نہ کھیل کر گزارا۔ متنی تھا اور ہوں..... میں ان عذابوں میں گھرتا نہیں چاہتا مگر..... تمہیں یہاں چھوڑنا بھی میرے بس میں نہیں ہے۔ پلیز! یہاں سے نکل چلو۔ ایسا نہ ہو کہ کوٹھی کا کوئی دور تک پھیلا ہوا ویران حصہ ہمیں قبرستان میں بدلتا پڑے۔ تم اسے زنجیر سے کوئی نہیں دیتے یا رابرٹ کو دے دیا تم انہیں سورن سنگھ کو بھی دے سکتے ہو۔ میرے ڈیں وہ دونوں ہم سے بستر پوزیشن میں ہیں۔“

”انھو!“ میں نے ڈگلس کے گوشت کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ نہیں تھے میں نے اس کی بات غور سے سنی تھی یا اس سے متفق نہیں تھا، مگر یہ وقت باتوں کا نہیں تھا۔ یہ فیصلہ ہمیں کرنا ہی تھا کہ اب کیا کریں، مگر فی الوقت ڈگلس کے ٹکڑے کو دفانا اور کرے کو صاف کرنا ضروری تھا۔ میرے ذہن میں وہ بھیڑیا نہما شخص اور اس دروازے سے ریک کر اندر جانا پھوڑے کی طرح پک رہا تھا۔ میں دنیا کا ہر کام چھو بیٹھا تھا۔ آفس سے چھٹیاں لے لی تھیں مگر اب تک میں کسی کام کو کمل نہیں کر سکا

جہاں سے ہمیں نیکسی مل جاتی۔ ہمارے بیگ ہمارے کانڈوں پر تھے ان میں اتنا سامان نہ تھا مگر کندھے تو قبریں کھودتے کھودتے شل ہو چکے تھے اس لئے مجھے لگ رہا تھا جیسے میں ایک پاڑکندھے پر رکھے چل رہا ہوں۔

ہمیں جلد ہی نیکسی مل گئی۔ ”ریلوے اشیشن چلو۔“ میں نے اس نیکسی میں بیٹھنے لئے کندا۔

طیب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ”کیوں؟“ وہ بولا۔

”ہم پہلے دہلی جائیں گے۔“ میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر اس میں سے سگریٹ منتخب کرتے ہوئے جواب دیا۔

”پاگل ہوئے ہو کیا۔ حالت دیکھ رہے ہو اپنی اور میری؟“ اس نے میری توجہ اپنے اور میرے جلنے کی طرف دلائی۔ یہ میں دیکھ کچا تھا کہ ہمارے کپڑوں پر خون کے دھنے نہیں کیوں کہ ہم کپڑے بدل چکے تھے مگر نہایت بغیر۔ ہمارے جسم مٹی سے اٹے تھے اور پینے نے اس مٹی کو ہمارے بدن پر قلعی کی طرح جما دیا تھا۔ یقیناً نیم گرم پانی سے غسل ہمیں بالا چلا کا کر سکتا تھا مگر میں لھر نہیں جانا چاہتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے زیوسا کا سایہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔ پراسراریت اب بھی ان دیکھی زنجیر کی طرح میرے پیروں میں لپٹی ہوئی ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ساتھ زیوسا کا نخوس سایہ زہرہ آپا کے گھر کو بھی اپنی خوفناک پناہوں میں لے لے گر طیب یہ سب نہیں سوچ رہا تھا۔

”ہم اشیشن کے قریب حام میں نہیں گے۔“ میں نے اسے تفصیل بتانے کی بجائے اسے ٹانٹا چاہا۔

”کیوں.....؟ ہمارے پیچھے کیا جنگل لگے ہیں؟“

وہ عجیب آدمی تھا۔ لمحہ بھر میں پچھلے خوفناک واقعات کو بھول جانا اس کے لئے ایک نعمت ہی تھا۔ پہلے میں نے چلا کا کہ اسے یاد دلاوں مگر بے وجہ اسے اذیت میں جلتا کرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ”نہیں.....! جنگل تو نہیں لگے ہیں، دادا کی طرف سے پریشانی ہو گئی ہے پھر شانی ببابا کسی جنگل یا غاروں میں گم نہ ہو جائیں، بس یہی پریشانی ہے۔“

”وہی جانے والی ٹرین چلنے میں ابھی ذھانی گھنٹے ہیں۔“ طیب نے آتا ہے ہوئے انداز میں جواب دیا۔ نیکسی درمیانی رفتار سے اشیشن کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”یہ ذھانی گھنٹے ہمارے نہانے، اچھے سے ہوئیں میں بھترین قسم کا باشتا کرنے اور

ہم نے ایک گمراہ گڑھا کھو دیا۔ گھنٹہ بھی کو گڑھے میں پھینک کر اسے بند کرنے میں مددیاں بنتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ تھکن اور اعصابی ٹوٹ پھوٹ سے بدن چیخ رہا تھا مگر آرام ابھی ہماری قسمت میں نہیں تھا۔ طیب کا حوصلہ دیکھ کر میں خود کو مضبوط کر رہا تھا اور اس میں شاید حوصلہ اس لئے جوان تھا کہ میں نے کہہ دیا تھا کہ صحیح تک ہی یہ سب کچھ کریں گے اور پھر یہ کوئی چھوڑ دیں گے۔

کمرا صاف کرنے، اسے ترتیب دینے اور درست کرنے میں صحیح ہو گئی۔ چڑیوں کی چپچماہٹ اور کھڑکی کے شیشوں سے شفق کی سرفنی مائل سنری کرنیں کمرے میں داخل ہوئیں تو میں آخری نگاہ کمرے میں ڈال رہا تھا۔ طیب صوفے پر لیٹا ہاپ رہا تھا۔ میں نے اور اس نے اس صوفے کو جس پر ڈگلس کا خون لگ چکا تھا۔ باہر لے جا کر پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر ڈالیں اور اس میں سے خون نکال دیا تھا اور سوکھنے کے لئے اسے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔

”کیا اب تم اس صوفے کے سوکھنے کا انتظار کرو گے؟“

طیب نے مجھے چونکا دیا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ میرا حلقوں خشک ہو چکا ہے۔ میں نے کچن میں جا کر ٹھہڑا پانی پیا، طیب کی نگاہیں مسلسل میرا تعاقب کر رہی تھیں۔

”پھر کیا کرو گے۔“ اسے نہیں چھوڑ جاؤ گے۔ یہ تمہارے دوست کی امانت ہے۔“ کیا سوچے گا کیوں کہ اگر یہ باہر ہی پڑا رہا تو خراب ہو جائے گا۔“

”یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے خیاء! میں اسے نیا صوفہ لے دوں گا مگر خدا کے داسٹے اب یہاں سے نکلو۔“

وہ کھڑا ہو گیا۔ میں نے چند لمحے سوچا، وہ ٹھیک کرتا تھا، یہ میرا معاملہ نہیں تھا۔ میں اپر جانے کے لئے آگے بڑھا۔ طیب میرے ساتھ تھا۔

ہم نے اپنا سامان سینا اور اس کوٹھی پر آخری نگاہ ڈال کر وہاں سے نکل آئے حالانکہ مجھے نہ معلوم کیوں یہ ٹک تھا کہ ہم وہاں سے نکل نہیں پائیں گے۔ وہ جو بھی تھی، میرے پیچھے پڑ چکی تھی۔ طیب بھی اب اس کے حصار میں تھا۔ مجھے یہ یقین تھا کہ ہمارے نکلے نکلتے ایسا کوئی حادثہ ضرور ہو گا کہ جس سے ہم نکل نہیں پائیں گے مگر جیسے انگیز طور پر ہم کوٹھی کو لاک کر کے اس کے گیٹ کو عبور کر آئے تھے۔ طیب کی گاڑی خراب تھی اور گیراج گئی ہوئی تھی اس لئے ہم اس چڑھی سڑک کی طرف چل دیے

میں نے مسکرا کر اسے دیکھا  
”کیا تم کچھ محسوس کر رہے ہو؟“  
”نہیں..... اب نہیں کر رہا۔“  
”ائشن آگیا سر۔“

جیوی والے نے ہمیں چونکا دیا پھر تیکسی کو ایک طرف پارک کیا۔ میں اسے کرایہ دے کر، طیب کا ہاتھ تھاے باہر آگیا۔ یہاں کچھ ہی فاصلے پر حمام بنے تھے۔ ہم دونوں اسی طرف بڑھ گئے۔

”ضیاء!“ طیب چلتے چلتے ایک دم رک گیا۔  
”کیا؟“

”زہرہ آپا وغیرہ کو نہیں پتا کہ ہم یہاں ہیں، اور یہاں سے کہاں جا رہے ہیں۔ وہ کوئی فون کریں گی اور تمہیں پتا ہے کہ نہ صرف خود ہولاتی رہیں گی بلکہ پورے سرال اور شاید میکے تک کو ہولا دیں۔“

وہ ٹھیک کہ رہا تھا۔ انہیں دلی جانے کی اطلاع دینا ضروری تھا۔ میں نے لگاہ ادھر ادھر دوڑا۔ پیلک ٹیلی فون بوتحہ دور نہیں تھا۔ میں طیب کو لئے اس طرح بڑھ گیا۔ میں نے فون ملایا۔ دوسری طرف طاہر بھائی تھے اور حسب سابق میری آواز سننے کی برس پڑے۔

”یار ضیاء.....! اس سے تو بہتر تھا کہ تم آتے اور یہاں اطلاع ہی نہ کرتے، دن اور رات زہرہ روئی اور بورتی رہتی ہے۔ اب کیا بمبی اتنا چھوٹا ہے کہ میں روز تمہیں تلاش کر کے، تمہاری خیریت کی اطلاع لے کر گھر لوٹوں! کہاں ڈھونڈوں تمہیں؟ بات کرو اس سے۔“

انہوں نے میری بات سے بغیر ہی فون زہرہ آپا کو دے دیا۔ مجھے سخت غصہ آگیا تھا۔ فون پر زہرہ آپا کی بسوڑتی آواز سننے ہی میں اکھڑ گیا۔ ”زہرہ آپا! یہ کیا تماشا بیٹا ہوا ہے آپ نے۔ میں کوئی تھامسا دو دھ پیتا پچھے ہوں کہ کھو جاؤں گا۔ گر جاؤں گا اور.....“

”ضیاء تم ٹھیک تو ہو مال!“ انہوں نے میری بات کا کوئی بھی اثر لئے بغیر کہا اور مجھے بے ساخت ان پر پیار آگیا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں آپا۔ خدا کے واسطے آپ میری فکر چھوڑ دیں اس لئے کہ

گرم اگر مجاہے پینے میں گزر جائیں گے۔“ میں نے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ مجھے اب بھی خوف تھا، کسی انسوں کا، کسی حادثے کا! سانچے کا..... کسی خوفناک واقعہ کے زو نما ہونے کا، مگر سکون اتنا گمراہ ہو چکا تھا کہ مجھے میرے دل کے دھڑکنے کی آواز اپنے پورے وجود میں گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم بے پناہ مصروف سڑک پر سے گزر رہے تھے مگر سناٹا گمراہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔ میرے اندر صرف سناٹ کی گونج تھی، اپنی تمام حسون پر گراں گزرنے والی گونج۔

طیب اب چپ ہو گیا تھا۔ نیکسی والا چپ تھا۔ شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ مجھے لگا، جیسے جس سے مرہی جاؤں گا۔ شیشوں کا خیال آتے ہی میں نے خود کو تسلی دینا چاہی کہ میں اس لئے سناٹا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے فوراً شیشے اتار دیئے۔ باہر ریفک کا شور تھا مگر یوں جیسے ایک چھوٹے سے حصے میں سمنا ہوا ہو۔ شیشے کھول دینے کے باوجود میرے اندر کے سناٹ میں کوئی فرق نہ پڑا، نہ اندر گرد کی طرح بیٹھے سکون میں۔ گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

”طیب! باتیں کرو۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔

طیب نے مجھے جیرا گئی سے دیکھا پھر شاید اسے میرے چہرے سے اندر کی کیفیت کا احساس ہو گیا۔ ”کیا ہوا ضیاء؟“ اس نے میری جانب سرک کر سرگوشی کی۔

”کچھ نہیں..... کچھ..... گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ وہ..... وہ پتھر ہے تا تمہارے پاس!“

”ہا۔“

طیب کا ہاتھ بے ساختہ اپنے کوٹ کی اندر روپی جیب میں رینگ گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر اطمینان پھیلتا دیکھا جس کا مطلب تھا کہ اس نے چھوکر تصدیق کر لی ہے۔

”کیا دوں؟“

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا پھر جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ میری اس بے ساختہ قدم کی حرکت نے مجھے جیسے ایک جادوئی حصار سے باہر نکال لیا۔

ریفک کے بے پناہ شور نے مجھے اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔

”کیا..... لگ..... کیا ہو رہا ہے تمہیں ضیاء؟“

اب طیب پریشان ہو گیا۔ ”کچھ نہیں..... اب..... اب میں ٹھیک ہوں۔“

تک محفوظ ہیں۔ ”میں نے اس کا اعتماد بحال کرنا چاہا۔ ”چو..... جلدی کرو۔ تامن نہیں ہے۔“

وہ میرے پیچھے چلا آیا۔ میں نے اب اس کی طرف نہیں دیکھا اور خود کو بھی بالکل ہاریل ظاہر کیا۔ میں جانتا تھا کہ کچھ ہی دیر بعد وہ سب کچھ بھول جائے گا اور ہوا بھی یہی۔ وہ منٹ بعد ہی وہ حمام میں زور زور سے فلی گاتا گرا رہا تھا۔ ”برسات میں..... ہم سے ملے تم جون تم سے ملے ہم..... برسات میں۔“

ہم نہ کر باہر نکلے تو گاہیے کئی پھاڑ اپنے اور سے اتار آئے ہوں۔ طیب تو بت چک رہا تھا۔ یقیناً وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ ہم نے اچھے سے ہوٹل میں ڈٹ کر ناشتا کیا پھر بھاگ بھاگ ٹرین پکڑی۔ ٹرین روانہ ہونے تک میں نے طیب کا ہاتھ کسی نہ کسی بہانے تھا سے رکھا۔ میں جانتا تھا کہ اس پتھر کی موجودگی، طیب کو اور اس کا ہاتھ تھا سے رہنے سے مجھے بھی محفوظ رکھے گی۔ ویسے اس پر اسار ہستی کی طرف سے اتنا سکون کسی طوفان کا پیش نہیں ہی لگ رہا تھا مگر میریں جلد از جلد دلی پتچ جانا چاہتا تھا۔

ایک دن اور رات کا ایک طویل حصہ ہمیں سفر میں گزارنا تھا۔ میں خیریت سے سفر کث جانے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ طیب یا تو لوگا نہ رہا تھا یا پھر پنچے کھارا رہا تھا جو اس نے اشیش سے کلو بھر خرید لئے تھے پھر وہ برابر بیٹھے ایک مراثی لڑکے سے ساتھ باشیں کرنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ بڑی تھیشہ مراثی بول رہا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھ کر سوچنے لگا کہ کچھ نہیں فرحت اور بی جان دلی میں ہوں گی۔ وہ دونوں تو شاید رک جاتیں مگر خالہ بی کا دل زیادہ دن تک کسی ایک جگہ نہیں لگتا تھا۔ ویسے میں فرحت اور بی جان سے کہ آیا تھا کہ وہ یہیں رہیں جب تک میں لوٹتے آؤں، مگر وہ مرضی کی ماں تھیں، وہ سکتا ہے چل گئی ہوں پھر اچانک مجھے طیب کا خیال آیا۔ اس کی فرحت میں دلچسپی یاد آگئی تو لوگا جیسے پچھونے ڈنک مار دیا ہو۔ طیب میرے ساتھ جا رہا تھا۔ بے ساختہ میرے دل سے دعا نکلی کہ فرحت اور بی جان میرٹھ جا چکی ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اگر وہ میرٹھ میں ہوئیں تو میں اکیلا ہی میرٹھ جاؤں گا۔

”یار ضیاء! اب کیا کریں؟“

اچانک طیب نے مجھے چونکا دیا۔

”کیوں؟“ میں نے اسے دیکھا۔ اس کی برابر دلی سیٹ خالی تھی۔ وہ مراثی لڑکا

میں ابھی اشیش سے بول رہا ہوں۔ میں اور طیب دلی جا رہے ہیں۔“

”ارے..... طے بغیر۔ تم تے تو اتنے دن شکل ہی نہیں دکھائی۔“

”آپ بھول رہی ہیں، پرسوں میں آپ کے گھر پر تھا۔ میری شکل میں ابھی تک کوئی تبدیلی زو نہ نہیں ہوئی کہ میں آپ کو ضرور دکھاتا۔“

”وہ تو نہیک ہے مگر طے بغیر.....“

”ہاں آپا! وقت نہیں ہے۔ میں دادا کی طرف سے پریشان ہوں۔“

”ارے ہاں! کل دلی سے فون آیا تھا۔ دادا تمہارے لئے پریشان ہیں۔ میں نے رات کو اس لئے فون نہیں کیا کہ تم ڈانٹو گے، صحیح کیا تو کسی عورت نے اٹھایا اور کہا کہ تم وہاں نہیں ہو۔“

”میں سنائی میں آگیا۔ ”کون..... کون تھی وہ..... میرا مطلب ہے اس نے بتایا کہ وہ کون بول رہی ہے؟“

”آں..... ہاں! بتایا تو تھا، وہ..... ہاں ایسا.....“

میں نے چونک کر طیب کو دیکھا۔ طیب بات چیت سے اندازہ لگا چکا تھا کہ کچھ ہو چکا ہے۔ پوچھنے کے لئے بے چین تھا۔ ”یجتنے طیب سے بات کر لیں۔ یہ میرے ساتھ ہی جا رہا ہے۔ اب اس کے گھر میں عذاب نہ چاہیجئے گا۔“ پھر اس سے پسلے کہ وہ کچھ اور پوچھتیں۔ میں نے طیب کو ریسیور تھما دیا اور اشارہ کیا کہ جلدی سے بات کر کے ختم کرے، تامکم ہے۔ اس نے جلدی اطلاع دی۔ نہ گھبرانے کی تلقین کی۔ غالباً انسوں نے کہا تھا کہ وہ ظاہر بھائی سے بات کرے مگر طیب نے منع کر دیا اور فون بند کر دیا۔ فون بند کرتے ہی وہ میری طرف پلکا۔

”کیا کہہ رہی تھیں؟ کس عورت کی بات کر رہے تھے؟“

میں نے اسے بتایا کہ زہرہ آپا سے ایسا ہے کہہ اسے جا چکے ہیں۔ یہ سختے ہی اس کے چہرے پر سفیدی پھیل گئی۔

”ضیاء! پہ بڑا کمال نہیں ہوا کہ ہم وہاں سے صحیح سلامت نکل آئے۔“

اسے اب احساں ہوا تھا جب کہ میں جانے کب سے یہ سب سوچ رہا تھا۔ ”ہاں لیکن میں اب بھی مطمئن نہیں ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے اس کا خوف بڑھا دیا تھا۔ اس کا احساں مجھے اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی ہوا تھا۔ ”لیکن بہر حال..... اب ہم کسی حد

وہاں نہیں تھا۔

”وہ تین فلموں کی کمایاں سن پکا تھا۔ جب میں نے اسے سنانا چاہیں تو وہ سونے کے بہانے اوپر چلا گیا۔“

طیب مجھے معصوم ساچہ لگا جو کھلیتے کھلتے آکر شکایت کرتا ہے کہ مقابل اپنا کھل کھیل کر چلا گیا، اس کی باری نہیں آئے دی۔ ”تم بھی سو جاؤ۔ تھکے نہیں ہو کیا۔“

”ہاں.....! یہ ٹھیک ہے۔“

اتا کہہ کروہ لیٹ گیا۔ خود میرے بدن میں بھی اب درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ بالخصوص میری پنڈیاں اکڑی ہوئی تھیں، میں بیگ کو سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ میرے ذہن میں کچھ نہیں تھا یا میں خود ہی کچھ سوچنے سے احتراز کر رہا تھا۔ میں نے سونے کی کوشش کی اور اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا۔ سوتے سوتے میں نے طیب کے خرائے نے تھے پھر میرا زہن اندر ہیروں میں گم ہوتا چلا گیا۔

”اٹکل! اٹکل!“



”کیا بات ہے؟“ میں نے اٹھنے ہوئے پوچھا۔

”اٹکل! یہ ان آئٹی نے دیا ہے۔“ اس پانچ چھ برس کے پیارے سے بچے نے میرے سامنے اپنی ہتھیلی کھولی اور دوسرے ہاتھ سے کھڑکی سے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ٹرین کی اشیشن پر رکی ہوئی ہے۔ میری سرسری نگاہ اس کی ہتھیلی پر پڑی اور میں باہر دیکھنے لگا۔ مگر مجھے یوں لگا ہے میری نگاہیں اس نرم اور چھوٹی سی ہتھیلی ہی سے چمنی رہ گئی ہوں۔ میں چونکا پلنا اور میں نے بچے کی ہتھیلی کی طرف دیکھا۔ وہاں شالی بابا کا دیا ہوا دھوپ پھر جک رہا تھا جو میں طیب کو دے چکا تھا اور جسے طیب کپڑے میں مومن جامہ کر کے اپنے بازو پر باندھ چکا تھا۔ وہی پھر۔ سیاہ پچکدار پھر اس وقت بچے کی ہتھیلی پر دھرا تھا اور میرے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ وہاں طیب نہیں تھا۔ میں نے پسلے وہ پھر اپنی مٹھی میں چھپا لیا پھر کھڑکی سے باہر اس طرف دیکھا۔ جمل بچے نے اشارہ کیا تھا اور جواب بھی پر شوق نگاہوں سے اسی جانب دیکھ رہا تھا۔

”کس نے..... کس نے دیا ہے یہ تمہیں؟“

”وہ وہاں آئٹی تھیں..... ابھی تو تھیں۔“

وہ بچہ کھڑکی کے قریب آکر خود بھی چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سامنے چائے کا ہوٹل

کر میں نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور نگاہ باہر جادی۔ لوگوں کا راش تھا۔ ٹرین پھر وسل دے رہی تھی۔ لوگ ٹرین کی طرف بھاگ رہے تھے مگر ان میں کہیں بھی طبیعی تھا۔ میرا جی چاہا کہ ٹرین سے اتر جاؤ۔ میں اشیش کے کپے فرش پر جائیشوں یا پھر اتر کے چاروں طرف بھاگوں اور طبیب کو زور زور سے آوازیں دوں۔

اچانک ایک جھنکا لگا اور ٹرین نے ریگنا شروع کر دیا۔ میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ کھڑکی پر جھکا اور باہر دیکھنے لگا۔ اسی وقت میری نگاہ ایک بر قدم پوش عورت پر پڑی جو میری ہی طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ پہلے تو میں اسے اپنا وہم سمجھا۔ میں نے دامیں باسیں کی کھڑکیوں کی طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے ہی دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ اب میں نے اس پر نگاہ جادی۔ اس نے ہاتھ انھیا اور ہلانے لگی جیسے مجھے خدا حافظ کہ رہی ہو۔ میری گدی پر پینا رینگ گیا۔ طلق خنک ہو گیا۔ کائنے سے اگئے محسوس ہوئے۔ طلق میں بھی اور سینے میں بھی۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اتر جانا چاہئے۔ میں طبیب کو یہاں کی مصیبت میں پھنسا کر کیسے جاسکتا تھا؟ میں نے پٹ کر تیری سے اپنا بیگ اٹھایا۔ اسی وقت میری نگاہ طبیب کے بیک پر پڑی۔ میں نے وہ بھی اٹھایا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ ٹرین کی رفتار تیز ہو چکی تھی اور میں اس کے مزید تیز ہونے سے پہلے کو جانا چاہتا تھا۔ میں جھکنے سے دروازے پہنچا، ایک ہاتھ میں لو ہے کی گول سلاخ تھا اور اپنے قدم جمانے لگا۔ میں رفتار کا اندازہ بھی کر رہا تھا تاکہ کوئی سکوں۔

”ارے ارے بھیا! کیا ہوا.....؟“

اس آواز نے میرے ہوش اڑا دیے۔ میں آدھا باہر کی طرف نکل گیا۔ میں کو دنا چاہتا تھا اور آواز نے لو ہے کی سلاخ پر میری گرفت سخت کر دی تھی۔ ہاں..... وہ طبیب کی آزاد تھی۔ اس نے مجھے نہ تھام لیا ہوتا تو میں گرچکا ہوتا اور پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ پھر بیوں پر جا گرا ہوتا بلکہ اب تک تو ہوتا بھی نہیں۔ ٹرین کا پورا ذا میری نگاہوں میں گول گول گھوما اور پھر اچانک ساکت ہو گیا۔ طبیب مجھے ایک ہاتھ سے تھا کے کھڑا تھا۔ ”سرے ہاتھ میں بڑے بڑے چٹوں میں کچوریاں مسالہ تھا۔

”کمال تھے تم؟“ میں نے پھٹنی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”ہاں.....! ذرا دیر ہو گئی تھی۔ ٹرین رینگنے لگی تب بھاگا۔ ابھی تو چڑھا۔

تھا، وہاں لوگ تھے مگر وہ ایسا ہو ٹل نہیں تھا کہ وہاں عورتیں بھی جاتیں۔ آس پاس بھی تمام مرد ہی نظر آئے۔

”کمال ہے بیٹا؟“ میں اب اس کے پیچھے کاندھے پر جھک گیا۔ وہ اتنا جھوٹا پچھا کر وہ کسی بات کا جواب دے ہی نہیں پاتا، اس کی تو خود آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ وہ کبھی باہر دیکھتا اور کبھی میری طرف۔ میں باہر ہجوم میں طبیب کو بھی تلاش کر رہا تھا۔ کبھی خیال آتا کہ وہ چائے یا کھانے کی کسی چیز کی تلاش میں اترا ہو گا اور کبھی اس پتھر کے ہتھیل میں پہنچتے ہوئے لس سے بدن میں خوف کی لہری دوڑ جاتی۔ لگتا، جیسے زیوں سا کو اپنا کام دکھانے کا موقع مل گیا ہے۔ بار بار طبیب کا چڑھہ کبھی خوف میں لپٹا اور کبھی ہستا مسکراتا، اپنی جانب آتا محسوس ہوتا۔

”پا نیس انکل! وہ کمال گئیں؟“ پچھے شاید باہر کے مناظر سے بور ہو گیا تھا۔ ”آپ سور ہے تھے نا تو انہوں نے کما، یہ ان انکل کو دے دو، پھر مجھے چاکلیٹ بھی دیا تھا۔“

وہ اب میری طرف پلٹ گیا۔ ”تم..... تم اکیلے ہو کیا؟“

میں نے ڈبے میں نگاہ ڈالی۔ مجھے اسکی کوئی میلی نظر نہ آئی جن میں سے کسی کی نگاہ پہنچ کی طرف انھی ہو۔ ”نہیں تو..... میری ای ہیں..... وہ..... وہ رہیں۔“ وہ ذرا اچکا اور اس نے چھوٹے سے پارٹیشن کے دو سری طرف پیٹھے ہوئے کچھ لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں۔ ”اوھر آؤ کیلاش!“

عورت کی آواز پر میں چونک اٹھا۔ وہ پچھے بھاگتا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی مجھ پر گھبراہست کا دورہ سا پڑ گیا۔ میں دوسری جانب کھڑکی میں گیا مگر اس طرف پلٹ فارم نہیں تھا پھر بھی میں نے دور لگے تلکے پر پانی بھرتے لوگوں کو غور سے دیکھا۔ ان میں طبیب نہیں تھا۔ میں بھاگ کر داش روم کی طرف گیا۔ میں نے بے ساختہ اس پر دستک دی۔ طبیب کو آوازیں دیں مگر جواب میں ایک خراشت سی ”ہوں!“ کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا۔ گھبراہست، مایوسی اور خوف نے مجھے بے حال کر دیا۔ میں پھر دوڑ کر کھڑکی پر چلا آیا جو پلٹ فارم کی طرف تھی۔

میں اسی لمحے ٹرین نے وسل دی۔ میرے پیسے چھوٹ گئے۔ طبیب کا دور دستک کسیں پتا نہیں تھا۔ کوئی میرے دل میں پنکلیاں سی بھر رہا تھا۔ میری پیشانی عرق آکوڈ ہو پکی تھی۔ اب تو ناگوں میں کھڑے رہنے کا دام بھی نہیں تھا۔ میں سیٹ پر بیٹھ گیا۔ نہ حال ہو

مجھے بچ نے دیا تھا۔ طیب کی لگاہ اس پر پڑی، پسلے تو اس نے سرسری لگاہ ڈال کر ہٹالی۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ اچھل پڑا۔ اس نے کچوری کا نوالہ چپائے بغیر نگل لیا اور بولا۔

”یہ..... یہ کہاں سے آیا؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا بازو ٹھوٹلا اور وہاں پھر موجود دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

میں نے اسے ساری داستان سنائی۔ وہ حیرت سے مجھے تکتا رہا۔ ”وہ کون ہو سکتی ہے؟ اور..... کیا پتا یہ نقلی ہو۔“

اس کی بات سننے ہی میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس میں اور اصل میں کوئی فرق نہیں تھا۔ گریہ اس وقت چمکدار اور سخت پتھر ہی کی شکل میں تھا۔ میں نے چاہا کہ اسے ویسا دیکھ سکوں جیسا کہ اصل پتھر کو دیکھ چکا تھا۔ نرم، بہت سی نسوان والے زندہ دھرتا ہوا مگر وہ ایسا ہے۔ ہو سکا پھر بھی مجھے نہ معلوم، کیوں اس کے اصلی ہوتے کا لیقین تھا۔ میں نے اسے احتیاط سے اپنے کوٹ کی اندر دوئی جیب میں رکھ لیا۔

”سنو ضایا!“ طیب نے رومال سے منہ پوچھتے اور میرے حصے کی کچوریاں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے تاکہ اسے تم تک پہنچانے والے شالی بیبا ہوں۔“

”نہیں..... میں نے اس بر قعد پوش عورت کو دیکھا تھا۔“

”ہاں..... وہ تو نہیک ہے مگر اس کے ذریعے تم تک تو پہنچا تو سکتے ہیں تا دہ.....“

”ہو سکتا ہے۔“ میں پر سوچ انداز میں بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ سفر میں کیس نہ کیس دشواری آنے والی ہے۔“ میں زیر لب بڑیا دیا۔

”بیس..... کیا؟“

تب میں نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”یا! تم اس مصیبت سے نجات کیوں نہیں پا لیتے؟ ان زنجیروں کو چاؤ گے کیا؟ جو مر گئے، سو مر گئے۔ اب مزید عذاب کیوں مول لیتے ہو؟“

بات دہ نہیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں ان چکروں سے خود بھی تنگ آگیا تھا۔ پے در پے ہوئے والے واقعات اور حدثات نے مجھے بھی سن کر دیا تھا۔ سارا لوٹ، سارا جو ش اور کام بازو ٹھوٹلا۔ پتھر موم جامہ کیا موجود تھا۔ میں نے جیب میں باٹھے ڈالا اور وہ پتھر ٹکال لیا جو

تھا۔ بھوک اتنی لگ رہی تھی مگر.....“ وہ ایک دم چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ ”مگر تم..... تم کیا کرنے جا رہے تھے؟ خود کشی.....؟“

”بہت بے وقوف ہو تم۔“ میں نے دانت کچکچائے اور جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا کر اپنی سیٹ کی طرف بڑھا۔

”پرانی بات ہے۔“ وہ میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ”ویسے یار ہوا کیا! اسی کوئی کس بات ہو گئی کہ تم خود کشی پر مجبور ہو گئے تھے؟“

میں نے اپنا اور اس کا ہینڈ بیگ اوپر بر تھا پر رکھا اور جھٹکے سے بیٹھ گیا۔ وہ میرے برادر میں آبیٹھا۔

”لو! کچوری کھاؤ۔ بہت مزے کی ہے۔ میں نے کھا لی تھی۔ پیٹ بھر گیا مگر دل نہیں بھرا اس لئے لئے بھی لے آیا۔ لو کھاؤ۔“

میں ابھی تک سنبھل نہیں پایا تھا۔ اس کے اس انداز سے اور چڑھ گیا۔ جی چاہا کہ مکار کراس کا چلتا ہوا جبڑا توڑ دوں۔ اس نے میری طرف قطعی دھیان نہ دیا بلکہ پوری دل جبی سے کچوریاں کھاتا رہا۔ اسے دیکھ دیکھ کر میرا بھی جی چاہنے لگا تھا مگر میرا ذہن اس پتھر میں چپک کر رہا گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیسے بات کروں۔ یہ اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ کوئی انہوں واقعہ پیش نہیں آیا اور جیسا کہ میرا خیال تھا کہ وہ پتھر اس والا ہو گا تو یہ بات بھی اب غلط لگ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ ایک پتھر میں رابرٹ کو دے چکا تھا اور دوسرا طیب کو۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا جو پتھر مجھے پے ہے

نے لا کر دیا ہے، وہ کون سا ہے؟ وہ کون سا ہے؟ وہ لایا رابرٹ والا.....؟

”طیب!“ میں نے اسے منہک دیکھ کر آواز دی۔

”ہوں!“ وہ کچوری چباتے ہوئے مجھے دیکھ کر بولا۔

”وہ..... پتھر کہاں ہے؟“

”کون سا پتھر!“

”شالی بابا والا..... موم جامہ کیا تھا نا!“

”ہوں..... ہوں.....“

اس نے اپنے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ منہ میں کچوریاں بھری تھیں۔ میں نے اس سارا انعام بے زاری میں تبدیل ہو گیا تھا۔

"شالی بیا سے مل کر سوچیں گے۔" میں نے گمراہنے لے کر خود کو کافی حد تک سنبھالا اور کچوریاں کھانے لگا۔

"ہاں! تم کچوری کھاؤ۔ بڑے مرے کی ہیں۔" وہ سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ تمارے حصے میں اب میرے اور طیب کے سوا کوئی نہیں تھا۔ بچے کے ساتھ کی نیمی دوسرے حصے میں تھی۔ بیان والا مراٹھی راستے میں کہیں اتر چکا تھا۔ میں بھی سیٹ پر لیٹ گیا۔ ٹرین رفواری سے بغیر علاقے عبور کر رہی تھی۔

"طیب سنو! میں کچھ دیر کو سوؤں گا۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے سمجھے، نہ کچوریاں یا نہ کچھ اور....."

"ہاں! ہاں! میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ یہ دیکھو۔" اس نے جانے کیا۔

ایک کتاب نکال کر دکھائی۔ "تم سو جاؤ۔ میں یہ پڑھوں گا۔" میں نے مطمئن ہو کر آنکھیں موند لیں حالانکہ میں کچھ دیر پسلے ہی سوکر اٹھا تھا۔ زہن اب بھی بو جھل تھا۔ نیند آنکھوں میں چھپ رہی تھی۔ ٹرین کے ہنگولے اب تھے۔ رہے تھے۔ میں سو گیا۔

طیب نے مجھے اٹھایا تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ وہ کہیں سے تھرماں بھر چاۓ لے آیا تھا۔ غالباً یہ تھرماں بھی اس نے خریدا ہو گا۔ چاۓ کی شدید طبلت تھی میں نے منہ پر پانی کے چھپا کے مارے اور چاۓ پینے لگا۔ طیب کو اچانک جیہے یاد آگئی تھی وہ جیہے کی باشیں کرتا رہا کہ اس نے اظہار محبت تو نہیں کیا مگر اسے لیکن تھا کہ اس سے محبت کرنے لگی ہے۔

"اظہار کے بغیر تمہیں کیسے پتا چلا؟" میں نے یونہی چھڑرا۔

"اس کی آنکھیں بولتی ہیں۔" وہ فوراً بولا۔

"تم کیسے من لیتے ہو؟ کیا تمہارے کان بجھتے ہیں؟" میں نہ۔

"تم غلط محاورہ استعمال کر رہے ہو۔"

"تم پروا مت کرو۔ بامحاورہ زبان پر مجھے عبور حاصل نہیں ہے۔"

"اے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے اس کی آنکھوں میں دارفتگی ہو۔ خود سپردگی کے خمار آلود کیفیت مجھے اس کی جانب کھینچنے لگتی ہے اور شدید محبت کی یہی نشانی ہوتی ہے۔

"اور موئیکا کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ہاں! چاہتی تو وہ بھی ہے مجھے مگر یا۔۔۔! وہ۔۔۔ اس کے بارے میں تو تم کہ رہے تھے کہ اس کی نہیں۔۔۔ نہیں! نہیں! وہم ہو گا تمہارا۔ اس کا بھلا زیو سے کیا تعلق! اسے تو میں بہت عرصے سے جانتا ہوں۔"

"کتنے عرصے سے؟" میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"تباہ۔ ایک ماہ پسلے میں نے اسے اس ریسٹوران میں دیکھا۔" وہ یوں کہہ رہا تھا جیسے ایک ماہ نہیں، ایک سال یا ایک صدی کی بات کر رہا ہے۔

"اور زیو سامیرے ساتھ بچپن سے لگی ہوئی ہے۔"

"اچھا یا را! چھوڑو یہ باشیں، مجھے تو اس تختس سے اب تکلیف ہونے لگی ہے۔ جو ہو گا اس سامنے آجائے گا۔ ویسے میرا مشورہ یہی ہے کہ جان چھڑاؤ۔ زندگی میں بڑی رنگینیاں ہیں۔ بڑے مرے ہیں۔"

"ہاں! تھک تو میں بھی گیا ہوں۔" میں نے سر سیٹ کی پشت سے نکا دیا۔ رات ہو چکی تھی۔ چند گھنٹے باقی تھے۔ ہم نے جو ٹرین لی تھی، وہ صبح چار بجے بھیں دلی پہنچانے والی تھی۔ اب تک سفر عافیت سے کٹا تھا۔ میری خواہش تھی کہ مزید سفر بھی سکون سے کٹ جائے۔ اب طیب جھکولے کھا رہا تھا۔ اس پر غنوڈگی طاری تھی۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھا اور نکتارہا پھر بچھے سر کتے لیٹ گیا۔

"وہ کتاب مجھے دے دو۔" میں نے اسے چھو کر کر جگایا۔

"وہاں ہے۔" اس نے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

بیگ کے اوپر ہی کتاب رکھی تھی۔ میں وہ لے کر لیٹ گیا۔ عجیب فضول سارومنی ناول تھا۔ کسی بہت ہی بے وقوف مصنف کا لکھا ہوا مگر وقت گزارنے کے لئے اسے پڑھنا ہی پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بیٹھ کر کھڑکی سے باہر تاریک فضاوں میں گھوروں اور سوچوں کے بھنور میں ڈالتا پھوؤں، سو کسی نہ کسی طرح وہ پڑھتا ہی چلا گیا۔ اب ڈبے میں سکون چھایا ہوا تھا۔ بچے والی فیملی بھی شاید سو بچی تھی یا او گھر رہی تھی۔ ستا چھایا ہوا تھا کہ اچانک لگا ڈبے میں قیامت آگئی ہو۔ طیب اتنی ہی زور سے چینا تھا کہ میں ہی نہیں، وہ سب بھی بول کھلا کر اٹھ گئے۔

"کیا بات ہے۔۔۔ طیب۔۔۔ طیب۔۔۔!" میں نے اسے جھنجوڑ دیا۔ وہ آنکھیں بند کئے چیخ رہا تھا۔

قتل کر دیا۔"

میں سنائے میں رہ گیا۔ دوسری جانب کا مرد اور لڑکا بھی اٹھ کر ہمارے قریب آئے تھے اور اس ہنگے کی وجہ جاتنا چاہتے تھے کہ طیب کی بات سن کر حیران ہو گے۔ عورت سراچکائے ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ پچھے بھی اٹھ چکا تھا اور خوفزدہ تھا۔

"پاگل ہو تم..... خواب دیکھا ہے تم....." میں نے ان سب کے چہروں حیرانی دیکھ کر کہا۔ "نمیں..... یہ خواب نہیں تھا۔" طیب نے اپنے لہجے میں وزن پیدا کرنا ہوئے کہا پھر ان لوگوں کی شکلیں دیکھ کر ایک دم چپ ہو گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اسے ایسی باتیں ان لوگوں کے سامنے نہیں کرنا چاہئیں۔ وہ جھینپ گیا پھر کھسیا کر بولا۔ "ہاں..... شاید..... میں خواب دیکھ رہا تھا۔"

"شاید نہیں، یقیناً۔ تم خواب دیکھ رہے تھے۔ تم یہاں ٹرین میں ہو اور سو رہے تھے اور ادھلی میں ہیں۔" میں نے طیب کو گھورتے ہوئے کہا پھر پلاٹ۔ جب کہ دادا بیلی میں ہیں۔" میں نے طیب کو گھورتے ہوئے کہا پھر پلاٹ۔

"آئی ایم سوری!" میں نے ان لوگوں سے معتذرت کی۔ وہ لوگ پلاٹ گئے مگر طیب کے چہرے پر وحشت اور خوف چھاگیا۔ ان لوگوں کے جاتے ہی اس نے سرگوشی کی۔ "ضیاء.....! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ دادا ابو تمہیں بلا رہے تھے اور بار بار کہ رہے تھے، جلدی پہنچو۔ ورنہ کبھی گھر نہیں پہنچ پاؤ گے۔"

"میں اڑنا نہیں جانتا۔" میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔ "جب ٹرین پہنچائے گی تمہیں پہنچوں گا۔"

"اوہ..... ضیاء.....! میں نے خواب میں ان کے قریب اسی بھیڑانا نہیں کیا تھا۔ وہ لچائی ہوئی نگاہوں سے دادا ابو کو دیکھ رہا تھا۔ ایسے جیسے گدھ مرتے ہو۔ آدمی کے مرجانے کا انتظار کرتا ہے۔"

"تم خواب دیکھ رہے تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں! خدا کرے، یہ خواب ہی ہو۔" وہ بڑی بڑیا مگر اس کا خوف کم نہیں ہوا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ تین بیج کربیں منٹ ہوئے تھے۔ اب سفر کم رہ گیا تھا۔ کھڑکی سے باہر دور نظر آتی ہوئی روشنیوں کو دیکھنے لگا جو جگنوں کی طرح ٹھیٹھا

لے جا رہا ہوں۔ اس نے سر لایا اور بولا۔  
”ٹھک سے چلیر..... میر بھی ساتھ چل

ہم گاڑی میں بیٹھے گئے۔ ذاکر انی گاڑی میں ہمارے پیچھے روانہ ہو گیا۔

دادا کو بے حد مکروہی تھی۔ ذا کرٹ جیران تھے کہ وہ تنفس کو کیسے برقرار رکھے ہو۔ ہیں۔ ان کی عمر، حالت اور بیماری ایسی تھی کہ جس میں اکثر حوصلہ بیٹھ جاتا ہے۔ ذا کرٹ کے مطابق ان کے پیہیہڑے زخمی تھے۔ جگر بڑھ چکا تھا۔ خون میں سرخ خلیوں کی تعداد کم ہو چکی تھی۔ ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ بینائی بست کم ہو چکی تھی مگر وہ زندہ تھے۔ ہم نے اپتال میں گزارا۔ میں نے طبیب کو رات گئے گھر بھیج دیا کہ عورتوں کو تسلی دے انسیں ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ وہ کبھی کبھی چونک کر آنکھیں کھولتے اور یوں خلااؤں میں ٹکڑے جیسے ان کے سامنے کوئی منظر نہ ہو۔ میں نے بہت چاہا کہ انہیں اپنی جانب متوجہ کروں انہیں آوازیں دیں۔ بتایا کہ میں آگیا ہوں مگر لگا جیسے انہیں پکھ سنائی ہی نہیں دے رہا ہو۔ اپتال کا یہم ایل او بار بار آکر دیکھتا رہا۔ اس نے ایک سینٹر ذا کرٹ کی ڈیوٹی لگادی تھی۔ بھی بار بار چیک کرتا۔ مجھے اس نے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ میں صبر کر لوں۔ وہ اس حالات میں زندگی کی حد پار کر سکتے ہیں۔

مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا تھا مگر میری خواہش تھی کہ ایک بار دادا ہوش نہ آجائیں۔ مجھے بتا دیں کہ وہ میرا انتظار کیوں کر رہے تھے۔ مجھے بتائیں کہ شالی بیانیں ملے تو انہوں نے کیا کہا تھا۔ آپ کسی گے کہ یہ میری خود غرضی تھی۔ ہاں..... یقیناً تھی۔ ہر آدمی اتنا ہی خود غرض ہوتا ہے۔ رشتے اپنی حیثیت کھو دیتے ہیں۔ اجنبیت اُدیوار آدمی کے جذبوں کو سلا دیتی ہے اور پھر دادا تو اپنی عمر کو پہنچ جکے تھے۔ آدمی کا جو لا بینا بھی دم توڑ رہا ہو تو اس کے وجود میں آخری لمحات برف کی طرح پکھل کر اس نہ ٹھہنڈک کو منجد کر دیتے ہیں۔ وہ ساکت تھے۔ ان کا ہلکا سا تنفس مجھے بے چین کئے ہو۔ میں پورا سگریٹ کا پیکٹ پھونک چکا تھا۔ یہ دن مجھے بالکل ویسا ہی لگ رہا تھا جیسا اس سے قبل میں ان کے ساتھ اپتال میں گزار چکا تھا۔ وہی سناتا..... وہی بے چین اور وہی کچھ انسوںی ہونے کا دھڑکا۔ اپتال میں دھیرے دھیرے سناتا اترنے لگا۔ آواز اُ

معدوم ہو گئیں۔ میرا دم حلق میں آگیا، پسلے بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بالکل ایسا ہی..... یہ اسرار تھا اور اسے ہوتا ہی تھا۔ میں اس کا فنا فتنہ تھا مگر.....

بہر سے آنے والی آہٹ نے سب کچھ ختم کر دیا۔ وہ سناتا، وہ عجیب سی گھنٹن آمیز فضا، وہ دھڑکا، سب یوں ختم ہو گیا جیسے ہوا میں تخلیل ہو گیا ہو۔ بہر سے آتے ہوئے تین مولی کی چلپ میرے قریب آرہی تھی۔ پھر مجھے نرس کی آواز سنائی دی۔

”ان کا پوتا ان کے پاس ہے۔“

”کون.....؟“ یہ مردانہ اور بھاری آواز تھی۔

”بیتہ نہیں، نام نہیں جانتی۔“

پھر دستک سنائی دی۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ بند نہیں تھا۔

آئے۔ ”میں نے سگریٹ فرش پر پھینک کر جوتے سے رگڑتے ہوئے کہا۔

پھر میں حیران رہ گیا۔ میرے سامنے نہ تھی اور اس کے پیچے شالی

..... ”شالی بیا! آپ .....؟“ میں لیک کر آگے بڑھا۔

وہ دھیرے سے مکارے پھر پاٹ کر نرس کو دیکھا۔ نرس چلی گئی۔ میں نے کرسی

گھیٹ کر دادا کے پڑکے قریب کر لی۔ ”میں آپ سے ملنے کو سخت بے چین تھا۔“

"اور پھر بھی فضول خرافات میں رہے رہے۔" ان کے لمحے میں تارا نسکی تھی۔

”کچھ بھی سا جیکر چل رہا تھا۔“ میں خجل ہو گیا۔

"سے کپاڑا، سے۔ وہ عورت بہت مکار ہے۔ مجھے افسوس یہ تھا کہ تم اپک

بے دریں ہے اسی عورت کے تماشا میں اگم ہو کر رہ گئے ہو۔

”میں اصل حقیقت حاصلنا جانتا تھا شکاریا، میرا۔“

”کیا اس شو، سزا عورت تمہرِ حققت سے روشنائی کر سکتی ہے؟“ انہوں

نے نکلا ہے کہ ”دیکھا تو آنکھ مچھا کا کھلا کھلا رہا ہے۔“

سے نہیں کہ تین سال پہلے اپنے کو نہیں بنا دیا۔

شیخ اکبر حنفی کوکتھیں ایڈنگز میں نے تین سال کا تینسٹ دھیر کیا۔

دیگر سخنچار نہ کر سکتے ہیں اسکا اگلا نتیجہ مغلب گما ڈینگ منٹس، دیگر

مکالمہ کا طبقہ من و نک تے گن نگ

میں اسی صورت میں پر بھاری دھمک پیدا رہے ہوئے رہ رہے تھے۔

دل منٹ بعد سالی بیا نے ہاتھ اھا یا پھر بھے دیجھ رہ رہا۔ ہندو مان

جادو گروں کی سرزمیں ہے ضایع بیٹا.....!

"اسرار تو پوری دنیا میں ہیں بابا!" میں نے دھیرے سے کہا۔

"ہاں..... کچھ تو خدا کی تدرست ہے مگر اکثر انسان پستی میں گر کر شعبدے بازی شروع کر دیتا ہے۔ ذرا سالم حاصل کر لے تو کم عمر اسے ہضم نہیں کرنے دیتی اور وہ ادیچھے ہتھکنڈوں پر اتر آتا ہے۔ تمیں پتا ہے..... جب انسان بلندیاں طے کرتا ہے؛ پستی کے فاصلے اس میں خوف بھردیتے ہیں اور یہ خوف بلندی کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے مگر ایسا صرف تبدیل ہوتا ہے جب اس انسان کو اپنے بلندی پر پہنچنے کا غور ہو جائے۔ جو لوگ بے خوف و خطر بے غرض بلندیاں طے کرتے ہیں۔ وہ نگاہ پستی پر نہیں ڈالتے۔ وہ انعام سے بے پرواہ ہو کر آگے بڑھتے ہیں۔ تب ان کے اندر حوصلے ہی حوصلے ہوتے ہیں، خوف جگہ نہیں بنا پاتا۔ دنیا سے مختلف بن جانے کا خط، دوسروں پر دوسروں حاصل کرنے کا گھمنڈ، علم حاصل کر لینے کا غور اس میں حصہ و حوس کے خزانے بھر دیتا ہے۔ تب وہ نہیں سوچتے کہ بلندیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو پستیوں کا خوف بن جاتی ہیں اور دوسری وہ جو تمام عالم کو مظہر بنانا کر ان کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ حوصلے جگدا ہتھیے ہیں جبکہ خوف مر جھادیتا ہے۔"

وہ پتا نہیں کیا کہ رہے تھے اور کیوں کہہ رہے تھے اور ان کی آنکھوں کی سرفی بڑھتی جا رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انہیں کسی پر غصہ ہے۔ بے پناہ غصہ..... اچاک دادا دھیرے سے کراہے، میں اور شالی بابا پونک کران کی طرف متوجہ ہو گئے۔ میں اسی لمحے مجھے خیال آیا کہ بیبا سے اس پتھر اور بر قع پوش عورت کے متعلق استفسار کروں مگر دوسرا ہی لمحے میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی کیونکہ دادا آنکھیں کھولے مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں کوئی تاثر نہ تھا۔

"دادا..... کیسے ہیں آپ.....؟" میں ان پر جھک گیا۔

شالی ببابا نے دادا کی آنکھوں میں دیکھا پھر اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھ دیا۔ چند ہی مانے بعد دادا کی آنکھوں میں پچان پیدا ہو گئی۔ ان کے لب ہلے اور وہ بے۔

"ضایع.....! ضی.....! یا.....!"

"جی دادا.....! میں ہوں..... ضایع.....!"

• "تم نے اتنی دریگاڈی۔" ان کی آنکھیں نم تاک ہو گئیں۔

"دادا! میں آنا چاہتا تھا مگر....."

"اب آگیا ہے یہ....."

شالی ببابا نے میری بات کاٹ دی۔ مجھے احساس ہوا کہ شالی ببابا مجھے کچھ بتانے سے روکنا چاہتے ہیں۔ میں چپ ہو گیا۔ دادا نے چونک کرشالی ببابا کو دیکھا۔  
"آپ..... آپ..... نے کہا تھا، ضایع کو کچھ نہیں ہو گا۔" دادا کی آواز بھر گئی۔ ان کے لمحے میں شکایت تھی۔

"میں نے ٹھیک کہا تھا، آگیا ہے یہ..... اسے کچھ نہیں ہوا۔ سب شعبدے بازی ہے۔ وہ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔" شالی ببابا نے پسلے دھیرے اور نرمی سے کامگر آخری جملہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں کی سرفی پھر بڑھ گئی۔  
میں نے دادا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دھیرے سلایا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں دادا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"اب تم بالکل ٹھیک ہو۔ سو جاؤ تم..... سو جاؤ تم۔" تمیں ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔"

"تمہارے دادا، تمہارے لئے فکر مند تھے۔ وہ انہیں بھی پریشان کر رہی تھی۔"  
شالی ببابا نے باہر آگر کہا اور دادا کے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

"وہ کون ہے شالی ببابا؟ وہ تمیں پریشان کیوں کر رہی ہے؟"

"تم نے ضد کیوں باندھ لی ہے۔ تم ہر ایک سے ٹکر نہیں لے سکتے۔"

"مگر وہ..... وہ سب کو پریشان کر رہی ہے۔" میں نے غصے میں کہا۔ میری آنکھوں میں رابرٹ کا خوفناک روپ اور کانوں میں جینوں کی سکیاں گوئختے لگیں۔

"ان لوگوں کا عمل درست تھا کیا؟" شالی ببابا نے زمی سے پوچھا۔

"کن لوگوں کا؟"

"رابرٹ وغیرہ کا..... معاف کرنا بیٹا.....! میں نے عطا سے کہا تھا کہ اسے یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ٹھیک ہے ببابا.....! لیکن مبشر کا کیا قصور تھا؟ تیا نے کیا کیا تھا؟ نمشی کی بیٹیوں اور تمیں خالہ نے کب نقصان پہنچایا ہے اور پھر بڑی بوا.....؟"

"ضایع..... تم بات کو کچھ نہیں رہے ہو۔ جب تمیں پتہ چلے گا کہ اصل بات

کیا ہے تو..... تو.....؟

”کیا بات ہے بابا؟“

”میٹا! تم نے معصومیت میں ایک بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔“

”کسی غلطی؟“

”وہ زنجیر..... وہ تمہارے یہچہ پڑپکل ہے ضایاء..... اور تم ایک بڑے عذاب

میں گھر گئے ہو۔“

”وہ کون ہے؟“

”میں کروں گا کچھ..... درستہ..... سب ختم ہو جائے گا۔“ وہ بڑی رائے

مجھے یوں لگا ہے وہ عالم غنوگی میں چلے گئے ہوں۔ ان کی آواز گرے کنوں سے  
آتی محسوس ہو رہی تھی۔

”بابا..... بابا..... آپ میرا خوف بردار ہے ہیں۔ مجھے حوصلے کی ضرورت ہے  
اور نہیں.....“ اچانک مجھے اس پھر کا خیال آیا۔ ”بابا! کیا ٹرین کے سفر میں آپ کا  
مجھے یہ بھیجا تھا۔“ اتنا کہ کر میں نے اپنے کوٹ کی اندر ونی جیب میں ہاتھ ڈالا جس میں وہ  
پھر رکھا تھا میرا ہاتھ خالی واپس آگیا۔

”کیا؟“ وہ ایک دم ہر اسال ہو گئے۔

”وہ پھر تھا..... ویسا ہی جیسا.....“ میں نے اپنی ساری جیسیں دیکھ  
ڈالیں اور ساتھ ہی میری نگاہ شالی بیبا کے چہرے پر پڑی۔  
ان کی آنکھیں پھٹی ہوتی تھیں۔ وہ میری پشت پر دادا کے کمرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے کارنگ پیلا ہو چکا تھا۔ یوں لگا ہے انہوں نے میرے پیچھے کو  
خونک چیز کو دیکھ لیا ہے۔ میں جھکنے سے مڑا اور پھر اس سے پسلے کہ میں کچھ کرتا میر  
سر پر جیسے پھاڑ ٹوٹ پڑا۔ میرا ذہن گرے اندھروں میں ڈوبنے لگا اور میں جیسے کسی گمرا  
سرنگ میں گرنے لگا۔ گرتے گرتے میں نے بے پناہ شور کی آوازیں سنیں۔

آخری آواز شالی بیبا کی تھی جو دادا کو پکار رہے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنا  
بند ہوتی آنکھیں کھول کر اور ہاتھ پاؤں چلا کر خود کو سنبھالنا چاہا۔ آنکھیں کھلتے ہی چھ  
روشنی کا جھماکا ہوا۔ سامنے کھڑی بڑی وہی تھی جسے میں نے اور طیب نے پہلی بار ایڈ

والی کوئی میں دیکھا تھا۔

پھر اس بڑی کی نے ایک دم مجھے تھامنا چاہا مگر میں نے دیکھا کہ شالی بابا میرے اور اس کے درمیان آگئے..... اور پھر میں..... اندھروں میں ڈوب گیا۔  
ہوش آیا تو گھر پر تھا۔ زہرہ آپا اور بی جان میرے قریب بیٹھی تھیں۔ گھر کا کوئی  
دوسرے فرد کمرے میں نظر نہیں آ رہا تھا مگر باہر ہست سے لوگوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔  
محض میں سالجہ تھا جیسے سب مل کر کچھ پڑھ رہے ہوں۔ میں نے آنکھیں موند کر باہر کی  
آوازوں پر غور کیا تو میرے بدن میں سنسنی سی پھیل گئی۔ یہ احساس ہوا کہ باہر کافی لوگ  
ہیں اور غالباً آواز بلند قرآن کی تلاوت ہو رہی ہے۔ گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بی جان  
کی نگاہ اب مجھ پر پڑی تھی۔ وہ مجھ پر جھک گئیں۔

”کیا ہے چاند؟“

”بی جان.....! یہ کیسی آوازیں ہیں، کون لوگ آئے ہوئے  
ہیں؟“

”نیایا.....! دادا ہم سے پھر گئے۔“ زہرہ آپا نے ایک دم ہی اپنا سر میرے  
سینے پر رکھ کر روتے ہوئے کہا۔

ایک گمرا ناما میں نے اپنے اندر پھیلتا محسوس کیا۔ عجیب ساخالی پن تھا جیسے صرف  
دادا نہیں ساری دنیا مر گئی ہو۔ کوئی آواز، کوئی حرکت، کوئی ارتعاش زندہ نہ ہو۔ کوئی خیال،  
کوئی سوچ، کوئی تحریک نہ رہی ہو۔ ویرانی، ناما اور خالی پن بڑھتا چلا جا رہا ہو۔ فضا میں  
تک ساکت ہو گئی ہوں۔ ایسا نہیں تھا کہ دادا کی عمر بھی مرنے والی نہیں تھی یا یہ موت  
بالکل ہی غیر متوقع تھی بلکہ ایسا تھا کہ میں کچھ وقت چاہتا تھا۔ تھوڑا سا وقت گروہ مجھے  
نہیں مل سکا۔ میں خود بھی چند لمحے ساکت رہا پھر ذہن میں شور سا بلند ہوا۔ ساری آوازیں  
زندہ ہو گئیں۔ زہرہ آپا رو رہی تھیں۔ باہر سے قرآن خوانی کی آوازیں آری تھیں۔  
ندھوں کی چاپ، لوگوں کی سرگوشیاں پھر ایک خیال نے مجھے چونکا دیا۔ ”مجھے کیا ہوا تھا؟“  
یہ خیال الفاظ کی صورت میں بے ارادہ ہی میرے ہونوں پر آگیا۔

”پتا نہیں ضایاء! شالی بیبا تمہیں یہاں لائے تھے اور سنو! انہوں نے تمہیں یہاں  
سے اٹھنے کو منع کیا ہے۔ انہوں نے میری ڈیوٹی لگا دی ہے کہ تم ہوش میں آؤ بھی تو  
تمہیں اس پنگ سے قدم پیچے نہ اتارنے دوں۔ مودہ رات تک لوٹ آئیں گے۔“ تمہیں

کسی بھی حال میں یہاں سے کمیں نہیں جاتا۔ ”

”مگر کیوں.....؟ میرا خیال ہے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ میں الجھ گیا۔

”بیبا! ان کا کہا ماننا ضروری ہے۔ وہ بہت پریشانی میں صرف اتنا کہہ کر گئے ہیں۔“

جان نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ وہ میری رازدار تھیں۔ میں حلاتِ

ساری سنگینی ان سے ڈسک کر کچا تھا۔ خاص طور پر شالی بابا کے بارے میں ان سے پہلے

بات ہو چکی تھی۔ ایسا کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات بھی تھی جسے میں خود

کا نام تو نہیں دے سکتا مگر پھر بھی وہ کیفیت خوف سے ملتی جلتی ضرور تھی۔ کمیں کہیے

اطمینان کا شانہ بھی ہوتا تھا مگر میں شاید ذہنی حالت پر قابو نہیں پاس کا تھا اس لئے بات واڑ

طور پر محسوس نہیں کرپا رہا تھا۔ بس اتنا احساس ہو چکا تھا کہ کوئی گزبر نہیں ہے۔ شاید

جان کو سب کچھ ٹھیک ہو جانے کا احساس بھی ہو۔

دادا کے بارے میں بہر حال مجھے تشویش تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ شالی ببابا مجھے ا

دادا کی میت کو لے کر گھر پہنچنے تھے جبکہ طیب اور منے دادا اسی وقت ہبتال کے لئے گئے

سے نکل چکے تھے۔ گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ محلے کے کچھ لوگوں نے مجھے اندر پہنچا لیا۔

دادا کی میت کو بڑے چپوتے پر رکھوا دیا۔ گھر میں کرام مچا گرگراں کرام میں دادی کی دبی سکیاں کسی کو بھی سنائی نہ دیں۔ وہ خاموش ہو کر رہ گئیں۔ درینہ ساتھی اور رفیق

بے حس و حرکت اور مردہ دیکھنا کیسے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔ مجھے اس کا اندازہ تھا۔

شاید پھر بھی میں کم محسوس کر رہا تھا۔ ان کے چہرے کی زردی تو مجھے ہبتال میں بھی؛

آرہی تھی۔ اب جانے کیا حال ہو گا۔ میں ان کے پاس جانا، انہیں تسلی دینا چاہتا تھا مگر با

بابا کے عجیب و غریب حکم نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔

میں بی جان سے تفصیل پوچھنا چاہتا تھا مگر زہرہ آپا میری پیٹ سے گلی بیٹھی تھیں

انہوں نے میرے لئے اور نجی جوں بھی وہیں بیٹھے بیٹھے نکلا تھا اور محبت سے لبریز نہیں۔

مجھ پر گاڑے اب مجھے جوں پی لینے کی ہدایت کر رہی تھیں۔

”آپ کب آئیں زہرہ آپا؟“

”ابھی کچھ ہی دیر پسلے پہنچے ہیں۔ رات ہی منے دادا نے فون کر دیا تھا۔ اتفاق۔“

رات والی گاڑی بھی مل گئی۔ طاہر بھی آئے ہیں اور ناصر چاہی۔“

”طیب کہاں ہے؟“

”وہ باہر ہے۔ دادا کو ابھی دنیا نہیں گیا ہے۔ شالی ببابا نے روکنے کو کھاتھا۔ وہ آئیں گے تو انہیں دنیا نہیں گیا۔“

یہ سن کر مجھے اتنی تسلی ضروری ہو گئی کہ میں دادا کو کاندھا دے سکوں گا۔ یقیناً شالی ببابا مجھے اس پاندی سے نجات دے دیں گے پھر اچانک ہی مجھے وہ آخری میں یاد آگیا۔ نہیں میرے اندر ہمیرے میں ڈوبتے ذہن نے محفوظ کر لیا تھا۔ ہاں! وہ وہی تھی۔ وہی حسین و جمیل اور بلاکی سارہ لڑکی جسے ہم پہلی لگاہ میں ایسا کی بیٹی سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ میری پشت پر تھی اور میرے سر پر کسی نے زور دار دار کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے سر کا پچھلا حصہ سملایا۔ وہاں گومڑ پڑا ہوا تھا۔

”کیا اس لڑکی نے مجھ پر حملہ کیا تھا؟“ تیزی سے سوال گونجا مگر پھر یہ بھی یاد آگیا کہ شالی ببابا نے جب دہشت زدہ لگاؤں سے میرے پیچھے دیکھا تھا تب وہ دادا کو پکار رہے تھے۔ مگر وہ انہیں کیوں پکار رہے تھے؟ کیوں کہ دادا تو میرے علم کے مطابق کمرے میں بیٹہ پر نیم بے ہوشی کی حالت میں تھے پھر جب حملہ اور نے مجھے تارے دکھادیئے تھے تب میں نے پلٹ کر دیکھا اور اسے اپنے سامنے پایا تھا۔ اس نے تھامنے کی کوشش کی تو شالی ببابا درمیان میں آگئے تھے۔ ”کیا ہوا تھا وہ سب کچھ؟ وہ تھی تو اب کہاں ہے؟ وہ تھی کون؟ شالی ببابا نے دادا کو بھلا کیوں پکارا تھا، وہ کب کسی کی مدد کرنے کے قابل تھے؟“

میرا سر پچکرانے لگا۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی الگیوں سے دونوں کن پیاں دبائیں۔ بی جان مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ بول انھیں۔

”ضیاء.....! چندا.....! تم کچھ نہ سوچو۔ سب خیریت ہے۔ دادا کو تو جانا ہی تھا۔ اب اتنا بوجھا آدمی جوان بچوں کو کندھا دے کر کب مضبوط رہتا ہے کہ زیادہ بھی لے۔ وہ تو پھر ہمت والے تھے۔ میری تحسین مجھے نچوڑ گئی۔ ان کے تو جوان کڑیل بیٹھے تھے جنہیں کاندھا بھی دیا تھا انہوں نے۔ غم آدھا کرو رہتا ہے آدمی کو۔ حوصلے تو جوان بچوں کے وجود سے ہی جوان رہتے ہیں بیٹا۔ جوان اولاد مٹی میں ملا کر بھلا حوصلے کب سینٹے رہ سکتا ہے آدمی۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ اب گھر میں تم ہی رہ گئے۔ شجاع اور رضا تو یہاں نہیں ہیں۔ تھماری امال، منی وادی اور ہم تھمارے مل پر ہی جیتے رہے سکتے ہیں۔“

انہوں نے بوڑھی اور دھنلی آنکھوں میں آئے گد لے پانی کو دوپٹے کے پلو میں جذب کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کے ”ہم“ کہنے پر مجھے پہلے فرحت کا پھر خالہ بھی کا خیال

”لبی جان! خالہ بی اور فرحت کیسی ہیں؟“

”آل.....! ہاں.....!“ ان کی بھی اور دھنڈی آنکھوں میں لمحہ بھر کو کہیں ستارہ سا چپکا۔ ”مُوت! ہاں وہ غم سے تو نہ عالہ ہے گراہ سے پسلے تو بہت سی ہوئی تھی۔ اب بھی ہراساں ہے۔ میں اسے بتاتو آؤں کہ تم ہوش میں آگئے ہو۔ تین چار مرتبہ چکر لگا پچکی ہے۔“ لبی جان یہ کہہ کر اٹھ گئیں۔

زہرہ آپا مجت پاش نگاہوں سے مجھے سکے جاری تھی مگر ان کی آنکھوں میں نمی اب بھی تھی۔

مجھے میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی مگر اٹھنا ضروری تھا۔ میں دادا کا آخری دیدار کرنا چاہتا تھا۔ زہرہ آپا نے مجھے سارا دیا۔ میرے سر میں دھماکے سے ہونے لگے۔ آنکھوں کے آگے زرد رنگ ناپنے لگا مگر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا شال بیا ہیں؟“ میں نے دھیرے سے پوچھا۔ لگ رہا تھا جیسے زور سے بولا تو سر ایک زور دار دھماکے سے پھٹ جائے گا۔

”نہیں! کہیں گئے ہیں اور کہہ گئے ہیں کہ ان کا انتفار کیا جائے۔“

میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا باہر نکل آیا۔ بڑے برآمدے میں سناثا چھا گیا۔ سب سر اٹھا کر یا پلٹ کر مجھے دیکھنے لگے۔ آنکن کے بیچوں بیچ دادا کی میت رکھی تھی۔ برآمدے میں لوگ دریوں پر بیٹھے قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف تھے۔ طاہر بھائی اور ناصر بھائی کے علاوہ خاندان کے دوسرے لوگ بھی مختلف انتظامات میں لگے تھے۔ گھری خاموشی اور افسردوگی میں لپی یہ مصروفیات، یہ بھاگ دوڑ، دل میں کائنے سے ہجھاری تھی۔ امال باورچی خانے کے قریب کھڑی تھیں۔ بڑے حکیم صاحب کے بخملے بیٹھے کے گھر سے آئے ہوئے لوگ مجھے مال کے قریب کھڑے پہنچنے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی امال تیز قدموں سے میرے قریب آگئیں۔ وہ لوگ جواب تک کافی روچکے تھے، جن کی سرخ اور سوچی ہوئی آنکھوں میں اب ایک بے نام سی خاموش اداسی ٹھہر چکی تھی؛ وہ سب مجھے دیکھ کر چونک اٹھتے تھے۔

منے دادا جو ایک طرف نہ عالہ سے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خود کو سنبھالتے ہوئے میرے قریب آگئے۔ زہرہ آپا نے مجھے منے دادا کے قریب چھوڑ دیا۔ انہوں نے

مجھے تھام لیا۔ میرے قدم دادا کی میت کی طرف اٹھ رہے تھے اور طوفان دل میں۔ باوجود کوشش کے میں منے دادا سے ایک لفظ بھی تعزیت کانہ کہہ سکا۔ میرے طلق میں جیسے گولہ سانکا ہوا تھا اور یہ گول نہیں تھا۔

”ضیاء! آج تو میں بھی یتیم ہو گیا“ منے دادا کی بھرا تی ہوئی آواز نے مجھے لرزادیا۔ ایسی بے بی اور ایسی بے چارگی میں نے لوگوں کے چروں پر دیکھی تو تھی مگر سنی نہیں تھی۔ اس لرزتی کا نتیجہ آواز نے میری ساعت میں خراشیں ڈال دیں، میرے طلق میں پھنسا گولہ ایک سکلی کے ساتھ ہی کہیں تخلیل ہو گیا اور بے اختیار میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ میں پاہا کی موت پر بھی اتنا نہیں رویا تھا، شاید اس لئے کہ ان کے اور میرے درمیان جو رشتہ تھا اس کی ساری حدود ان کے سر در رویے نے نگل لی تھی بلکہ جی بات تو یہ ہے کہ مجھے انجنانا سا اطمینان ہوا تھا کہ اب امال سکون سے میرے پاس سو سکیں گی، پیارہ انہوں نے دیا تھا نہ انسیں ملا مگر دادا.....! انہوں نے مجھے جو پیار، جذبوں کی جو حدود اور رشتتوں کا جو تقدس دیا تھا، وہ آج آنسوؤں کی شکل میں اپنی موجودگی کا احساس اور میرے ایکی رہ جانے کا خوف دلا رہا تھا۔

دور بیٹھے یا کھڑے لوگ سوت کر میرے قریب آگئے تھے۔ میری نگاہیں دادا کے وجود پر جی تھیں، مجھے یہاں سے ان کا چڑھہ تو دھائی نہیں دے رہا تھا مگر سفید کفن میں لپٹا لاغر سا وجود وہیں سے میرے دل کو لرزائے دے رہا تھا۔ یہ نہیں ہے کہ مجھے میں ضبط کا یارانہ تھا یا میں عورتوں کی سی غمزدہ کیفیت کا شکار تھا، نہیں میرے تمام آنسو میرے اندر، میرے دل پر گر رہے تھے۔ میری آنکھیں خٹک تھیں، زلزلے اندر آرہے تھے۔ چرے پر سنگلاتی کا احساس مجھے پوری شدت سے تھا اس لئے کہ میں اس کی کوشش میں بھی تھا۔ میں اندر سے دھھوں میں منقسم تھا۔ ایک وہ جو دادا کی جدائی پر بچھاؤں کھانے کو چھل رہا تھا، میرے اندر طوفان اٹھا رہا تھا اور دوسرا وہ جو مجھے مضبوط، جوان اور صابر مرد ہونے کا احساس کچکے دے کر لگا رہا تھا۔

دادا کے چرے پر بلا کا سکون تھا اور ان کے چہرے پر چھلے اس سکون کی لمروں نے بھیزے آنکھوں میں اتر کر میرے اندر کے تمام طوفان کو مجدد کر دیا۔ ایک دم اندر سناثا چھا گیا مگر باہر لوگوں کی سکیلیاں گوئی بیکیں۔ سب جانتے تھے کہ میں تب سے اب تک بے ہوش تھا۔ اب دادا کی صورت دیکھ کر وہ میرے زد عمل، سے ناواقف تھے مگر شاید میرے

غم کو راہ دکھارہے تھے۔ میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔ منے دادا کا وہ ہاتھ کانپ رہا تھا جس نے میرا بازو تھام رکھا تھا۔ میں نے ہلکے سے انہیں تھکی دی۔

طیب جانے کمال تھا، لپک کر میرے قریب آگیا۔ میں نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھا، وہ بچوں کی طرح منہ بسور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور دکھ دونوں بلکروں لے رہے تھے۔ میں نے نگاہ پھر دادا کے چہرے پر جمادی۔ میں انہیں دیکھتا رہنا چاہتا تھا۔ ان کے چہرے پر پھیلے سکون نے مجھے ہلاک پھلکا کر دیا تھا۔ اب میرے اندر غم نہیں، سناتا تھا۔ طوفان نہیں، سکون تھا۔ عجیب سا خوف ناک سکون، وہ خاموشی جو قبرستانوں میں جاکر محسوس ہوتی ہے، مجھے یہاں محسوس ہو رہی تھی جالانکہ لوگوں نے مجھے خاموش دیکھ کر پھر اپنی جمیں سنبھال لی تھیں، کسی ہنگامے یا غم کے طوفان اٹھنے کے منتظر لوگ میرے رد عمل سے بایوس ہو کر دوبارہ سیپارے پڑھنے میں محو ہو چکے تھے۔ وہ بھاگ دوڑ جواب سے پہلے ہتم پچھی تھی، پھر شروع ہو گئی۔ اماں جن کی آنکھیں آنسوؤں سے اچانک بھر گئی تھیں، وہ انہیں دوپتے سے رگڑ کر صاف کر پچھی تھیں۔

پھر کسی نے آواز لگائی۔ ”کلمہ طیبہ پڑھو، دولا اٹھاؤ!“ ایک شور اٹھا، رونے اور کلمہ پڑھنے کا۔ عورتوں کی سیکیوں کا، قدموں کی چاپ ابھری اور گھر میں کرام مج گیا۔ ”شالی بیا آگئے؟“

☆-----☆-----☆

بس یہ آخری جملہ مجھے یاد رہ گیا۔ میرے سر کی چوٹ کالنگری تھی، جس نے مجھے ہلاک کر دیا تھا۔ میں جنازے کے ساتھ جانے کے قابل نہیں تھا۔ ذرا سی حرکت مجھے دکھ میں بنتا کر دیتی تھی۔ منے دادا، اماں اور خود شالی بیانے مجھے روک دیا۔ شالی بیا مجھے سے کہ گئے کہ میں اپنے کمرے میں رہوں، باہر نہ نکلوں، وہ واپس آرہے ہیں۔ طیب نے مجھے کمرے تک پہنچا دیا۔ میں دادی سے بھی نہ مل سکا۔

شالی بیا کے اس جملے میں کہ میں کمرے سے باہر نہ نکلوں، بدایت نہیں تنبیہ تھی۔ کم از کم میں نے یہی محسوس کیا تھا۔ عصمت آپا میرے پاس آگئیں۔ مجھے پا تھا کہ اس بار زہرہ آپا یکوں نہیں آئیں۔ انہیں یقیناً غشی کے دورے پر رہے ہوں گے، ان کے ہاتھ پیروں کی جان نکل چکی ہوگی۔ ممکن تھا کہ ان میں ہنے جلنے کی بھی سکت نہ ہو۔ عصمت آپا وہی سپاٹ چہرے لئے میرے سرانے آبیٹھیں۔ مجھے پہلی مرتبہ بے حسی کی

افادیت کا احساس ہوا۔

مجھے نہیں پتا تھا کہ اتنا بہت سا وقت کیسے گزر گیا۔ میری آنکھ گھر میں بستے دہمیوں کی چاپ اور سرگوشیوں سے کھل گئی تھی۔ لوگ قبرستان سے واپس آگئے تھے۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ باہر روشنی نظر آرہی تھی مگر کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ میں نے نشے کی کرٹش کی، اچانک مجھے اپنے کندھے پر کسی کے زرم ہاتھ کا لس محسوس ہوا۔ کسی نے دھیما سا دباؤ ڈالا تھا۔ میں نے چونک کر دیکھا۔ وہاں ایک ہیولا سا نظر آیا۔ یہ کسی عورت کا ہیولا تھا۔ میں سمجھا عصمت آپا ہیں۔

”عصمت آپا! شالی بیا آگئے؟“ میں نے دھیرے سے پوچھا۔  
”نمیں! وہ نہیں آئیں گے۔“ ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ ”تم ان کا انتظار مت کرو میں.....!“

”اگک..... کون ہو تم؟“ میں باوجود تکلیف کے اٹھنے کی بھروسہ کو کوشش کرنے لگا  
مگر اس کے ہاتھ کا بلکا سا دباؤ کسی پہاڑ کا سابو جھ محسوس ہوا۔  
”زیوسا!“ اس کا لمحہ منداک تھا۔

میری ساعت میں جیسے بم سا پھٹا ہو۔ وہ جس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ وہ جوان تمام حادثوں، ساخنوں اور اموات کی ذمے دار تھی، وہ جسے دیکھنے کو میں بے چین تھا۔ وہ میرے بالکل قریب بیٹھی تھی۔ ”زیوسا!“ میرے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

”ہاں.....!“ اور میں صرف یہ بتانے کے لئے آئی ہوں کہ میں تمہیں تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتی۔ نہ تکلیف دتا چاہتی ہوں۔ تم بھی ایسی کوئی کوشش نہ کرو کہ کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ۔ میں ہر طرح سے تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں۔ ضیاء! تم میری بات سمجھ رہے ہو ناں!“

”تم کو اس کر رہی ہو۔“ غصے نے میرے مردہ ہوتے جسم میں جیسے بے پناہ حرارت بھر دی تھی۔ ”تم نے ہی مجھے اس حال میں پہنچا ہے، تم ہی ان تمام اموات کا سبب ہو۔ تم ہم سب کو ہر اسال کر رہی ہو اور..... اور کہتی ہو کہ تم میری مدد کرنا چاہتی ہو۔ مجھے تکلیف میں نہیں دیکھنا چاہتیں۔“

”میں..... میں نے تمہیں کوئی تکلیف نہیں دی ہے ضیاء.....! وہ ..... وہ تو ایں ہے۔ ایں جو قابل نفرت ہے، اس نے ایک کھیل کھیلا اور جیت گئی۔ میں اس

کے پسلے ہوا تھا اور ابھی تو دلی آیا ہی نہیں ہے۔ ہم گھر کیے پہنچیں گے؟ وہ دیکھو، لوگ  
دلی کے اشیش پر اترنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ یہ بچھ..... یہ بچھ دیکھو، وہی جس نے  
وہ پھر لا کر دیا تھا۔ ضیاء..... ہوش میں آؤ۔ شاید تم نے بھی میری ہی طرح کوئی خواب  
دیکھا ہے۔“

”نیاب..... کیا میں سو گیا تھا؟“

”نیں..... سوئے تو نہیں تھے۔“ وہ الجھن آمیز لجھے میں بولا۔ ”ابھی  
ابھی..... تو تم ٹھیک تھے جب دلی کا اشیش قریب تھا اور دیکھو، ہم اب اشیش کی حدود  
میں داخل ہو رہے ہیں۔“

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ٹرین پلیٹ فارم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ قلی اور  
لوگوں کو روپیوں کرنے آئے والے ہماری کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے۔  
”آپی..... آپی۔“

اچانک میری کھڑکی میں کھڑا بچھ چینا۔ یہ وہی بچھ تھا جس نے کسی عورت سے  
شالی بابا والے پھر جیسا ایک سیاہ پھر لا کر مجھے دیا تھا۔ وہ اشیش پر کسی کو دیکھ کر جیخ رہا تھا۔  
مجھے یاد آیا کہ ابھی ابھی میں نے بو خواب دیکھا تھا (قول طیب کے)، میں تو اب بھی اسے  
خواب ملنے کو تیار نہیں ہوں) اس میں، شالی بابا کسی بھی پھر کو کسی کے باہت مجھ نک بھینے  
سے انکار کر کچکے ہیں۔ بے اختیار میرا باہت کوٹ کی اندر ورنی جیب میں رینگ گیا۔ وہ پھر  
موجود تھا۔ میں نے اسے نکال لیا۔ ہتھیلی پر رکھ کر غور سے دیکھا۔ وہ بے جان پھر تھا  
اس میں مجھے وہ زندگی نظر نہ آئی جو میں پسلے اور دسرے پھر میں دیکھے چکا تھا۔  
”ضیاء! ہوا کیا تھا؟“ طیب بہت پریشان تھا۔

میں نے خالی غالی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس دوران میں اچانک بے پناہ  
شور شرابا ہو گیا۔ ٹرین اب جھکلے سے رک چکی تھی۔ قلی ڈبے میں گھس آئے تھے۔ کچھ  
اور لوگ بھی تھے جو سامنے والی فیملی کو لینے آئے تھے اور اب ان کا سامان قلی سے نیچے  
اترا رہے تھے۔ اشیش پر ہر شخص جیسے دسرے کو پکار رہا تھا۔

”چلو.....! راستے میں سنالا۔“ طیب نے اپنا اور میرا بیگ الھائیا۔ میں بے حد  
تحکماںت ححسوس کر رہا تھا۔ اٹھا تو لگا جیسے میرا سر چکرا گیا ہو۔ بے اختیار میرا باہت سر کے  
پہنچھے کی طرف گیا۔ وہاں دکھن تھی، وہاں باہت لگتے ہی تنظیف کی ایک لمری داغ سے

سے تمہیں بچانا چاہتی ہوں۔ وہ افریقہ کے تاریک جنگلوں اور وہاں رہنے والے بد صورت  
مردوں سے جادو سیکھ کر، ہر سال دسمبر کی آخری شب ایک نیا کھیل شروع کرتی ہے اور پھر  
اس کھیل کو بر سوں جاری رکھتی ہے۔ اس کا یہ جال اب تک جانے کمال کمال پہنچیل پہا  
ہے۔ پتا نہیں، کتنے لوگ اس کا شکار بننے ہیں اور جانے کون کون اس کا شکار ہونے والا  
ہے۔ اس کھیل کا اہم کردار یہاں..... انڈیا میں و تسلی ممکنہ ہے۔ اسے تلاش کر  
ضیاء اسے تلاش کرو۔“

وہ سیاہ ہیولے کی طرح نہم تاریکی میں میرے سامنے بیٹھی تھی مگر اس کا حسین چہرہ  
میرے سامنے روشن تھا۔ اس کی آب دار آنکھوں میں بے پناہ اپنائیت، محبت اور اپنے  
جانب کھینچ لینے کی کشش تھی۔

”تم.....!“ میں جیختنے والا تھا۔ چینا چاہتا تھا۔ میں نے باہت بڑھا کر اسے دھکانہ  
اور اپنے سامنے سے ہٹانا چاہا کہ اچانک کسی نے مجھے جبنجوار دیا۔

”ضیاء..... ضیاء ہوش میں آؤ ضیاء۔ یہ کیا بد تمیزی ہے۔ کیا کر رہے ہو تم؟“  
آواز طیب کی تھی۔ جھنجلائی اور غصے بھری آواز۔  
پھر یوں لگا جیسے میں سوتے سے اٹھ بیٹھا ہوں۔ ٹرین کے پچکوں، لوگوں کے بولک  
کی آوازیں۔ ٹرین کے انجن کی چھک چھک۔ سب گذشت ہو گئے۔

میں ٹرین میں تھا۔ سامنے والی سیٹ پر بیٹھی فیملی سامان باندھ رہی تھی۔ بچھے میری  
کھڑکی سے باہر جھانک کر شور مچا رہا تھا۔ میں سیٹ پر بیٹھا ہچکوئے کھارہا تھا اور طیب؟  
اب سے پسلے مجھے جبنجوار رہا تھا، جیخ رہا تھا۔ اب سر جھکائے میری آنکھوں میں جھانک  
تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ نہ گھر تھا، نہ میرا کرہ، نہ آنکن میں دادا کی سیٹ تھی  
نہ میرے سامنے زیو سا!

”ضیاء.....!“ طیب میرے قریب بیٹھ گیا۔ ”کیا بات ہے ضیاء؟“  
”طیب.....“ میں بول اٹھا مگر میری آواز خود مجھے ہی اجنبی لگی۔

”ہاں بولو..... کیا بات ہے؟“  
”طیب دادا کا انتقال ہوا تھا، ہم گھر میں تھے، شالی بابا..... زیو سا سب  
تھے۔“

”ضیاء! دادا کے انتقال کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ ان کا انتقال تو تمہارے بھی آتی۔“

لے کر ایڑی تک دوڑ گئی۔ میرے منہ سے سکاری نکلی اور میں حواس بانتہ ہو گیا۔  
”طیب..... یہاں دیکھو..... کیا ہے؟“ میں نے سر کا پچھلا حصہ  
اس کی طرف کر دیا۔

”میرا خیال ہے خوابیدہ کیفیت میں تمہارا سر سیٹ سے نکرا یا ہے۔ گومڑ سا بنا بے  
اور شاید کھال بھی پھٹی ہے۔“ وہ سر کو ٹوٹوں ٹوٹوں کر کہہ رہا تھا اور تکلیف اور حیرت۔  
میرا حالت خراب تھی۔

”وہ خواب نہیں تھا طیب۔“ میں نے سر سراتے ہوئے انداز میں کہا۔  
”گویا دادا تیسری بار مرے تھے۔“ اس نے مصنگہ خیز انداز میں آنکھیں پھیلائے  
پوچھا۔ ”ایک مرتبہ بچ مجھ، دوسری مرتبہ میرے خواب میں وہ اس بھیٹا نما انسان کے  
ہاتھوں قتل ہوئے تھے اور اب تیسری مرتبہ..... چلو یار ورنہ یہ ٹرین ہمیں واپس بھی  
لے جائے گی۔“

اب ڈبا خالی ہو چکا تھا مگر باہر اب بھی بھگدڑ پچی ہوئی تھی۔ اسے سب کچھ بتائے  
بغیر کوئی بات کرنا فضول ہی تھا۔ میں اس کا سارا لے کر ٹرین سے نیچے اتر آیا۔  
صحیح کے دس نجخ چکے تھے۔ ہم اشیش سے اتر کر سیدھے تانگ اشینہ کی طرف چل  
پڑے۔ یہاں سے گھر کا راستہ کافی تھا۔ یہی سوچ کر کہ راستے میں طیب کو تفصیل سے  
تباہ کا۔ ہم اشیش سے باہر آگئے۔ اس زمانے میں بھبھی میں کچھ یتکیاں تھیں مگر دل  
میں سائیکل رکشا یا تاکے چلا کرتے تھے اور سائیکل رکشا کو آدمی کھینچا کرتے تھے۔ میں نے  
کبھی سائیکل رکشا میں بیٹھنا پسند نہیں کیا اور یہاں سے گھر تک کے لئے تو کوئی بھی تیار نہ  
ہوتا کہ گھر بہت دور تھا۔ ہم نے جلدی تانگا لے لیا۔

”اب بتاؤ! کیا ہوا تھا تمہیں؟ کیا تم بیٹھے بیٹھے اور کھلی آنکھوں بھی سونے کے عادی  
ہو؟“

مجھ سے زیادہ بے چین طیب تھا۔ اب اس میں کچھ برداری اور سمجھیگی آئی  
تھی۔ وہ میری کیفیت دیکھ کر جان چکا تھا کہ معاملہ کافی گھبیرہ ہے۔ میں نے دھیرے دھیرے  
اسے سب کچھ بتایا کہ ہم دلی اتر کر گھر پہنچتے تھے۔ وہاں دادا زندہ تھے۔ بعد میں مرے اور  
پھر زیوسا سے ملاقات۔ زیوسا کی باتیں، وتلا کمیک کے بارے میں شکوک۔ ایں کے  
بارے میں تفصیل۔ یہ سب اس نے بہت سمجھیگی سے سنے۔

”میں تو سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنا لباعرصہ میں نے لمبوں کے ایک خواب میں بتا  
دیا۔“

”بینا جی! تم جن چکروں میں بڑے چکے ہو۔ ان میں سب کچھ ممکن ہے۔“

طیب نے اسی سمجھیگی سے جواب دیا پھر چند لمحے کچھ سوچتا رہا، اچانک وہ چونک کر  
بھری طرف متوجہ ہو گیا۔

”ضیاء! ان تمام واقعات کا کیا جواز ہے؟ یہ سب خواب ہے یا حقیقت؟ یہ تو میں  
نہیں جانتا مگر ایک بات کا مجھے اب تھیں ہوتا جا رہا ہے کہ دادا کی موت نارمل نہیں تھی۔  
میں نے بھی اسیں خواب میں قتل ہوتے دیکھا۔ تم نے اسیں دوسری بار مرتے دیکھا  
حالانکہ وہ مرچکے ہیں۔ کہ سکتے ہو کہ خواب صرف میں نے دیکھا تھا کہ دادا مرے پڑے  
تھے اور وہ بھیٹا نما انسان پاس بیٹھا تھا۔ ممکن ہے، اس بھیٹیے نما انسان کے خوف نے  
مجھے خواب دکھایا ہو مگر تم..... نے جس تسلیم اور جس انداز میں سب کچھ دیکھا پھر  
تمہارے سر پر چوٹ کا نشان، تمہاری حالت..... یہ سب..... ضیاء! میری بات لکھ  
کر رکھ لو۔ دادا نارمل انداز میں نہیں مرے۔ کوئی چکر ہے..... دعا کرو گھر میں سب  
خیریت ہو۔“

طیب کی بات میں وزن تھا۔ میں اب بھی گزرے ہوئے لمبوں کو خواب سمجھنے پر  
تیار نہ تھا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ دادا کی موت کو یاد کیا تو یاد آگیا کہ اس وقت بھی میں  
صاحب فراش ہو گیا تھا۔ ایک عرصہ یہاں رہا تھا اور اس وقت بھی تھوڑے سے اختلاف کے  
ساتھ وہی کچھ ہوا تھا۔ ول نے بے اختیار دعا مانگی کہ گھر میں خیریت ہو۔ میں نے اضطرابی  
کیفیت میں تانگے والے کوڈاں دیا کہ وہ تیز چلائے۔

”ضیاء.....! زیوسا کیسی تھی؟ کیا وہی جو ایسا کے گھر.....؟“

”نہیں!“ میں نے بات کاٹ دی۔ وہ قطعی مختلف تھی مگر بے حد پر کشش اور  
حسم۔ اس کا انداز ہمدردانہ تھا۔“

”ویسے یا! تم آدمی دوسری قسم کے ہو، اگر میرے آگے پیچے اتنا حسن ہوتا تو  
میں..... میں آسمانوں میں ازتا۔“

”زیوسا دوسری ہی کمائی نہاری تھی۔“

”میں سب کی سب کمائیاں سن کر ہر ایک پر ایمان لے آیا کرتا۔“ وہ اپنی ہی رو

میں بجا جا رہا تھا۔

”اس میں..... اس میں عجیب سانسرا پن تھا طیب اور..... اور.....

میری عجیب سی کیفیت ہو گئی، بے وجہ اس مکری کا خیال آگیا جسے میں نے کافی دنوں

صدو ٹھی میں چھپائے رکھا تھا۔

”بس اسی سحرے پن پر تو جان لٹا دیتا میں۔“

”بکواس بند کرو۔“ میں نے اسے جھڑک دیا۔

”باکل اسی انداز میں تم نے زیوسا کو بھی ڈالنا تھا غیباء! یار تمہارا اخلاق، خراب ہے۔ کم از کم عورت سے بات کرتے ہوئے تو.....“

”عورت.....“ مجھے تو نہیں لگا کہ وہ عورت ہے۔ یہ تو میں تمہیں بتانا ہوں طیب کہ اب جب میں زیوسا کا تصور بھی کرتا ہوں تو وہ سخری مکڑی میرے دامن اپنی باریک مگر چھپتی ہوئی بہت سی ٹانگوں سے رینگنے لگتی ہے۔“

”لا حولا ولا.....! بہت ہی بد ذوق ہو یار۔ میں تو کہتا ہوں کہ اگر کوئی زہنگی بھی خوبصورت عورت کا روپ میں آئے تو تمہیں اس سے اخلاق اور محبت بات کرنا چاہئے۔“ طیب تھے سے اکھڑ پکا تھا۔ ”ایک مرتبہ ایک چیل میٹھے سے مکرا تھی۔ میں نے لفت نہیں کرائی مگر جیسے ہی اس نے ایک حسین عورت کا روپ دھی میں اس پر فریغتہ ہو گیا۔ اب وہ اگر مجھے سے ملنے آتی ہے اور میں.....“

”تم چپ نہیں رہ سکتے؟“ میں جلا گیا۔

”رہ سکتا ہوں مگر تم اپنے ذہن کو ان لمحوں کی قید سے آزاد کر لو تو.....“ نے انتہائی سمجھی گی سے کہا۔

”ہوں!“ میں نے گمراہیں لے کر چاروں طرف دیکھا۔ اب گھر زیادہ دور نہ تھا۔ ”چاہیں نہیں، شالی بیانے کیے ملاقات ہو گی؟“ میں زیر لب بڑی رایات

اپنائک تاگارک گیا۔ بچ سڑک پر۔ ہمارے ارد گرد ستائیا تھا حالانکہ یہ کوئی سڑک نہیں تھی۔ میں چونک اٹھل۔ ایسا کیوں تھا؟ یہ تو مصروف سڑک تھی۔ یہاں دامیں طرف جا کر اگر ہم گلی میں مڑپکے ہوتے تب تو ٹھیک تھا کہ ذیلی گلیاں کسی بھی دسماں ہو سکتی ہیں۔ ویسے بھی یہ وقت ایسا تھا جب لوگ اپنے کام پر جا چکے ہیں۔ تھے مگر یہ سڑک..... طیب بھی تالگے کے رکنے پر حیران تھا۔

”کیا بات ہے بھیا؟“ اس نے پلٹ کرتا تھا۔ والے سے کہا۔ میں بھی اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے پہلی بار تالگے والے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ایک سیاہ چادر کو اپنے گرد پیش ہوئے تھا۔ سر پر اس نے غالباً اونچی نوٹی پہن رکھی تھی اور چادر کو اس نوٹی کے اوپر ڈال کر اپنے گرد پیش رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ اس چوڑی چادر میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ سہانت تھا۔ اس کا رخ اپنے سامنے کی طرف تھا جبکہ ہم صرف اس کی پشت دیکھ سکتے تھے۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں یار! کیا گھوڑا اڑ گیا؟“ طیب نے ذرا سا اچک کر اس کا چڑھا دیکھنا چاہا۔

”میں اسی لمحے وہ دھیرے سے مڑا۔ میں اچھل پڑا۔ وہ شالی بیانے تھے۔“

”شالی بیا! آپ۔“

”ہاں بیٹا! میں۔ یہاں تم اتر کر پیدل گھر چلے جاؤ۔“

”لیکن شالی بیا.....!“ میں نے اضطرابی کیفیت میں بولنا شروع کر دیا۔ ”میں تو آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہوں۔ میں سخت پریشانی میں ہوں۔“

”میں جانتا ہوں۔ ساری کمائی سن چکا ہوں۔ زیوسا ٹھیک کرتی ہے۔ وہ پتھر مجھے دے دو۔ وہ میں نے نہیں بھیجا تھا۔“ تم نے جو اذیت کالی ہے وہ پتھری اس کا سبب ہے ورنہ میں نے تو ایسا ہمارا کھجخن دیا تھا کہ سفر سکون سے کٹ جاتا۔“

”یہ..... یہ شالی بیا ہیں؟“ طیب اب تک غالباً حیرت سے ساکت تھا۔

”ہاں!“ میں نے پلٹ کر کہا اور شالی بیا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسی دوران میں، میں نے وہ پتھر نکال کر شالی بیا کو دے دیا۔ ان کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھتے ہی وہ پتھر پانی ہو گیا۔ میں اور طیب حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”یہ لو۔“ شالی بیانے ہرے رنگ کے کپڑے میں لپٹا ایک تعویذ مجھے دے دیا۔“

اس تعویذ میں چاندی کی زنجیر پڑی تھی۔ ”اسے مگلے میں پہن لو۔“

میں نے وہ ان سے لے لیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں شالی بیا کی آواز آئی۔ لجھ گھبرا یا ہوا تھا۔ ”جلدی کرو ضیاء“

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”وہ دیکھو!“ طیب چینا۔ وہ سامنے سڑک کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

ساتھ بھاگ رہا تھا پھر اس کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ میرا سانس پھولنے لگا۔ شالی بابا کے آخری جملوں سے لگتا تھا جیسے اب وہ نہیں آئیں گے بلکہ جو کچھ سننا ہوا گا وہ مجھے شایستا پڑے گا۔ تاگہ میری نگاہوں سے او جھل ہو گیا۔ طیب دونوں اپنے کیس اٹھائے میری طرف بڑھ رہا تھا۔

”یار نیاۓ.....! ابھی ابھی مجھے یہ خیال آیا ہے کہ..... کہ یہ شالی بیا۔.....  
یہ بھی کہیں اس زیوسا کا کوئی چکر یا تماثلہ ہوں۔ جس نے محض اس لئے انہیں بھیجا ہو کہ تم زیوسا کی طرف سے دل صاف کرو۔“

طیب نے مجھے چونکا دیا تھا۔ میرے دماغ میں سننا ہٹ ہونے لگی۔ ”ہاں.....  
آل.....!“

”یہ کپڑو اور جلدی انکل لو اس سڑک سے۔ اگر پھر ایسا یہی کوڈ مگس کو لے آئی تو کچا چاجائے گی۔“ طیب نے میرا اپنی کیس آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔  
ہم پیدل گھر کی طرف چل پڑے۔ میں سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ میں نے اچانک طیب سے پوچھا۔ وہ اس غیر متوقع اور بہم سوال کے لئے تیار نہ تھا۔ گھم گیا۔

”کیا کیسے پتا چلا؟“

”یہی کہ یہ..... شالی بیا نہیں تھے۔“

”نہیں! نہیں.....! میں یہ نہیں کہ رہا تھا یا۔“ تم شالی بیا سے پڑواڑ گے! میں نے تو یونہی ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ اصل میں پتا ہی نہیں چل رہا کہ ہو کیا رہا ہے۔ کیا یہ ”کیا خواب“ زیوسا ہمدرد ہے کہ دشمن یہ..... تاگے والا زیوسا تھا، ایں تھا کہ شالی بیا۔..... ویسے میرا خیال ہے کہ شالی بیا کو اتنا بد اخلاق نہیں ہونا چاہئے۔ بھی گھر تک تو ڈر اپ کرتے۔ ویسے ضیاء..... اب میں بڑی سمجھیگی سے سوچ رہا ہوں کہ مسلط پر بیٹھ کر توبہ کروں۔ پُرساریت سے پناہ مانگوں اور اپنی سیدھی سادی زندگی کی طرف لوٹ جاؤں۔ جہاں موئیکا تھی..... میں تھا اور ہمارے درمیان رنگین تیلیوں کی طرح اڑتے ہوئے لمحے۔“

”ہاں..... طیب..... میں خود بھی ایسا ہی چاہتا ہوں۔ یہ میری جنت ہے،  
اسے مجھے ہی لڑا اور جیتنا ہو گا۔ تم بے وجہ کو دپڑے ہو۔ یہ بھی چجھے ہے کہ پتا نہیں یہ شالی

میری نگاہ سڑک پر پڑی، وہاں ایسا ہی بیٹھی اور ڈگس کے ساتھ بڑے خونخوار انداز میں میری جانب بڑھ رہی تھی۔ میں ان تینوں کو دیکھ کر جیان رہ گیا۔ وہ تینوں مر پچے تھے، میں نے اور طیب نے ان تینوں کو اپنے ہاتھ سے ایسا کی کوئی کوئی کے پچھلے حصے میں دفن کیا تھا۔

”جلدی پہنو۔“ شالی بیا تھے۔

مجھے ہوش آگیا۔ میں نے جلدی سے تعویذ لگے میں ڈال لیا۔ شالا سا چھالیا۔ طیب آنکھیں دونوں ہاتھوں سے ملنے لگا۔ سڑک سنان تھی۔ ہر طرف سکون تھا۔

”وہ..... وہ لوگ.....!“

”کوئی نہیں تھا ضیاء! یہ و تسلما کمیکر کی کار سٹانیاں ہیں۔“ شالی بیا بڑے تمہر ہوئے انداز میں بولے۔ ”جاؤ..... گھر جاؤ۔“

”بابا! یہ زیوسا، ایں اور و تسلما کمیکر.....!“

”میں تم سے جلد ملوں گا ضیاء! لیکن صرف اتنا سمجھو ہو، زیوسا ٹھیک کہتی ہے۔“  
تمہارے رویے کی وجہ سے الجھ جاتی ہے ورنہ واقعی تمہاری مدد کرنا چاہتی ہے۔ تم اپنے رویے میں پچ پیدا کرو۔ تمہیں ہراساں کرنے والی زیوسا نہیں، ایں اور و تسلما ہیں۔“

”مگر بابا.....!“ میں نے کہنا چاہا۔

”اترو جلدی۔ مجھے جانا ہے میں مصروف تھا، اگر مجھے تمہارے بارے میں اس نے نہ بتایا ہوتا تو شاید میں کبھی نہ آتا، میں وہ وظیفہ چھوڑ کر آئی نہیں سکتا تھا۔ میں پھر ملوں گا۔ تم اپنے اندر قوت پیدا کرو۔ خود اعتمادی کو مضبوط کرو۔ تم بے ہمت ہوتے جا رہے ہو اور یہ تمہارے لئے خطرناک ہے۔ خدا کو یاد رکھو ضیاء! وہ بھونے کی چیز نہیں ہے۔ عطا اس انہیں تھا تو پچتارہا اور جب اس نے ہمت ہار دی تو جان ہار بیٹھا۔“

طیب نے اس دوران میں سالانہ تاگے سے اتار لیا تھا۔ میں بھی یونچے اتر آیا۔ شالی بیانے لگا میں ڈھیل کیں، میں مضطرب ہو کر آگے بڑھا۔ ”بابا! میں جاننا چاہتا ہوں۔“

”سب کچھ جان لو گے۔ جو غلطی کرچکے ہو اسے سدھارنا تمہارا ہی کام ہے۔“ خوش قسمتی ہے کہ زیوسا تمہارے ساتھ ہے۔ میں میرنہ میں۔۔۔ اپنے گھر پر ملوں گا۔ جب ہارنے لگو تو وہاں آ جانا۔“

یہ سب کچھ شالی بیا نے جاتے جاتے کہا تھا۔ تاگہ آگے بڑھ رہا تھا اور میں اس کے

بیا تھے کہ نہیں..... بھر حال تم نکل سکتے ہو، میرا خیال ہے کہ وہ جو بھی ہے، جان را ہو گا کہ تم محض میری ہمدردی میں میرے ساتھ ہو۔ آج کنارا کرو گے تو.....

..... کیا مبشر تمہارے ساتھ تھا؟ کیا تھیں خالہ نے تم سے مل کر اس کے خلاف کوئی سازش کی تھی؟ کیا عطا چاچو بھی تمہارے ساتھ تھے۔ کیا مبشر کی بیٹیاں بڑی بڑی بڑی اور..... اور ایسا..... ذہلکس، اینی..... طیب کا الجم سفاک اور کھود را ہو گیا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے جہزے پہنچنے ہوئے تھے۔ اس کی سیاہ گمری آنکھوں میں غصہ تھا، جذبوں کی شدت سرخ ڈورے بن کر آنکھوں میں پھیل گئی تھی۔ میں نے کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب ہم اپنی لگلی میں داخل ہو چکے تھے۔ دھوپ نرم تھی ورنہ شاید اتنی دور پر دل چلتا مشکل ہو جاتا۔

ہم گھر پہنچنے تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ منے دادا اور اماں میرے لئے پریشان تھے، مجھے دیکھتے ہی ان کے چہروں پر بثاشت آگئی۔ منی دادی بھی آئی ہوئی تھیں اور دادی تو مجھے دیکھتے ہی روپڑیں۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ اتنے عرصے کے بعد انہیں دیکھا تھا، ان کے چہرے پر زردی گھنٹی ہوئی تھی ان کا درد گرا نگا۔ اماں اپنے گھر میلو جھیلوں میں لگی رہتی تھیں۔ دادا چاچو اپنی ڈیوٹی میں مت تھے۔ شجاع بھائی اور رضا بھائی بھی باہر تھے۔ عصمت آپا عجیب سی طبیعت کی مالک تھیں، اکیلی اکیلی، خاموش، پتھرائی سی، دادی سے پاتنی کرنے والے اکیلے دادا تھے جو جا چکے تھے شاید اسی لئے منے دادا اور منی دادی یہاں تھیں۔ منی دادی کی حلاںکہ بیٹھے ان سے ان بن رہی مگر آج ان کا رویہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا تھا۔

”اتے دن لگا دیئے۔“ اماں نے شکایت کی۔ ”بھاڑی میں جھونکو ایسی نوکری کو۔ اتنا کچھ تو ہے، ہمیں کون سابقہ میں لے کر جانا ہے۔ حالت دیکھنی ہے اپنی!“ اماں یوں لے چلی گئیں۔ عصمت آپا کے پیار کا وہی انداز تھا، گمری نگاہوں سے لمحہ بھر کو دیکھا اور کچھ دیر بعد چائے کا پیالہ بھر لائیں۔ منے دادا طیب کو ساتھ دیکھ کر خوش تھے۔

”ناصر ٹھیک ہے؟“ منے دادا نے طیب سے پوچھا۔

”جی.....! شاید اگلے ماہ ادھر آتا ہو ان کا۔ اس طرف کا ثور ہے۔“

”اس کی نوکری بھی خانہ بدوشوں جبی ہے۔“ منی دادی بولیں۔ ”ظاہر تو ٹھیک

سب کی خیریت پوچھی جا رہی تھی۔ سب بڑے یہ آمدے میں دھوپ کی جانب نہیں ڈالے، کچھ آنکن میں چھڑکاؤ کئے، ٹھنڈی دریوں پر بیٹھے تھے۔ سب کچھ ٹھیک تھا، لکون تھا مگر میرے اندر عجیب اضطراب تھا۔ ایسا اضطراب جو کہیں جس کے پیچے نہاٹھیں رہا۔ اچانک جیسے اضطراب کا سبب بکھر میں آگیا۔

”اماں! ابی جان اور خالہ بی چلی گئیں؟“ طیب میری بات سن کر چونک اٹھا۔ ”ارے ہاں..... میں بھی تو کہوں اتنے بہت سے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی یہ کیسی ویرانی ہے۔“ وہ بات کرتے ہوئے سوچتا نہیں تھا۔ میں نے فرحت کی کمی محسوس کر کے بی جان کا پوچھا تھا اور وہ..... وہ براہ راست فرحت کا ذکر کر رہا تھا۔ یہ فرحت کا ذکر ہے، یہ تو میں ای جان سکا، اور یہ احساس ہوتے ہی کہ وہ فرحت میں دلچسپی لے رہا تھا، اور لے رہا ہے، میرا دل بیٹھ گیا۔

”تمہیں خالہ بی کا پتا ہے؟“ اماں نے پانداں اپنے قریب سر کاتے ہوئے جواب دیا۔ ”درا جو کہیں نکل کر رہ جائیں۔ پتا نہیں، اس بھاڑی سے گھر کے ایک کمرے میں چھت پر کون سے فانوس لٹکے ہیں جنہیں سارا دن گھورتے گزار دیں تب بھی وقت کھونے کا احساس نہ ہو۔“

”وہ بادوں کے فانوس ہوں گے چجی بی۔“ طیب نے پان کا ٹکڑا ان کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ اماں کے چہرے پر ایک رنگ سا اکر گز گز گیا۔

”اکیلی رہ گئی پہن نا وہ۔“ طیب میرے گھورنے پر بولا۔ ”بھی اکیلے رہ جاتے ہیں۔“ اماں نے سرد آہ کھینچی۔ دادی نکیے لے کر لیٹ سکیں۔

”آپ نے جانے ہی کیوں دیا۔ میں کہہ کر گیا تھا کہ وہاں نہ جائیں۔“ میں نے ماحول کی گیبھر تاکو بڑھنے سے روک دیا۔

”منت کب ہیں وہ۔ اکیلی جانے کو تیار تھیں۔ کہتی تھیں میرا دل ہول رہا ہے۔“ ”بی جان بھی حکم کا غلام بنی رہتی ہیں ان کے سامنے۔ چلو، جانا ہی تھا تو اکیلی چلی

جاتیں ان کے ساتھ، فرحت دہاں کوں سے فانوس لے گی۔ ”طیب نے اماں کا لگایا ہوا پلاں کا مکارا منہ میں رکھتے ہوئے کما اور رکھتے میں سنی انگلیوں کو اپنے سر میں رگڑ لیا۔ ”بہت گندے ہو تم۔“ میں غصے سے بول اٹھا۔

طیب چونک اٹھا۔ اس کے چہرے پر ہی نہیں سب کے چہرے پر حیرت تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ غصے کا بگولا پوری قوت سے اٹھا تھا اور لجے کو غبار آلواد کر گیا تو یہ..... گندی انگلیاں سر میں مل لیں۔“ میں نے بوکھلا کر صفائی پیش کرنے کے انداز میں کما۔

”اوہ..... تو اس میں اتنے غصے کی کیا بات ہے یا۔“ ”اوہ.....!“ منے دادا کھنارے۔ ”یہ بھی جاکر تمہارا انداز تھاطب کافی بگزیری ہے۔“

”چلو بھائی! کھانا کھا لو۔“ عصمت آپا نے آکر اطلاع دی۔ سب سے پہلے طیب کھک لیا۔ منے دادا اسے گھورتے رہ گئے اور میں سوچنے لگا کہ مجھے غصہ فرحت کے بارے میں طیب کے انداز پر آیا تھا یا واقعی گندی انگلیاں سر میں رگڑنے پر۔

”اماں! ان کا وہاں جانا خطرناک تھا۔“ میں نے چپکے سے کان میں سرگوش کی۔

”بھی کیا کروں میں۔ بہتر اکامگر..... اب گلے میں توجھوں نے رہی۔“ اماں نے جھنجلا کر جواب دیا اور تکیہ منے دادا کی طرف بڑھا دیا۔ منے دادا نے بچہ منی دادی کو دیا اور خود اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے لگا جیسے انہوں نے مجھے ہلکا سا اشارہ کیا ہے۔ سب میری ہی طرف متوجہ تھے اس لئے میں لجھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ منے دادا دادا والے کمرے میں جا رہے تھے، میری لگا ہیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں، دروازے پر۔“ رکے اور انہوں پلٹ کر مجھے دیکھا، تصدیق ہو گئی کہ وہ میرا شکن نہیں تھا۔ ادھر عصمت آپا طیب اور اماں سے لڑ رہی تھیں کہ انہوں نے پان کیوں کھایا جب وہ کھانا لگا چکی ہیں۔ میں ان لوگوں کی توجہ بنتے دیکھ کر اٹھ گیا۔ اماں نے سب سے کما کر وہ جاکر کھانا کھائیں۔ طیب اب ٹھلی کرنے چلا گیا۔ میں بھی ایسے ہی اخنا جیسے ہاتھ دھو کر کھانے پر جاؤں گا مگر سیدھا دادا کے پاس چلا آیا۔

منے دادا کے چہرے پر پریشان تھی۔ ”ضیاء.....! تم بھائی کی قبر پر چلے جاؤ۔“

”جی! میں حیران ہو گیا۔“ کیا بات ہے ..... خیریت تو ہے نا!“ ”نہیں.....! مجھے لگتا ہے کہ خیریت نہیں ہے۔“ انہوں نے ہاتھ ملتے ہوئے کما اور کمرے میں شلنے لگے۔

”منے دادا.....! آپ پر سکون رہ کر مجھے بتائیے۔“ میں نے ان کے کانڈے تمام لئے۔

”کیا تم..... تم محوس کر رہے ہو کہ یہاں سکون ہے؟“ ”جی.....! میرا خیال ہے کہ یہاں کافی سکون ہے۔“ میں الجھا ہوا تھا مگر اس کے سوا کیا کہہ سکتا تھا۔ میں نے ایسی کوئی ابھری نہیں دیکھی تھی۔ ”میرے حساب سے تو سکون ہی ہے۔“

”نہیں ضیاء.....! مجھے نہیں لگتا کہ یہاں سکون ہے۔ میں یہاں ہر رات بھائی کو شلتا ہوا اور مضطرب دیکھتا ہوں۔“

”منے دادا.....! آپ کی محبتیں ہیں، جذبوں کی شدتیں ہیں جو جسم ہو جاتی ہیں۔“ میں انہیں تسلی دے رہا تھا مگرچہ بات یہ ہے کہ یہ خبر میرے لئے بھی تکلیف دہ اور ایک مستند خبر تھی۔ میں ہی نہیں، طیب بھی دادا کو دیکھ چکا تھا۔ یہ خیال طیب کا بھی تھا کہ کوئی چکر ہے اور جو کچھ مجھ پر بیتا تھا وہ تو میں ہی جانتا تھا۔ کتنا ہی حقیقی کیوں نہ لگے، خواب بہر حال اپنی پچان کردا دیتا ہے۔ آدمی کو جاگتے ہی احساس ہوتا ہے کہ وہ حالت خواب میں رہا ہے مگر میں اب تک ایسا محوس کر رہا تھا جیسے یہ سب آج ہی بیتا ہے۔ دادا آج مرے ہیں، میرے سر میں اب بھی تکلیف تھی۔ گوشالی ببابا سے ملاقات نے، طیب نے، ٹرین میں ہونے نے اور اب گھر آنے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ سب خواب تھا مگر..... اس کے علاوہ بھی کچھ تھا۔ یہی بات منے دادا بھی کر رہے تھے۔

”ضیاء! سب ٹھیک ہے۔ میں مانتا ہوں..... ہو سکتا ہے،“ میرے ذہن سے ان کے شلنے اور مضطرب رہنے والا میں نہ نکل سکا ہو لیکن..... وہ کچھ کہتے ہیں، زیر لب ہڑاتے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتا، صرف تمہارا نام سنائی دیتا ہے۔ اسی لئے کہہ رہا ہوں کہ پہلی فرصت میں ان کی قبر پر جاکر فاتحہ پڑھ آؤ۔“

”میں آج ہی جاؤں گا منے دادا۔ میں بھی انہیں خود سے قریب اور مضطرب محوس کرتا ہوں۔“ میں نے دادا پر قطعی یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ یہ کوئی سنجیدہ ہے۔ شان

کن بات ہے بلکہ یہی ظاہر کیا کہ ان کا بے چین دل ہے جو انہیں ڈسٹرپ کر رہا ہے اور وہ ان کی جدائی کو برداشت نہیں کیا رہا۔

”ٹھیک ہے..... مگر نسیاء.....!“ اس بار وہ اور زیادہ پریشان تھے۔

”کیا بات ہے منے دادا؟“

”ضیاء میں بھی وہاں جانا چاہتا ہوں مگر..... پتا نہیں، کون سا خوف ہے جو ہم تو ٹرتا سے۔“

”کوئی بات نہیں ملتے دادا! میں ہوں نا! میں اور طیب چلے جائیں گے۔ آپ پریشان ہے۔“

"وہاں تا جا جائے گا۔ اس سے کہنا، تم کیا کرو۔"

”آپ فکر نہ کریں۔ حسین رکھانا کھالیم ہے۔“

میں انہیں تسلی دے کر لے آیا۔ سب کے سامنے خود کو مطمئن ظاہر کرنا کتنا مشکل کام ہے، اس کا اندازہ مجھے آج ہو رہا تھا۔ وہ اضطراب جواندہ محسوس ہوا تھا اس کا سبب بھی سمجھ میں آچکا تھا۔ کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ غلط ضرور تھا۔ شالی بابا نے ذرا سا بھی وقت نہیں دیا تھا، نہ یہ بتایا تھا کہ آخر گھر کے دوسرے افراد کو کس طرح محفوظ کروں۔ مسئلہ میرے اکیلے کا نہیں تھا۔ میں تو ہر فرد کو خوف کی اس کیفیت سے نکالنا چاہتا تھا۔ پیاس تو ہر فرد مطمئن تھا سوائے منے دادا کے۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور طیب پچھے آرام کرنے کے لئے اپنے کمرے میں آگئے۔ منے دادا جب بھی یہاں آتے دادا ہی کے کمرے میں قیام کرتے تھے۔ اب بھی وہیں تھے۔ دادا ہی، اماں کے ساتھ برآمدے میں لیٹھنی تھیں، عصمت آپا حسب معمول غائب تھیں، میں نے کمرے میں آتے ہی سب سے پہلے طیب کو منے دادا والا واقعہ سنایا۔ اس نے بھی فتویٰ دے دیا کہ ضرور پچھہ نہ کچھ گزبر ہے۔  
”اب آخر کروں کیا؟“ میں پریشان ہو گیا۔

”اللہ سے مدد مانگو۔“ طیب نے یونہی سرسری انداز میں کہا تھا مگر بات میرے دل میں بیٹھنے لگی اور ایسی بیٹھی کہ میں پھر کچھ نہیں سوچ سکا۔ طیب ذرا ہی دیر بعد خڑائے لے رہا تھا۔ مجھے اس پر رنگ آیا، میں تو آئکھیں بھی نہیں موند سکتا تھا۔ اٹھا اور غسل کرنے کے بعد وضو کیا، جائے نماز پر بیٹھا اور سر بسجود ہو گیا۔ اس سے مدد مانگنا چاہئے تھی، یہ احساس کچوکے لگا رہا تھا۔ میں تو پابندی سے نماز تک نہیں پہنچتا تھا۔ اپنی طاقت پر اتنا گھمنڈ کیا کہ اس پر اسرار طاقت سے نکلا گیا اور کبھی یہ خیال نہ آیا کہ خدا کے سوا میری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ شالی ببابا نے تعویذ دیا تھا۔ ہمست پیدا کرنے کو کہا تھا مگر ان کی پوری توجہ اب بھی نہیں پاس کر سکتا تھا۔ نماز ادا کی، دعا کی تو لگا جیسے ہمت اس لئے ثوٹ گئی تھی کہ خدا کو بھول گیا تھا، شالی ببابا نے توجہ نہ دی تو یقیناً اس کا سبب بھی یہی ہو گا ورنہ وہ وعدہ کر کچھ تھے، صرف وعدہ نہ تھا زیر کو حل آئا، اٹھا۔۔۔ رکم کو ٹھہڑا کر رہا تھا۔۔۔

نماز اور دعا سے بڑا سکون ملا۔ نیند نہیں آئی۔ انھے کردا دا کے کمرے کی طرف گیا تھا وہاں نے دادا کو سر سبود دیکھا، وہ بلند آواز میں شیطانوں سے پناہ مانگ رہے تھے۔ ان کے رخسار گیلے تھے۔ دل رقت سے لرز اٹھا۔ اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ نہ جانے کیا خیال آیا، شکل بیباکا کا دیا ہوا تعویذ کھوں کر پڑھا۔ قرآنی آیات لکھی تھیں۔ چوم کر دوبارہ بند کیا اور

معاملے میں بھی ہوتا ہے۔ ہم خدا سے چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ سب کچھ ٹھیک اور اچھا کرتا رہے اور ہم اس سے غافل رہیں۔ میں تمیں مثال دیتا ہوں، اگر میں کرے میں دھوپ کے رخ کھلنے والی کھڑکی بند نہ کروں اور یہ چاہتا رہوں کہ کمراٹھڈا رہے تو یہ کیسے ممکن ہے یا ہوا کے رخ والی کھڑکی نہ کھولوں اور چاہوں کہ فرحت انگیز ہوا مجھے چھوٹی ہے، تو کیا ہے ملکتے؟“

طیب خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر ہم نے تانگا کر لیا۔ قبرستان کافی دور تھا۔ سورج اپنی تمازت کو سمیٹ چکا تھا۔ سرمی پن بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ سڑکوں پر چھل پھل تھیں۔ تانگہ درمیانی رفتار سے چل رہا تھا۔ طیب اب تک کچھ نہیں بولا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔

”ضیاء! تمہیں ڈیلوٹی کب جوائے کرنا ہے؟“  
”کیوں؟“

”کام ہے..... تم بتاؤ تو؟“

”اصول اتو مجھے اب سے ہفتہ بھر پلے ہی ذیولی جو ان کرنا چاہئے تھی مگر..... میرا  
خیال ہے کہ مجھے مزید چھٹیاں لینا پڑیں گی۔“

”کیوں؟“ وہ کسی اندر ونی خلفشار کا شکار تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کرنا چاہئے؟ ویسے کل جاؤں گا آفس۔“  
 ”تم کل مزید چھٹی لے لو۔“  
 ”کوئاں؟“

”ہم میرٹھ چلیں گے۔“ خلفشار کی وجہ سمجھ میں آئی۔ اس کا براہ راست فرحت یا لی جان سے کوئی رشتہ نہیں تھا اس نے اس کا اکیلے جانا بھی ٹھیک نہیں تھا، نہیں بلکہ جان سے اس حد تک بے تکلف ہوئی تحسین کر دے وہاں جائے۔ ان پر اسرار و اعقات سے بھی اس کا براہ راست تعلق نہیں تھا شاید کسی خلفشار تھا جو اسے لے چکر، کر رہا تھا۔

”کہ نہیں سکتا کہ آفس میں کیا صورت حال ہوتی ہے۔“ میں نے ٹال دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس موضوع پر زیادہ مات کرے۔

”یار ضیاء..... تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟“  
”کون سا وعدہ؟“

گلے میں پن لیا۔ اب دل ٹھہر گیا تھا، اضطراب، سکون میں تبدیل ہو گیا۔ نیند کا غلبہ ہوا اور میں بے فکر ہو کر سو گیا۔

شام ڈھلے آنکھ کھلی۔ گھر میں چل پل تھی۔ طیب منی دادی اور دادی کو لئے بینا  
میرٹھ چلنے پر آمادہ کرنے میں لگا ہوا تھا۔ اماں ڈاٹ رہی تھیں کہ اتنا لباس فر کر کے آئے  
ہو، سکون سے بیٹھے رہو۔ منے دادا مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ صحن میں پچھی چوکی پر  
بیٹھے وہ دور سے بالکل دادا ایسے لگ رہے تھے۔ میں بھی وضو کر کے تیار ہو گیا۔ منے دادا  
کے چوکی سے اترنے کے بعد اس طرف بڑھا تو طیب بھجے جیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اماں  
خوش تھیں، دادی خود بھی شاید نماز سے فارغ ہو کر بیٹھی تھیں اور اب تسبیح کے دانے پر  
رہی تھیں۔ میں طیب کی طرف دیکھے بغیر نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اتنا شاکر اماں طیب اماں  
بھی حیا دلا رہی تھیں۔

بی حیاد لا رہی تھی۔  
میرا ارادہ نماز کے بعد قبرستان جانے کا تھا۔ میں نے پھر اپنے خدا سے مدد مانگی۔  
دعا میں کیس اور فارغ ہو کر طیب سے قبرستان ملنے کو کہا۔ طیب نے نماز ادا کی مگر بڑی بے دھیانی سے، اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ صرف لوگوں کے کہنے میں آکر فرض ادا کر رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ راستے میں اسے سمجھاؤں گا کہ خدا کے آگے آدمی کا جسم ہی نہیں، روح بھی جاتی ہے اور روح تیار ہو تو اس کا رابطہ باقی دنیا سے کٹ جاتا ہے۔  
آدمی آنکھیں نیچا نیچا کرائیں گردوپیش سے باخبر نہیں رہ پاتا۔

ادی ایں پا پر رکھ دیں تو کچھ پڑھ کر ہم دونوں پر پھونکنا  
ہم قبرستان کے لئے روانہ ہوئے تو منے دادا نے کچھ پڑھ کر ہم دونوں پر پھونکنا  
طیب میری بدی ہوئی کیفیت سے ابھی تک پریشان تھا۔ ”یار یہ کیا کیسے ملٹ گئی؟ اتنے دا

”میں نے تمہیں نماز پڑھتے تھیں دیکھا اور اب .....؟“  
 ”اگر میں بے پرواںی کر رہا تھا اور آج مجھے اپنے فرانچ کا احساس ہو گیا ہے تو کیا یہ  
 تشویش کی بات ہے؟“  
 ”نمیں .....! خیرت کی تو ہے؟“ وہ بولا۔

”میں .....! بیرت دی ووہ ہے؟“ وہ بولا۔  
 ”ہاں! لیکن خونگوار جیرت کی۔“ میں مسکرایا۔ ”ہم اپنے فرانٹ سے غافل  
 بوجاتے ہیں طیب اور چاہتے ہیں کہ دوسراے اپنے فرانٹ ادا کرتے رہیں۔ خود حق ادا  
 نہیں کرتے اور دوسروں سے چاہتے ہیں کہ وہ ہمارے حقوق ادا کرویں۔ یہی خدا کے

”فرحت والا۔“

”ایا مطلب؟“ میں الجھ کیا۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ میں نے اس سے کوئی وعدہ مجھی کے

ہے۔

”میں نے تمہیں بتایا تھا تاکہ وہ مجھے پسند ہے۔“

”اور وہ موئیکا..... جیے..... ان کا کیا ہو گا؟“ میں نے خود پر قابو پاتے ہو۔

پوچھا۔

”ان کے معاملے میں، میں سمجھیدہ نہیں ہوں۔ یہ ویسا معاملہ نہیں ہے۔“

”پہلے تم سنجیدگی کی عمر کو پہنچ جاؤ پھر دیکھیں گے۔“ میں نے بات کا جواب دے کر اپنا رخ دوسری جانب کر لیا۔ مقدمہ یہ تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہ کرے۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا سوچ کر چپ ہو گیا۔

اب انہیں اگرا ہونے لگا تھا۔ ہم شرکی مصروف سڑک سے نبٹا سنسان راستے سفر کر رہے تھے۔ یہ سڑک بہت دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں آبادی نہیں تھی اور دونوں جانب دور دور تک جھاڑیاں تھیں۔ قبرستان کے آثار بھی کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔

”بایا کیا ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں؟“ میں نے تاکے والے کو مخاطب کیا۔ ”بان میاں جی.....! یہی راستے آگے جا کر دامیں کو مرتا ہے۔ ابھی تین روزوں میں آیا ہوں یہاں۔“ اس نے پان سے پلیے دانت نکال کر جواب دیا۔

”میں مطمئن ہو گیا مگر طیب کو گھری سوچ میں ڈوباد کیجئے کہ جان گیا کہ وہ ابھی تک“ کچھ سوچ رہا ہے، جو میں سوچتا نہیں چاہتا۔ اس بنا پر میں نے تاکے والے سے ”آج شروع کر دی۔ وہ بولتا رہا۔ بکھی کا تھا، وہیں کے قصے سناتا رہا پھر اچانک بولا۔ ”میں گور“ تھاں!“

”کیا..... گور گن! پھر تاکے کیوں چلانے لگے؟“ ”کیا کریں جی! پیسے نہیں بھرتا تھا۔ ایکے کے بس کی بات بھی نہ تھی کہ راتوں قبرستان میں رہے۔ قبر کھو دنا، لپٹنا، پوتا مشکل نہیں تھا مگر یہ جو بدر و حسیں ہوتی ہیں، یہ تاک میں دم کر دیتی تھیں۔“ ”ہیں! کیا!! کیسی بدر و حسیں؟“ طیب جانے کیسے اس طرف متوجہ ہو گیا۔

”بدر و حسیں ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں جی.....! تگ کرنے والی، بھتکنے اور ذرا نے والی۔“

”تمہیں بھی تگ کرتی تھیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بہوت..... بہوت تگ کرتی تھیں۔ وہ تو ہماری دادی کا کارنامہ تھا کہ کبھی ہمارا بیل بھی کیا کر سکیں ورنہ ہم نے انہیں لوگوں کو چھٹیاں دیتے تک دیکھا ہے۔“

”یار ضیاء.....! یہ آدمی کام کا لگتا ہے۔“ طیب نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

”مجھے سو فیصد لقین تھا کہ وہ گپ ہاںک رہا ہے مگر طیب کافی سمجھیدہ ہو چکا تھا۔

”نام کیا ہے بھیا تمہارا!“

”پیڑی۔“ اس نے پھر پڑیا سے پان نکال کر کھاتے ہوئے کہا۔

”تمہاری دادی ہر قسم کی روح بھگا دیتی ہیں؟“

”رو جیں بھاگتی کمال ہیں، غائب ہوتی ہیں۔“ وہ زور سے ہنل۔

”ہاں! وہی، وہی یار! ہمیں ان سے کچھ کام ہے۔ واپسی تک تو رکو گے ہی، ذرا ان سے ماریٹا۔“

طیب واقعی سمجھیدہ نظر آرہا تھا۔ میں نے سوچا چلو، اس بھانے دماغ کا خناس اتراء ہے گا۔ فرحت کے بارے میں زیادہ تر کیبیں نہیں سوچے گا۔ ویسے فرحت کی وجہ سے میں واقعی بہت پریشان تھا۔ مگر طیب کی موجودگی پتا نہیں کیوں مجھے خوفزدہ کر رہی تھی۔ شاید اس کے ٹھیک ٹھیک انداز گفتگو، بر جنگلی، جرأت اور..... اور ہنسنے بولنے کی عادت سے خوفزدہ تھا۔ بہر حال کچھ تھا جو میں اسے وہاں نہیں لے جانا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ انہیں یہاں لے آؤں۔

”ضیاء!“ طیب نے مجھے چونکا دیا۔ ”ہوں!“ میں نے سکریٹ جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔

”واپسی پر پیڑی بھیا کی دادی سے ضرور ملیں گے۔ کبھی کوئی ایسا بندہ بھی کام کا نکل آتا ہے جس کی طرف نہ دھیان جائے، نہ اس سے توقع ہو۔“

”ٹھیک ہے مگر.....“ میں نے کن انکھیوں سے تاکے والے کی طرف دیکھا اور اسے اپنی جانب متوجہ پا کر چپ ہو گیا۔

”انتہائی فضولِ ذوق ہے تمہارا۔“

”لو.....! اس میں ذوق کی کیا بات ہے۔ خوشی کا گانا ہے۔ آدمی خوش ہو گا تو تیری دنیا میں جی لگتا نہیں، واپس بلائے تو کاغئے کا نہیں۔ یا! تمہیں صرف اعتراض کرنا آتا ہے۔“ وہ چڑھا گیا۔ جو نہیں میں نے دبای تھی وہ ہونتوں تک رینگ آئی جس نے طیب کو پنف حوصلہ دیا اور وہ پھر گنگٹا نے لگا۔

”میاں جی قبرستان کے آس پاس اور وہ بھی مغرب کے بعد، ایسی حرکتیں مردے پسند نہیں کرتے۔“ تانگے والے نے کماتوں میں بے ساختہ پنس پڑا۔

”اچھا گویا اب تک میں زندوں کے لئے تو جذبات دباتا ہی رہا ہوں،“ ارماؤں کا گلا بھی اکثر گھونٹتا رہا ہوں، اب مجھے مردوں کی پسند ناپسند کا بھی خیال کرنا پڑے گا۔“ طیب جل گیا۔

”نئی.....! ہمیں ذاتی طور پر کوئی اعتراض نہیں ہے، مگر میاں جی ہمارا ان کی کسی حرکت سے واسطہ نہیں ہے۔ آپ اس کے گواہ رہیے گا۔“

اس نے یوں مجھے گواہ بتایا جیسے جلد ہی مجھے اس کے حق میں کسی مردے کے سامنے گواہی کے لئے تیار رہنا ہو گا۔

طیب جل کر چب ہو گیا۔ وہ خاموش ہوا تو کہیں دور نمائے میں کسی اور تانگے کی موجودگی کا احساس گھوڑے کی ٹاپوں اور پہیوں سے نکلنے والی چوال سے ہوا۔

”وہ راستہ.....؟“ میں چوکِ اٹھا۔ ہم اب بھی سیدھا جا رہے تھے اور یہ سڑک بالکل ولی ہی لگ رہی تھی جس کو ہم اب سے پہلے چھوڑ آئے تھے۔ اس کے بھی دونوں اطرافِ دور تک بھاڑیاں تھیں، دائیں بائیں کہیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہو بہو ہی ذیلی سڑک۔ یا! یہ..... یہ وہ راستہ تو نہیں۔“ میں بے ساختہ بول اٹھا۔“ اس راستے پر تو پھول والوں کی دکانیں تھیں۔

ایک دھوپی کا گھاٹ بھی پڑتا تھا۔“

”اوے ہاں.....! یاد آیا..... آپ نہ کہ کہتے ہیں۔ یہ سب قماں جی!“ تانگے والے نے باگیں کھینچ لیں۔ ”یہ..... یہ تو ہی رستہ ہے۔“ وہ غور سے چاروں طرف دیکھ کر بڑا یا۔

اب مجھے گھبراہت ہونے لگی تھی۔ رات نہ صرف اتر آئی تھی بلکہ انہیں بڑھتا ہی

”مگر پسلے فاتح پڑھنے دادا کی قبر تک تو پہنچو۔“ میں جلا گیا، پھر میں ہی نہیں، طیب

اور تانگے والا بھی چوکِ اٹھا۔

”ارے ہاں.....! وہ دا میں ہاتھ پر راستہ تو آیا ہی نہیں۔“ تانگے والا خود کافی کے سے انداز میں بڑرا یا۔

ہم نے پلٹ کر دور تک دیکھا۔ ”شاید آگے ہو۔“ میں نے کہا۔

”نہیں میاں جی! اتنی دور تو نہیں تھا۔ یہ تو ہم کئی فرلانگ دور آگے۔“

”تو پھر باتوں میں بیچھے رہ گیا ہو گا۔“ طیب نے کہا۔ ”چلو واپس چلو۔“

پھر ہم پلٹ کر بڑی سڑک کے کنارے تک چلے آئے مگر کہیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں خود بھی حیران تھا، گوئیں اس سے پہلے اس سڑک سے تو قبرستان نہیں آیا تھا مگر،“

سڑک بھی بڑی سڑک سے اندر کو مڑتی تھی پھر آگے راستے کے ساتھ ہی قبرستان کی چال دیواری نظر آئے لگتی تھی جبکہ ہم اس سڑک پر کافی دور تک اندر جا کر لوئے تھے۔

”کسی سے پوچھ لو۔“ طیب نے مصروف سڑک کے قریب پہنچ کر کہا۔

تانگے والے نے ایک چھاپڑی والے سے پوچھا جو امرود صاف کر کے سجا رہا تھا۔ اس نے پھر اسی سڑک پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہی سڑک آگے دا میں کو مڑے گی،“

”وہاں مڑتے ہی آپ کو قبرستان کی چار دیواری نظر آجائے گی۔“

”مگر ایسا نہیں تھا، ہم لوئے تو کافی دھیان سے تھے اور تانگے والا یہ مانے کو تیار نہ تھا کہ جمال سے ہم لوئے ہیں، راستہ اس سے کہیں آگے ہو گا۔“

”یہ ضرور بدروہوں کا چکر ہے۔“ اس نے تانگے کو بڑی سڑک پر لاتے ہوئے کہا۔ ”دوسرے راستے دیکھ لیتے ہیں۔“

اب وہ جس کے راستے پر آیا تھا۔ وہ میرا جانا پہچانا تھا، یہ وہی راستہ تھا جمال میں اکثر آیا کرتا تھا۔ دادا کے انتقال کے بعد کئی بار آچکا تھا۔

”ہاں بھی! اب جو راستہ بائیں کو آئے گا، اس سے اندر لے لیتا۔“ میں نے تانگے والے کو بتایا اور طیب کی طرف متوجہ ہو گیا جو گنگٹا نے لگا تھا۔

”چھوڑ بابل کا گھر، موہے پی کے مگر آج جانا پڑا۔“ یہ گیت گنگٹا نے تو مجھے نہیں آئی پھر ایک دم غصہ آگیا۔

جارہا تھا۔ یہ سڑکیں دور دور لگے پول کی روشنی میں نیم روشن تھیں۔ ویرانی بے وجہ اسرار لگنے لگی تھی۔

”واپس چلو۔“ طیب گھبرا گیا۔

تائگے والے نے پھر راستہ بدل لیا۔ اب ہم پھر بڑی سڑک پر جا رہے تھے۔ دونوں جانب دیکھ رہے تھے کہ کہیں راستہ اس بار پھر بے دھیانی میں شنکل گیا ہو۔ لیکن یہ سونے صد وہی سڑک تھی۔ یہ وہی چھابڑی والا تھا جس سے ہم نے چھپلی نہیں بلکہ غالباً اسی سڑک پر قبرستان کا راستہ پوچھا تھا۔ تائگے والے کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ چھابڑی ”جو ایک کپڑے سے امروز صاف کر کر کے سجا رہا تھا تائگے والے کو دیکھنے لگا۔“ تائگے والے اختیار وہی جملے دوہرا بیٹھا جو اس نے کچھ دری پسلے کے تھے۔ چھابڑی والا اسی سڑک کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”یہی سڑک آگے دامیں کو مڑے گی، والا اسی آپ کو قبرستان کی چار دیواری نظر آجائے گی۔“

اس بار تائگے والے نے اس کا پورا جملہ نہیں سن، گھوڑے پر چاہک بر سالا ادا چوڑی مصروف سڑک پر تائگا ڈال دیا۔ میں اور طیب اسے روکتے رہ گئے۔ وہ رکا گمراہ دور جا کر۔ وہ ایسے ہانپ رہا تھا جیسے ہمیں اور پچھلے کو گھوڑا نہیں، وہ خود کھینچ کر لایا ہوا۔ ”دیکھا آپ نے..... ہم نے کہا تھا ناکہ ایسی حرکتیں مردے پسند نہ کرتے۔“ وہ طیب پر گرم ہو گیا۔

”ابے! تو مردے نے کیا کیا ہے۔“ طیب بھی جل گیا۔

”لو.....! انہیں پتا ہی نہیں۔“

”پیٹر بھیا!“ میں نے اسے مخاطب کیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ میرے ان سے نرم ہو گیا مگر چہرے پر زردی کم نہ ہوئی۔ ”یہ ہوا کیا، ہم دوسری مرتبہ تو گھوم دوسری سڑک پر گئے تھے تاں؟“

”اور کیا..... دودھ والے کی دکان والے نکڑ سے اندر گئے تھے۔ سیدھے گئے تھے۔ کہیں مڑے بھی نہیں تھے پھر بھی..... پھر بھی لوٹے تو.....“ ”نوف رفت رفتہ اسے جکڑ لیا تھا۔ وہ جملہ پورا نہیں کر پایا، آواز گھٹ کر رہ گئی۔

”میں طیب کو اور طیب مجھے دیکھ رہا تھا۔ جو کچھ ہم دونوں سوچ رہے تھے، تھا سے فرق کے ساتھ وہی بات تائگے والے نے کہہ دی۔“

”یہ کسی بدرجہ کار نہیں ہے۔ قسم یہو معج کی! ایسی ہی حرکتیں کرتی ہیں وہ۔“ وہ روہاںسا ہو کر پر یقین انداز میں بولا۔

”پھر تم کیا کرتے ہو؟“ میں اب کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

”سیدھا دادی کے پاس جاتا ہوں۔ جب تک پسکوانہ لوں اپنے گھر نہیں جاتا۔ میاں جی، عصمن بچیاں ہیں گھر پر۔ بات ان پر جا پڑی تو کیا کروں گا۔“

”پلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟“ طیب نے پوچھا۔

”ہاں.....! شاید دو برس ہو گئے۔ اپنے دوست کی دادی کی قبر پر جا رہا تھا اس کے ساتھ۔ اس وقت میری دادی گوا میں رہتی تھی۔ بدرجہ کار کے رکھ دیا تھا۔ زیادہ حالت خراب ہوئی تو میری ماں اور باپ نے دادی کو بلوایا۔ تب سے وہ یہیں ہیں۔ بہت سے لوگ آتے ہیں ان کے پاس۔ میرا خیال ہے آپ کو بھی اپنے گھر جانے سے پلے ان سے مل لینا چاہئے۔“

”نہ معلوم کیوں گوا کے نام پر میرے دماغ میں جھمکا سا ہوا۔“ کیا نام ہے تمہاری دادی کا؟“

”وتسلا۔“

پھر میں ہی نہیں طیب بھی اچھل پڑا۔ اگر یہ وہی وتسلا کمیکر تھی جو بقول رابرٹ کے گوا میں رہتی تھی اور پھر والے سے غائب ہو گئی تھی، اگر یہ وہی وتسلا تھی جس کے بارے میں مجھے خواب میں زیو سانے ایلن کا دوست راست بتایا تھا تو ہمارا کام آسان ہونے والا تھا۔ میں گزرے واقعات کو قطعی بھول گیا اور خود پر خوف طاری کرنے کو اداکاری کر کے پیڑ کو نیٹے میں اتار لیا کہ ہم اس کی دادی سے ملے بغیر اب گھر نہیں جا سکتے۔ میں نے اس کا بہت شکریہ بھی ادا کیا کہ اس نے ہماری خاطری پر یہاں اٹھائی۔ اسے دس روپے دیکھ کر سارا نوف بھول جاتا گمراہ نے کہا۔

”چھوڑیں میاں جی! بات پیسے کی نہیں، وقت کم ہے۔“ میں جلدی چلانا چاہئے۔“

”میں نے دس کا نوت اس کی جیب میں نہوں دیا۔ اس نے گھوڑے پر چاہک بیسا نے شروع کر دیئے۔

”ترقباً آدھے گھنٹے بعد ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہو گئے جہاں زیادہ آبادی

عیسائیوں کی تھی۔ میں نے عیسائیوں کو کبھی تانگے چلاتے نہیں دیکھا تھا جو اپنے آپ کو گورگن اور اب تانگے والا ثابت کر رہا تھا وہ۔ اردو بہت صاف بول رہا تھا۔ اپنے انداز سے وہ قطعی عیسائی نہیں لگ رہا تھا۔ اس کا رنگ صاف تھا۔ گلے میں صلیب والا لائلک بھی نہیں تھا۔ کرتے پاجاۓ میں لمبیوس تھا، سوائے نام کے مجھے اس میں کہیں سے بھی عیسائیت کی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔

ایک بہت بڑے چرچ کے پاس جا کر اس نے گھوڑے کی لگائیں سمجھنے لیں۔ ”آجایئے؟“ وہ عجلت میں چڑاگنگ لگا کر نیچے اتر گیا۔ یہاں کافی روشنی تھی۔ چرچ کے دائیں جانب لکڑی کی ایک عمارت تھی جو تین منزلہ تھی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سے گھربے ہوئے تھے۔ انڈیا میں اس قسم کے چھوٹے چھوٹے کروں والی عمارت کو چالی کہا جاتا ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لئے ہمیں چرچ کے میں گیٹ کو عبور کر کے جانا تھا۔ میں اور طیب بھی اتر آئے۔ اندر جس طرف ہم جا رہے تھے وہاں قدرے انڈھیرا تھا۔ فلیبوں کی روشنی ہی چھن کر باہر آرہی تھی۔ اس طرف باہر پرانے زمانے کے لیمپ پوست تو تھے مگر ان میں بلب روشن نہیں تھے جبکہ دوسری طرف چرچ کے نامنے سیڑھیوں پر اور عمارت کے قریب کافی روشنی تھی۔

پیشہ بہت تیز چل رہا تھا۔ اچانک وہ پلتا اور بولا۔ ”دیکھو میری آنکھوں میں نیا ثبات تو نہیں ہے۔“

”اس انڈھیرے میں تو آنکھے کا شہتیر بھی دکھائی نہیں دے گا پیشہ بھیا! رنگ کہاں سے نظر آئے گا۔“ طیب نے جواب دیا جو اس کے پیچے تیز تیز چلے کی وجہ سے جھنجھلا یا ہوا تھا۔ ”اور کتنی دور جانا ہے؟“ اس نے منہ بنا کر پوچھا۔

”اس طرف کچھ دور چلتا ہے۔“ اس نے عمارت کے پیچے پہنچنے کے بعد پھر اسی راستے کی طرف اشارہ کیا جو گھوم کر گیٹ کے قریب جاتا تھا۔

”تو دوسری طرف سے کیوں نہیں آئے؟“ یہ لباراستہ ہے۔“

”اب تو ہر راستے لمبا لگے گا میاں جی۔ شکر کرو ہم یہاں پہنچ گئے۔ روٹیں نے سارے راستے بدلتی ہیں۔ آدمی چلتا کہیں اور جانے کے لئے ہے اور جانکھتا ہے کہید اور۔ یہ ہوتے ہیں بدرجوں کے گھیل۔“

پر سکون، بے فکری زندگی اور کہاں یہ ہنگامے خوف اور مسلکوں کی بھول بھیلیاں۔ لکھیاں، موٹیں، پے در پے ہونے والے حادثات، یہ سب کیا تھا، بقول پیشہ بدرجوں کا گھیل، اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی اس گھناؤنے اور تھکادیئے والے گھیل میں گھرتے جا رہے تھے۔ اچانک پیشہ رک گیا۔ وہ ان چھوٹے چھوٹے فلیبوں والی عمارت کے ایک طرف بننے والگ۔ سے کوارٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس مکان کا دروازہ ہمارے سامنے تھا۔ اس میں کندھی لگی ہوئی تھی اور برا ساتلا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ پیشہ اسے دیکھ کر ہر اس ہو گیا۔

”یہ..... یہ تو۔“

”نہیں ہیں۔“ طیب نے جملہ پورا کر دیا۔ ”سوال یہ ہے کہ انہیں اس عمر میں گھومنے پھرنے سے فرصت نہیں ہے۔“

”نہیں.....! وہ تو چل ہی نہیں سکتیں۔“

”ہیں.....! پھر.....! کہاں جا سکتی ہیں؟ کیا کوئی اور انہیں لے گیا ہے؟“

”نہیں.....! انہوں نے تو گزشتہ دو برس سے پلٹک سے پاؤں بھی نہیں اتارا۔ انہیں کوئی بھی کمیں لے جانے والا نہیں ہے۔“ وہ پریشان تھا۔ ”اب میرا کیا ہو گا؟“ ”ہو سکتا ہے، تمہارا باپ اسے تمہارے گھر لے گیا ہو۔“ طیب جو سوچتا تھا، وہ یوں رہتا تھا۔

”میرا باپ نہیں ہے۔“ اس نے جواب دیا اور کوئی ایسی روزن تلاش کرنے لگا جملہ ہے اندر جھانک سکے۔

”پھر ماں ہو گی۔“

”وہ بھی نہیں ہے۔“ پیشہ دروازے کے ابھرے ہوئے پٹ کو انگلی کی پوروں سے کھو لئے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”بھائی وغیرہ.....“

”کوئی نہیں ہے میاں جی! دادی کا دنیا میں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔“ وہ پٹ کر پیچنے کے سے انداز میں بولا۔

میں نے محروس کیا کہ اس کی حالت واقعی بست خراب ہے۔ وہ سخت خوفزدہ ہے۔ ”پیشہ گھردار مت۔“ میں نے ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اس کی دادی کی غیر موجودگی نے مجھے بھی مالیوں سے دوچار کیا تھا اگر اس میں خوفزدہ ہونے والی کوئی بات نہیں تھی۔ جو

کچھ پیر کے ساتھ پیش آیا تھا وہی کچھ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا تھا اور یہ قطعی اس قدر ہر اس ہونے والی بات نہیں تھی۔

"وہ کمال چلی گئیں؟" پیر دیوار سے میک لگا کر نہ ہال ہو گیا۔

"جان بھی گئی ہیں لوٹ آئیں گی، میرا مطلب ہے کہ انہیں اگر کوئی لے کر گیا ہے تو وہ ضرور واپس لائے گا، تم یہ سوچو کر آخر کون انہیں لے جاسکتا ہے؟"

"بھیجا جی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

عن اسی لمحے ہمیں اندر آہٹ محسوس ہوئی۔ یہ آواز پیر نے بھی سن لی تھی۔

اب وہ حیرت سے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا پھر ہماری طرف پہنچا۔ "آپ نے سنا! آواز آئی تھی؟"

"وہ شاید اندر ہی ہیں۔"

میں دروازے کے قریب ہو گیا۔ میں نے اور طیب نے دونوں نے ہی اندر آہٹ سننے کے علاوہ کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ اندر اندر ہمرا تھا مگر لگتا تھا، جیسے واقعی اندر کوئی ہے۔ "سنو پیرا کوئی چاہی ہے۔" میں نے پوچھا۔

اس نے جیب ٹول کر چاہیوں کا گچھا نکالا مگر کوئی چاہی بھی تالانہ کھول سکی۔ میں نے محسوس کیا کہ جب ہم تالا کھولنے کی کوشش کر رہے ہے، اس وقت آواز بھرم گئی تھی۔ یوں جیسے اندر جو بھی کوئی ہے۔ اسے ہماری دروازے پر موجودگی کا احساس ہو گیا ہو۔

"توڑ دو..... توڑ دو اسے۔" پیر ایک دم چالایا اور پھر رک نہیں، اس نے ایک زور دار لات دروازے پر ماری۔ دروازہ بست پرانی اور بوسیدہ لکڑی کا تھا۔ ایک ہی ضرب سے کنڈی الگ ہو گئی اور دروازہ کھل گیا۔ ہم تینوں تیزی سے اندر داخل ہو گئے۔ طیب چیخا۔ "پیر! لائٹ آن کرو۔"

پیر نے فوراً ہی لائٹ آن کر دی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ یہ کمرہ چھوٹا اور سیلن زدہ تھا۔ وہ کرسیاں ایک نیبل اور ایک سٹنکل بینڈ تھا۔ پیر یہاں بھی نہیں رکا، سیدھا سانتے دکھائی دینے والے کی طرف بڑھ گیا۔ ہم دونوں اس کے پیچے تھے۔ اس کرے میں ایک زرد بلب بل رہا تھا۔

"پیر!! آگیا تو؟" ایک لرزتی ہوئی آواز نے ہمارے قدم تھام لئے۔

"مدد!! آپ..... آپ ٹھیک ہیں نا؟"

پیر نہ روش کرے میں ایک طرف بڑھ گیا۔ میں اور طیب دونوں چوک اٹھے۔ سانس بیٹھ پر ایک بوڑھی عورت لیٹی تھی۔ یہ بست کمزور اور زرد رو تھی پھر بھی ہمیں یہ گمان ہوا جیسے وہ ایسا ہو۔ طیب نے مجھے کہنی ماری۔ میں اور وہ اس عورت کی طرف بڑھ گئے۔ میں اسے قریب سے دیکھا چاہتا تھا۔ ایسا سے مشاہدہ نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ وہ اوتھا کمسکر ہے جس کے بارے میں زیو سانے مجھے بتایا تھا۔ ایسا سے اس کا کیا رشتہ ہے، یہ میں تھیلنا نہیں جانتا تھا مگر اتنا مجھے علم تھا کہ ایسا گوا جانے والی تھی۔ پیر نے قریب جا کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے تھے۔

"میں پریشان ہو گیا تھا میر! باہر تلاکس نے ڈالا تھا؟"

"انجلہ آگئی تھی۔ وہ چرچ گئی ہے۔ کہ گئی تھی کہ لوٹ آئے گی۔ شاید اس نے ڈالا ہو۔ یہ..... یہ لوگ کون ہیں؟"

اس نے ہم پر نگاہیں جاتے ہوئے پیر سے سوال کیا مگر یوں لگا جیسے وہ جان گئی ہو کہ ہم کون ہیں۔ میں اس سے بھی نہیں ملا تھا مگر پھر بھی اس کی دھنڈی آنکھوں میں ہلک اٹھنے والی پچان کی چک بھی مجھے بالکل ایسا جیسی لگی تھی۔

پیر نے اسے تمام واقعہ سن ڈالا۔ اس دوران میں ہماری نگاہیں اس کے پھرے کا جائزہ لے رہی تھیں، زیادہ تر وہ مجھے گھوڑتی رہی۔ چرھے پاٹ رہا مگر آنکھوں میں عجیب سا تماز اپھر کر دیتا رہا۔ کبھی لگتا جیسے وہ میرے لئے دل میں سخت نفرت محسوس کر رہی ہے، کبھی تمنgran اندراز میں یوں دیکھتی جیسے میری حالت زار پر خوش ہو۔ مجھے رہ رہ کر کمیکر ہے، اسے تلاش کرو۔

"مدد!! شاید بدروج ہم میں سے کسی کے سامنے سے چھٹ گئی ہو۔ آپ کو یاد ہے مالا! پسلے بھی ایسا ہوا تھا۔" پیر کہہ رہا تھا۔ "یہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی تھے، جب میں نے بتایا کہ آپ....."

"پیر!!!" اس نے پیر کو جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ اس بار اس کی آواز تدرے مضبوط تھی۔ وہ لرزش بھی نہیں تھی جواب سے پسلے ہم نے محسوس کی تھی۔ پریشان مت ہو اور یہ خوش خبری بھی سن لو کہ اب تمہاری مدد پھر سے مضبوط، تو انہا اور سخت مند ہو جائے گی۔"

اب بھی اس کی نگاہیں میرے چرے پر جی ہوئی تھیں۔ مجھے الجھن اور گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔

”مجھے سارا دے کر بخدا دو۔ میں تمہارے مہمانوں سے باتمیں کرنا چاہتی ہوں۔“

پیڑاں بات سے خوش ہو گیا کہ وہ ہمیں ضرورت سے اہمیت دے رہی ہے۔ اس

نے اسے سارا دے کر بخدا دیا، پرشت سے کئی تکنے اور کشن لگادیئے۔ ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم نے دیوار سے گلی کریاں بیڈ کے قریب سرکالیں اور ان پر بیٹھ گئے۔ وتسلا نے ہمیں قریب آجائے کا اشارہ کیا تھا۔

”اب جاؤ.....! مھندھا مشرووب بنا لاؤ۔“

وتسلا نے آرام سے سرپشت سے نیکتے ہوئے پیڑے کے کما۔ پیڑ براہر چلا گیا۔

”میں آپ کی تلاش میں تھا۔“ پیڑ کے جاتے ہی میں یوں اخمل وہ چونک گئی۔ حیرت اور الجھن اس کی آنکھوں میں لبرائی۔ شاید اسے موقع نہیں تھی کہ میں اس کے بارے میں کچھ جانتا ہوں یا یوں بر ملا اپنی کوئی بات کر سکتا ہوں۔ میں واقعی اس کے بارے میں

نہیں جانتا تھا۔ جو کچھ رابرٹ نے بتایا تھا، وہ قطعی حیران کرن یا اہم نہیں تھا۔ اس سے

وتسلا کے کردار کے بارے میں اچھا تاثر ہی ابھرتا تھا کہ وہ ابا اور ان کے دوستوں کی مدد کرنا چاہتی تھی اور جب ان لوگوں نے انکار کر دیا تو اس نے کچھ بھی نہ کامگر زیوں سامنے بنا

گئی تھی کہ میرے ساتھ ہونے والے ان واقعات اور حادثات میں وتسلا کا باہم تھے ہے۔ مجھے

اس بات کا یقین تو نہیں تھا، نہ کوئی ایسی بات ہوئی تھی جو یقین دلاتی گمراحتا ضرور ہو اغا

کہ وتسلا کا نام دوسری مرتبہ آیا تھا، بلکہ تیسرا مرتبہ، ایسا کے بارے میں بھی پتا چلا کہ“

”تمہیں میری تلاش کیوں تھی؟ میرا خیال ہے کہ میں تم سے کبھی نہیں ملی۔“

”میرے والد سے تو ملی تھیں۔“

اس کے چرے پر آکر گزر جانے والے سائے سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اب میرے بارے میں سب کچھ جان گئی ہو گی۔

”تمہارا والد؟ شاید میں بھی اس سے ملی ہوں۔ مجھے یاد نہیں۔ بڑھا سب سے پہلے یادداشت پر اثر انداز ہوتا ہے۔“

”کیا آپ ایں کو بھی بھول گئیں؟“ یقین نہ ہونے کے باوجود اندر میرے میں

چیزیں میں کوئی حریج نہ تھیں۔ اگر بات درست نہ ہوتی تو بھی کوئی نقشان نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ بھی کسی بات کا اقرار نہیں کرے گی مگر میں تو اپنی بصارت پر بھروسہ کر رہا تھا۔ اس کے چرے کی ہر جھری میں پیدا ہو کر معدوم ہونے والا تاثر ہی میرے لئے کافی تھا۔

”اُنک..... کس ایں کی بات کر رہے ہے؟“

”وہ اُنھیں ہے قتل کیا گیا تھا۔“ میں تفصیل سے فتح رہا تھا۔ ”جس کی روح سے نہیں کافی عقیدت ہے۔“

”تم کون ہو؟“

”فیاء.....! عطاہ الرب رضوی کا بیٹا، فیاء الرب رضوی۔ کیا یہ اب بھی باتاں کہ کون عطاہ الرب رضوی؟“

”تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟“ وہ گھبراہٹ تھی۔

”تمہارا یہ پوتا ہی لے کر آیا ہے۔“ طبیب نے جواب دیا جواب تک بڑی برداشت سے کام لے رہا تھا۔

”نہیں.....! یہ نہیں ہو سکتا۔ سنو! میں ایں سے نکل آپکی ہوں۔ اس لئے گوا چھوڑ آئی۔“

”کیوں.....؟ کیا ایں کی روح گوا سے باہر نہیں نکل سکتی؟“ طبیب نے جل کر کمل۔

”نکل سکتی ہے مگر بہت کم وقت کے لئے۔ پھر وہاں لوٹ جانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ لوٹ جائے، جہاں اس کے لئے سکون ہے۔ آدمی جب مر جاتا ہے تو اسے وہیں رہنا چاہئے، جہاں وہ پہنچا دیا گیا ہے۔ اگر وہ بے جگہ ہوتا ہے تو اذیت سے دچکا رہتا ہے۔ وہ صرف ہٹ دھری میں یہ اذیت برداشت کر رہی ہے اور وہ..... وہ کچھ دوسرے لوگوں کو..... میرا مطلب ہے کہ روحوں کو بھی روک لینے کا ہر جانتی ہے۔ وہ سب اذیت میں ہیں۔“

”اور اسے اس اذیت سے نجات دلانے کے لئے تم دوسروں کو بھی اذیت دے رہی ہو۔“ میں نے غصے سے کمل۔ میں اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ جو کچھ کہ رہی ہے، میں اسے نہیں سمجھ رہا ہوں۔ ایں کن لوگوں کو روک رہی ہے، کس ہٹ دھری کی بنا پر وہ خود اذیت اٹھا رہی ہے اور اس کا ایں سے کیا واسطہ ہے۔ مجھے کچھ

اندازہ تو تھا مگر یقین سے کوئی بات نہیں سوچ سکتا تھا۔

”ہاں.....! میں نے پسلے کیا تھا ایسا مگراب وہ حد سے بڑھی چل گئی تو میں ٹھر آگئی۔ کیا تمہیں یقین آجائے گا کہ میں میساں، ایلن سے چھپ کر رہ رہی ہوں!“

”کیا مطلب؟“ طیب آگے کو سرک آیا۔ ”کیا ایلن اس قدر پر اسرار ہونے کے باوجود اور روح ہونے کے باوجود میساں کے بارے میں نہیں جانتی؟“

”فضول باتیں نہ کرو طیب!“ میں نے اسے ڈاٹ دیا۔ ”ہاں.....! تم کیا سامنہ دنیا کو بے وقوف سمجھتی ہو؟“ اب میں و تسلیا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ جب تم اس گھر سے باہر جاؤ گے تو دیکھنا۔ اس گھر کے چاروں دیواروں پر سفید رنگ سے ایک نقش بنانا ہوا ہے۔ وہ نقش ہی مجھے اس سے محفوظ کئے ہوئے ہے۔ میں موت کی خفظہ ہوں۔ سکون چاہتی ہوں مگر..... پتا نہیں، کیوں مجھے موت بھی نہیں آتی۔ اور سنو! تم مجھ سے اس انداز میں بائیں مت کرو۔ میں نے

تمہارے فادر کو آفریکی تھی کہ میں اس کی مدد کر سکتی ہوں مگر اس نے وہ قبول نہیں کی۔“

”اس کے بعد تم نے اس کے سارے خالدان کو ایک ایک کر کے موت کے گھٹک پسas کے ساتھ کیا کیا!“

وہ حیران کن نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ”نہیں.....! ایسا نہیں ہے..... مجھے نہیں معلوم کہ ان سب کے ساتھ کیا ہوا۔ تم سے یہ کس نے کہا ہے کہ میں ہرگز بڑی کی ذمے دار ہوں؟“

”زیوسانے۔“

مجھ سے پسلے طیب بول اٹھا اور ایک دم گھر اتنا چھا گیا۔ مجھے تو افسوس ہوا تھا کہ میں نے طیب کو یہ بات کیوں بتائی تھی مگر تو تسلیا زیوسا کا نام سن کر جیسے پتھر کی ہو چکی تھی۔

”زیوسا! وہ.....! ادھ.....! مجھے کی ڈر تھا اس لئے میں نے ایلن کو منع کیا تھا۔ اسے بہت غور تھا۔ پاگل ہو گئی تھی وہ.....“ وہ اضطراب میں اٹھ بیٹھی۔

مجھے لگا جیسے وہ زیوسا کا نام سن کر خوفزدہ ہو گئی ہے۔ بعد میں ایک دم مرعوب ہو گئی۔

”ہاں! مجھے زیوسانے بتایا ہے۔“

تیر، کمان سے نکل چکا تھا اس لئے میں نے بھی بتا دیا ورنہ میں بات کی تہہ تک پہنچ بخیر کوئی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ اسی بات تو یہ تھی کہ میں نہ زیوسا سے واقف تھا نہ ایلن سے اور نہ ہی میری سمجھ میں ہے۔ آیا تھا کہ آخر ایلن ان زنجیروں کے لئے یہ کیا کر رہی ہے اور اب جبکہ اسے مرے ہوئے بھی برس بیت گئے ہیں، وہ ان زنجیروں کو کھل کر کے کیا کرے گی۔ میں تو جانے چاہتا تھا کہ وہ کس طرح ہمارا یقچا چھوڑے گی، نہیں کہ میں غصے میں اس سے نکر لئے کی شان چکا تھا مگر اب گھر میں اور دینے کو کوئی نہیں پچاہتا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ اس سے سودے بازی کر لوں۔

رابرٹ، جینو، پاس اور سورن سنگھ کو عذاب سے نکال لوں۔ ان واقعات کی حقیقت کو جان لوں اور ان تمام چکروں سے خود بھی نکل جاؤں اور باقی سب کو بھی نکال لوں۔

و تسلیا خود کیا چیز ہے یہ جاننا بھی منسود تھا۔

”تم کیا چاہتے ہو؟“ وہ ایسے بولی جسے ہار گئی ہو۔

”حقیقت کا دروازہ۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔

”ایلن کیا چاہتی ہے؟“

”سوئے کی وہ زنجیروں جو اس کے دوستوں نے اسے مارنے کے بعد حاصل کر لیں۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں سر کو تکیوں پر رکھ لیا۔

”کیوں؟“

”تاکہ وہ مرنے کے بعد بھی زیوسا کو اپنے قبضے میں رکھ سکے۔“

”کیا مطلب؟“

”پیڑ آ رہا ہے۔ تم بعد میں آؤ۔ تو بتا دوں گی۔“ وہ یہ کہہ کر چپ ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

باہر گلاسوں کے نکرانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ شاید بازار سے مشروب لایا تھا ”رنہ اتنی دیر نہ ہوتی۔ میں نے طیب کی طرف دیکھا۔ وہ بہت حیران تھا اور حیرت انگیز طور پر چپ بھی۔

پیڑ مشروب سے بھرے گلاس لے آیا۔ وہ اپنی دادی کے رویے پر حیران اور خوش

پانی ہے۔ اب وہ دیں بیٹھے بیٹھے وہ پانی پیٹر پر چھڑک رہی تھی، ابھی تک اس کے ہونت تیزی سے بیل رہے تھے۔ میں اور طیب اسے دیکھ رہے تھے۔ پیٹر کے پورے بدن پر پانی چھڑکنے کے بعد اس نے ایک بار اس پر پھونکا اور دوسرے ہی لمحے وہ نارمل ہو گئی۔

”اے۔ سخنان کر بستر پر ناڈو۔“ وہ زراسی پیچھے کی طرف سرک کر بولی۔ اس کے پیٹر پانٹی کو اتنی جگہ ہو گئی تھی کہ پیٹر کو اٹھا کر لٹایا جا سکتا تھا۔

میں نے فوراً جھک کر پیٹر کو اٹھانا چاہا تھا ہی یہ حقیقت منکف ہوئی کہ میں تنہ اسے بلا بھی نہیں سکتا۔ میں نے طیب سے مدد کرنے کو کہا۔ طیب غالباً و تسلماً کی پر سکون مات دیکھ کر نارمل ہو چکا تھا۔ فوراً بولا۔

”ایک آدمی نہیں اٹھ سکتا تم سے؟“

”آؤ؛ تم بھی کوشش کرو۔“ میں نے جڑے بھیجن کر اپنے غصے کو دبایا۔ مجھے طیب کی یہ عادت بہت بری لگتی تھی کہ وہ حالات کی نزاکت کو سمجھے بغیر بول پڑتا تھا یا حالات کی غنیم محسوس کرنے کے باوجود بے حسی طاری کر لیتا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے تخریانہ انداز میں مجھے پھر و تسلماً کو دیکھا اور جھک گیا۔

دوسرے ہی لمحے اس کی پیٹلانی پر پیٹے کے فظرے چک گئے۔ میں نے کچھ نہیں کہا صرف نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور دوسری طرف سے اکثر ہوئے پیٹر کی کمر کے نیچے ہاتھ ڈال کر پوری طاقت لگا دی۔

پیٹر کو بستر پر نٹانے میں دس منٹ لگ گئے۔ وہ اتنا بھاری ہو چکا تھا جیسے فرش میں گرا ہوا ہو یا جیسے اس میں منوں لوہا بھرا ہو۔ جب ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہم آسانی سے اسے نہیں اٹھا پائیں گے تو ہم نے اسے سرکا کر بیٹھ کے بالکل قریب کر دیا، اس دوران میں طیب کی بارہاپانی۔ اس نے کھڑے ہو کر کر سیدھی کی، آستین سے پیٹنا پوچھا۔ میری دلت بھی اس سے کچھ مختلف نہیں تھی مگر میں بھر حال اس سے زیادہ طاقت ور تھا اور مجھ میں اپنی حالت کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت بھی اس سے زیادہ تھی۔ بیٹھ کے قریب لا کر ہم نے اسے کس طرح اور پر لٹایا، یہ ہم ہی جانتے ہیں۔ و تسلماً کو ہماری حالت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ذرا بھی تشویش کا انداز نہیں کر رہی تھی۔

پیٹر کو بستر پر لٹا کر ہم کچھ دیر کے لئے اپنی سانسون پر قابو پاتے رہے۔ جب کچھ مالت سنبھلی تو و تسلماً کے چڑے پر چھایا سکون دیکھ کر حیران رہ گئے۔

تحا۔ اس نے ہم سب کو مشروب دیا پھر دادی کے قریب بیٹھ گیا۔ ”مدرس.....! مجھے کہا تو گا تو نہیں!“ وہ پریشان بھی تھا۔

میری نگاہ و تسلماً کے چڑے پر جبی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہ پیٹر کو کہ کر سفید ہو گئی، خوف سے اس کا چہرہ سُخت ہو گیا۔ میں نے پیٹر کی طرف دیکھا۔ غالباً میں اس وقت طیب نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اس لئے کہ میری آواز کے ساتھ ہی طیب اور توڑے کے حلق سے بھی عجیب و غریب سی آواز نکلی تھی اور پھر پیٹر کی کٹے ہوئے درخت کے طرح بیٹھ کے قریب فرش پر ڈھے گیا۔

میں اور طیب اچھل پڑے۔ میں نے اور طیب نے ایک ساتھ جھک کر پیٹر کو دیکھا۔ وہ ساکت تھا، اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں نیلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ یہ نیلاہٹ آنکھوں سے نکل کر جیسے دھیرے دھیرے چڑے پر بھی پھیلنے لگی تھی۔ میری بکھر میں کچھ نہیں آ رہا تھا اچانک احساس ہوا کہ و تسلماً خاموش ہے اور ساکت بھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا وہ آنکھیں بند کئے تیزی سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ میں نے پیٹر کی نہض مٹول تو سردم سی میری ریڑھ کی بڈی میں دوڑ گئی اس لئے کہ مجھے لگا جیسے میں نے کسی سردوں ہے کہ سلائخ کو تھام لیا ہو۔

”انہ ہوں!“

مجھے و تسلماً آواز سنائی دی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو وہ مجھے چھونے سے منع کر رہی تھی۔ پتا نہیں، بند آنکھوں سے اس نے کیسے دیکھ لیا کہ میں پیٹر کو چھوڑ رہا ہوں۔ میں کھڑا ہو گیا۔ طیب جیرت اور خوف سے ساکت تھا۔ جو نہیں اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، وہ چونکا جیسے ہوش میں آگیا ہو۔ جھر جھری لی اور سر کے اشارے سے بتایا کہ وہ جا رہا ہے، باہر۔ اس نے مجھے بھی باہر چلنے کو کہا۔ میں اس حالت میں پیٹر کو ایک معدود عورت کے پار چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ جب میں نے منع کر دیا تو وہ پاس والی اس کرسی پر ڈھے گیا جس پر اب سے پسلے بیٹھا ہوا تھا۔

و تسلماً اسی رفتار سے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اضطراب نے مجھے بے چین کیا ہوا تھا کمرے کی گھری خاموشی میں و تسلماً کی تیز سانسون کی آواز خراںوں کی طرح گونج رہی تھی پھر وہ خاموش ہوئی۔ اس نے اپنے سرہانے رکھے ایک چاندی کے ذبے کو اٹھایا۔ وہ ایک لمبوڑا ساڑہ باتھا۔ اس نے اسے کھوں کر اس پر پھونک ماری اور پھر مجھے پتا چلا کہ اس میں

آدمی مر جاتا ہے تو اس کا اس دنیا سے ناطق ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری مذہبی کتابوں میں دنیا کو ”سرائے“ اسی لئے کہا گیا کہ آدمی یہاں کی چیزوں، اولادوں یا دولت و جائیداد سے جذباتی وابستگی پیدا نہ کرے اس لئے کہ یہ سب یہیں رہ جاتا ہے جبکہ آدمی کو یہاں سے کہیں اور پہاڑ ہوتا ہے۔ جذبات کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔ یہ جذباتی وابستگی روح کو بے چین رکھتی ہے اگر وہ مان لے کہ یہاں کی چیزوں یہاں رہ جائیں گی، وہاں کام نہیں آئیں گی تو وہ اگلے سفر میں آسانی محسوس کرے۔

”یہ کس کا عقیدہ ہے، کیا تمہارا؟“ طیب نے اسے سانس لینے کے لئے رکتا دیکھ کر سوال کردا۔

”میرا خیال ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب کا۔“

”مگر ہندو کا یہ عقیدہ نہیں ہے۔ وہ اس دنیا میں دوبارہ جنم لینے کو مانتا ہے۔“ میں نے وتسلا سے کہا۔

”لیکن کیا کوئی اولاد، دوبارہ اپنے ہی ماں باپ کے گھر پیدا ہوئی ہے یا ماں، باپ یا کوئی دوسرے رشتے دار..... اگر ان کے عقیدے کو مان بھی لیا جائے، ایک لمحے کے لئے تو بھی، جانے والے کے تمام رشتے دار تمام کچھ وہیں..... رہ جاتا ہے۔ اگر ان کے خیال میں وہ دوسرا جنم لیتے بھی ہیں تو ایک نئی، علیحدہ اور کسی دوسری حیثیت میں، تب بھی ثابت ہوتا ہے کہ جو اس جنم میں جہاں اور جیسا ہے، اس کے اگلے جنم میں اس سے کوئی ناطق نہ ہو گا۔ اگر ایسا ہوتا تو ایک کروڑ پتی مرتا اور دوبارہ جنم لیتا تو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد اور اولاد پھر اس کی ہو جاتی مگر ایسا نہیں ہے۔“

”میں نے ایک واقعہ پڑھا تھا کہ ایک بچی پیدا ہوئی اور پھر ماں باپ کو ایک ایسے گھر میں لے گئی جہاں کچھ اجنبی رہتے تھے مگر اس نے ان سب سے اپنا رشتہ ماں کا بتایا اور سب کی زندگی کے حالات، نام اور ان سے متعلق تمام جزیات بھی، بالآخر وہ مان گئے کہ وہ ان کی مر جانے والی ماں ہے جو دوسرا جنم لے کر آئی ہے۔“ میں نے کہا۔

طیب اطمینان سے یوں بیٹھا تھا جیسے دادی سے کہانی سن رہا ہو۔ مجھے گھر جانے کی جلدی تھی۔ منے دادا اب تک پریشان ہو چکے ہوں گے۔ مجھے اس کا احساس تھا پھر پیڑا تی دیگزر جانے کے باوجود اسی حالت میں تھا۔ اور آپ اندازہ لگا کرے ہیں کہ ایک شخص جو مژہ حالت میں پڑا ہو، اس کے بارے میں یہ بھی کفرم نہ ہو کہ زندہ ہے یا مر گیا، ایسے

”پیڑ کو کیا ہوا؟ کیا یہ مر پڑا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہو کہ میں نے اسے چھو کر دیکھنے کی کوشش کی تھی، مجھے تو وہ انسان ہی محسوس نہیں تھا۔ زندگی یا موت کا اندازہ کیسے ہوتا؟“

”نہیں! یہ ٹھیک ہے۔ کچھ در بعد یہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا لیکن خیاء..... اسے تم لوگوں کے ساتھ قرستان نہیں جاتا چاہئے تھا۔ ایں تمہارے دادا کی روح کو رو ہوئے ہے۔ وہ وہاں یقیناً تمہاری منتظر ہوگی۔ تم کسی مضبوط حصہ میں ہو، تمہارے سامنے کو بھی وہ کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی تب اس نے تم لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے پیڑ ساتھ ایسا کیا۔“

”ممکن ہے، وہ جان گئی ہو کہ پیڑ تمہارا پوتا ہے۔“ طیب نے معقول بات کی تھی۔ ”نہیں.....! وہ نہیں جان سکتی لیکن ایسا کر کے اس نے اچھا نہیں کیا۔ مجھے یہ کی خت ضرورت ہے۔ میں جب تک زندہ ہوں، اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر زدرا بھی کوتای ہو جاتی تو.....“ وہ جھر جھری لے کر خاموش ہو گئی۔

”وتسلا! میں اس تمام چکر سے خت پریشان ہوں۔ مجھے ایں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سونے کی وہ زنجیریں میرے کسی کام کی نہیں، بلکہ میرے خیال میں تو انہی کی،“ سے میرا پورا خاندان زیر عتاب آیا ہے۔ میں اس شیطانی چکر سے انکنا چاہتا ہوں۔“ میں واقعی تحکم گیا تھا۔ میرے نہ ہمال لجے نے طیب اور وتسلا دونوں کو چونکا دیا۔ وتسلا مجھے دیکھتی رہی، چند لمحے بعد بولی۔

”وہ زنجیریں مجھے دو۔ میں تمہیں ان چکروں سے نکال دوں گی۔ ایں تمہیں کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی مگر.....“

”مگر کیا؟“ مجھے سے پہلے طیب نے بے چین ہو کر پوچھ لیا۔

”مگر زیوساکے معاملے میں، میں بالکل بے بُس ہوں۔“

”زیوساکون ہے؟ اور کیوں میرے پیچے پڑی ہے؟“

”اس کا تعلق یونان سے ہے۔ وہ پارس دیوی ہے مگر بے پناہ سفاک بھی۔ اگر یونانی مالتھما لوگی پڑھو گے تو جان سکو گے کہ زیوسا کا بیک گراؤند کیا ہے۔ میں اس زیادہ نہیں جانتی جس قدر مجھے ایں نے بتایا تھا۔ ایں کو جس سورت نے زیوسا کو دکرنے کے لئے وہ زنجیریں دی تھیں، پتا نہیں، اس نے ایں کو کیوں نہیں بتایا کہ۔“

”کیا سوچ رہے ہو؟“ و تسلانے مجھے چونکا دیا۔  
”ہاں.....! میں تمہاری آفر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے کچھ وقت دو۔ میں  
کل پھر تم سے ملتا چاہتا ہوں۔“  
”کل تم دوسری میں آئتے ہو۔“

میں نے طیب کو کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور خود بھی کھڑا ہو گیا۔ پیغمبر ابھی تک اسی  
اڑی ہوئی حالت میں بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے چرے اور آنکھوں کی نیلاہٹ  
میں البتہ مجھے کچھ کمی محسوس ہوئی۔ میں نے اس پر آخری نگاہ ڈالی اور ہم کمرے سے باہر  
آگئے۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ باہر آتے ہی میں گھروالوں کی پریشانی کے متعلق سوچنے  
لگا۔ طیب بھی وقت دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ ہم گھر سے مغرب سے کچھ پہلے نکلے تھے اور  
اب رات کے تقریباً سوادس ہو رہے تھے۔ یہاں سے گھر کا فاصلہ بھی بہت تھا۔ ہم نے  
تائناگا لیا اور اسے کہہ دیا کہ وہ تیر رفتاری سے چلائے۔ ہمیں گھر پہنچنے میں پندرہ منٹ لگ  
گئے۔ منے داداگی میں مثل رہے تھے۔ تائناگا دیکھتے ہی انہوں نے ہماری جانب بڑھنا شروع  
کر دیا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔ باہر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔  
صرف اتنا کہا۔

”اتی دیر کر دی۔“

میں نے جواب نہیں دیا لیکن مسکرا دیا تاکہ وہ ہمارے چہروں پر اطمینان دیکھ کر  
طمینن ہو جائیں۔ تائناگے والے کے پلٹ جانے کے بعد میں انہیں لئے گھر میں داخل ہوا،  
مال، دادی، وغیرہ کو ہمارے دیر سے آئنے پر کوئی تشویش نہیں تھی۔ سب ٹھیک تھا، منے  
دادا ہی بے حد پریشان تھے۔ طیب دادی اور ماں کی طرف چلا گیا اور میں منے دادا کو لے  
کر دادا والے کمرے میں آگئی۔ میں راستے میں یہ بات سوچ چکا تھا کہ مجھے منے دادا کو اعتماد  
میں لہنما پڑے گا۔ وہ نہ صرف یہ کہ تمام حالات سے واقف تھے بلکہ عمر کے حساب سے ان  
میں بخیل، عقل، اور برداشت بھی تھی۔ پہلے تو دادا تھے جن سے میں ہر بات کہہ اور کر  
تائناگا یوں تو میں بی جان کو بھی بتا چکا تھا مگر بی جان بہرحال ایک کمزور عورت تھیں، میں  
بہت سی باتیں ان سے نہیں کر سکتا تھا۔

”کیا ہوا ضیاء.....! تم نے بہت دیر کر دی اور.....“ وہ بڑے غور سے

حالات میں اس کے سرمائے ایسے معاملات یا کمایاں کیا اچھی لگتی ہوں گی! میں نے چاہا  
و تسلماً کو نوک دوں مگر وہ کہہ رہی تھی۔

”تو کیا وہ اپنی حیثیت میں واپس چلی گئی یا نئے رشتون سے اس کا ناط نہ  
گیا؟..... دیے ایسے واقعات چیدہ چیدہ ہی ہوتے ہوں گے جبکہ ان کے عقیدے نے  
ہر شخص سات جنم لیتا ہے۔“

”یہ بھی بحث ہے ختم کرو اسے۔“ میں نے ذرا تیز لجھے میں کمل۔ ”پیغمبر کی حالت میں  
کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، کیوں؟“ میں نے و تسلماً سے کمل۔

”یہ ٹھیک ہو جائے گا تم فکرنا کرو۔ ایسا سے آج تیسری بار ہوا ہے۔“ وہ اب بھر  
مطمئن تھی۔

”مگر اسے ہوا کیا ہے؟“ طیب نے پوچھا۔

”جب یہ قبرستان میں رہتا تھا تب اسے کسی بدرجوانے پریشان کیا تھا۔ بھی بات ہے کہ خود اس نے اسے پریشان کیا تھا۔ یہ کسی قبر کی مٹی اٹھاٹھا کر اپنے کمرے کے فرش  
کی لپائی کیا کرتا تھا۔ کالاں تھا۔ کھدی ہوئی نرم مٹی اس وقت حاصل کرتا تھا جب کسی کو  
قبر کھود جا رہی ہو۔ بہرحال..... اس قسم سے تمہارا کوئی تعلق نہیں حالانکہ آج کی اس  
کیفیت کے ذمے دار تم دونوں ہی ہو لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں۔ جاؤ۔“ پھر وہ میری  
طرف متوجہ ہوئی۔ ”تمہیں سوچنے کے لئے وقت دے رہی ہوں،“ یہ آفر میں نے تمہارے  
فادر کو بھی کی تھی۔“

میں چند لمحے اسے دیکھ کر سوچتا رہا۔ میں اگلے ہی روز اس کے چکر سے نکل سکا  
تھا۔ اس کی آفر قبول کر سکتا تھا مگر ایک بات میرے دماغ میں سوئی کی طرح چھپ رہی تھی  
کہ وہ زیوسا کے سلسلے میں مhydrat کر چکی تھی اور زیوسا کے بارے میں مکمل معلومات  
حاصل کئے بغیر میں زنجیرس اس کے حوالے کر دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ اتنا اندازہ  
تو مجھے بھی ہو گیا تھا کہ ان زنجیروں سے زیوسا کا براہ راست تعلق ہے۔ اگر ایلن اسیں  
حاصل کرنا چاہتی تھی تو بقول و تسلماً کے مھسن اس لئے کہ زیوسا کو قابو میں کر لے اب اگر  
وہ زنجیرس میں اسے دے دیتا تو اس کا مطلب تھا کہ وہ پھر و تسلماً کے زیر سلطنت آ جاتی اور  
ایسا کر کے میں یقیناً اس پر ظلم کرتا خاص طور پر ان حالات میں جب شالی بابا کے علاوہ  
و تسلماً بھی یہ اقرار کر چکی تھی کہ وہ میری ہمدرد ہے کیوں؟ یہ جاننا بہت ضروری تھا۔

تھیں۔ طیب کے مسئلہ بولنے کی آوازیں دادا کے کمرے تک آ رہی تھیں۔ میں کر کے سے باہر نکلنے لگا تو اچانک مجھے یاد آیا کہ طیب بھی میرٹھ جانے کے چکر میں ہے۔ میں نے دادا کو وہیں روک کر کہہ دیا۔ ”میں طیب کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا۔ وہ وقت بہت ضائع کرتا ہے۔ میری بات نہیں مانے گا۔ آپ اسے بھی رو انہ کریں۔“ میں دادا بھی اس کے پلے پن سے الجھ جایا کرتے تھے، انہوں نے وعدہ کر لیا بلکہ خنگی کا اظہار بھی کیا کہ یہ نوکری چھوڑ کر سیر پاٹوں کے لئے کیوں آیا ہے۔

کھانے پر ہی میں دادا نے طیب کی کھنچائی کر دی۔ ”تم یہاں آتے ہوئے غالباً نوکری چھوڑ آئے ہو؟“

دادا کی بات سن کر طیب کے طلق میں نوالہ پھنس گیا۔ جسے نگل کروہ جلد سے بولا۔ ”نہیں دادو.....! چھپیاں لے کر آیا ہوں۔“

”کیوں، بت تھک گئے تھے کیا؟“ ان کے لجھے میں طنز تھا۔ ”ویسے کتنے دن کی چھپیاں ہیں؟“

”وو..... بس دو دن کی۔ اور.....“ وہ گڑبردا رہا تھا۔ میں سر جھکائے کھانے میں مصروف رہا۔ میں نے قطعی ان لوگوں کی باتوں پر توجہ نہ دی۔ مجھے ان کی طرف دیکھے بغیر بھی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بار بار میری طرف دیکھ کر میری مدد کا طلب گار ہے۔

”گھر سے تمہاری دلچسپیوں کی کی کی کافی شرست پہنچی ہے مجھ تک۔“ میں دادا نے زم مگر پہنچتے ہوئے انداز میں کہا۔ ”ظاہر اور زہر بھی تمہاری غیر حاضریوں سے پریشان رہتے ہیں۔“

”وو..... وہ تو میں خیاء کے ساتھ.....“

”یہ خیاء کے وہاں جانے سے پلے کی بات کر رہا ہوں میں۔“ انہوں نے ڈانٹے والے انداز میں جواب دیا۔

طیب کے لئے کھانا کھانا مشکل ہو گیا۔ شاید اسے گمان بھی نہ ہو گا کہ دادا سے کسی اتنی پرانی بات پر ڈانٹیں گے۔ وہ ان کے رویے پر کچھ جیلان بھی تھا۔ مجھے امید ہو چلی تھی کہ اب اگر اسے پتا چلا کہ میں دادا میرے ساتھ میرٹھ جا رہے ہیں تو وہ یقیناً بھیں کاٹکٹ کٹا لے گا۔ اس روز منگل تھا۔ میں دادا کا پروگرام مجھ سے پلے وہاں پہنچنے کا تھا۔ اب میں چاہتا تھا کہ اسے پروگرام کے بارے میں بھی پتا چل جائے۔ میں نے بڑی بے پرواہی سے

میرے چہرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے گرا سانس لیا۔ انہیں بیٹہ پر بھلایا اور پھر کری سکھنے کر ان کے سامنے ہی گیا۔

”منے دادا! آپ اس معاملے کو کماں تک جانتے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم ہے کہ سب کچھ کیوں اور کیسے ہو رہا ہے؟“ میں نے جواب دینے کی بجائے سوال کر دیا۔ ”ہا!“

ان کے جواب نے مجھے چونکا دیا۔ ”کیا معلوم ہے؟“ میں نے جیلان ہو کر پوچھا۔ پھر جو کچھ انہوں نے بتایا، ان میں صرف وہ واقعات نہیں تھے جو میرے ساتھ پڑیں آئے اور جنہیں میں انہیں نہیں بتا۔ کا بلکہ ایں اور زنجیوں کا قصہ بھی شامل تھا۔ بالآخر تمام حرکتیں، ان کے دوستوں کا سارا حال، سب کچھ انہیں پتا چا بلکہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں نے اپنی موصوم غلطی کی وجہ سے اس معاملے کو اس حد تک بگاڑ دیا ہے ورنہ کہ کم یہ عذاب ہمارے پورے خاندان یا محلہ والوں پر کبھی نازل نہ ہوتا۔ یہ سب کچھ انہیں دادا نے بتایا تھا اور وہ واقعات بھی بتا دیے تھے جو میرے ساتھ پیش آئے اور جن کا ذمہ میں دادا سے کر پکا تھا۔ گویا اب ان سے کچھ چھپانا بیکار تھا۔ میں نے یہ سوچ کر دی۔ بھی انہیں بتا دیا جو میں بھتی میں بھگت کر آیا تھا اور یہاں آج جو کچھ ہمارے اور پیڑے ساتھ پیش آیا تھا وہ بھی۔ و تسلی کا نام سن کر تو وہ اچھل ہی پڑے۔ ان کے چہرے پر خدا کی ہلکی سی رمق پھیلی اور معدوم ہو گئی پھر وہ بولے۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ میں اور تم، شالی بیبا سے مل لیتے ہیں۔“

”میں خود ان سے تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں مگر وہ ہمیشہ جلدی میں ہیں۔“

”ہا! ہم اگلے ہفتے ان سے تفصیلی ملاقات کر سکتے ہیں۔“ میں دادا کہا۔

”آپ کو کیسے پتا؟“

”وہ ایک وظیفے میں مصروف ہیں۔ جمعے کے روز فارغ ہوں گے، ہمیں بھی پلے پہنچ جانا چاہئے۔“

میں اور میں دادا پروگرام بناؤ کرہی اٹھے۔ عصمت آپا دوبار آکر کھانے کا کم

خواہش کے بارے میں کہ نہیں سکتا کہ انہوں نے اتنا برا معاملہ کیے اتنی آسانی سے اٹھا دیا۔ عورتیں تو پرانے مکانوں کے کھنڈر بننے تک اس سے چیزی رہتی ہیں۔ منے دادا نے بھی شاید اس غیر موقع خواہش پر انہیں چونک کر دیکھا تھا۔

”بھابی! لہن! قصور اس مکان کا تو نہیں، وہ تو آسیب زده ہے، جو کچھ ہوا اس کے اہل بکار کا اہم اہم تو آپ کو بھی ہو گا۔“

میں جانتا تھا کہ وہ میرنے ابا پر طنز کر رہے تھے۔ وہ بھی ان کی حرکتوں سے خوش نہیں رہے تھے بلکہ اکثر و پیشتر وہ دادا سے ابا کی شکایتیں بھی کیا کرتے تھے۔ انہیں شکوہ تھا کہ دادا انہیں بگاؤ رہے ہیں۔

”مگر بھائی صاحب! عصمت کی شادی ترکے میں وہاں اکیلی کیسے رہوں گی؟“

”کیوں ضیاء نہیں ہے آپ کے ساتھ پھر ماشاء اللہ شجاع اور رضا بھی تو ہیں۔ آخر کو لوٹ کے آئیں گے۔ ان کی شادی کریں گی تو گھر بھر جائے گا۔“

ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اہل کے فیصلے پر خوش نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے کہ اس مکان میں مئے دادا کا کوئی حصہ نہیں تھا مگر پھر بھی اتنی بڑی بات کا اکیلا طے کر لینا انہیں کھل گیا تھا۔ میرے خیال میں بھی وہ بالکل نہ کہ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ عورت فیصلہ کرنے میں بہت جلدی کرتی ہے بلکہ جتنا غالط فیصلہ ہوتا ہے، اتنی ہی جلدی بھی کرتی ہے۔ مئے دادا میرے جذبات کی صحیح ترجیمانی کر رہے تھے اس لئے میں چپ تھا۔

”پھر بی جان اور خالہ بی کے علاوہ فرحت ہے وہاں پر۔ آپ نے مشورہ تو کیا ہوتا کی سے۔“ انہوں نے پھر کہا۔

ان کی ناگواری کو محسوں کر کے اہل بمل کھا کے رہ گئیں۔ اس دوران میں انہوں نے کئی بار میری طرف بھی دیکھا گریں سر جھکائے مصروف رہا۔ اس طرح میرے کچھ کے بغیر میرا مدعایا پورا ہو رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ مجھ سے براہ راست پوچھیں گی تو بات کروں گا۔ انہوں نے مجھ سے بھی مشورہ نہیں کیا تھا، میں ان کا چھوٹا بیٹا سی مگر تھا تو بڑا۔ اہل چپ ہو گئیں۔ منی دادی کن انکھیوں سے انہیں دیکھتی رہی۔ دادی تو بے چاری چپ چاپ بیٹھی رہیں چیزے انہوں نے اس گھر سے بھی اپنی پرائی و اسٹیکیاں ختم کر لی ہوں حالانکہ سب سے زیادہ انہی کو ڈکھ ہونا چاہئے تھا کہ جیسے دنیا ہی لٹ گئی تھی۔ وہ چند نوالے انگل کر کا تھے کھینچ چکی تھیں۔ چرے سے ادا کی ٹپک رہی تھی۔

”منے دادا! شالی ببابا سے ملتا ضروری ہے۔“ ایسا کہتے ہوئے میں بھول گیا کہ میری اس بات سے وہ لوگ بے چین ہو جائیں گے جو اس وقت قدرے پر سکون ہیں۔ مثلاً منی دادی، دادی اور اماں..... عصمت آپا کو تو سیاروں کے مسائل سوچنے سے فرصت نہیں کہ وہ دنیا کے بارے میں کسی تشویش میں بٹتا ہوتی۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی سیارے سے یونہی ذرا گھونٹنے کے لئے کچھ روز کو دنیا میں چل آئی ہیں۔ انہیں واپس جا کر بہت سے کام نمائنا ہیں جن کے سلسلے میں وہ سوچ بچار کر رہی ہیں۔ ہم لوگوں سے بھی کسی طبقاتی وابستگی کا اظہار ان کے کسی رویے سے نہیں ہوتا تھا اس لئے اس وقت بھی وہ بے نیاز کھانے میں مصروف تھیں جب اماں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”اب کیا ہوا؟“ ان کے چرے پر تلقیر پھیل گیا تھا۔

”نہیں.....! کچھ ہوا نہیں۔“

مئے دادا نے میرے گزردانے سے پہلے ہی بات سنبھال لی۔ طیب یقیناً سمجھ گیا ہو گا۔ وہ خوش بھی ہو گیا۔

”ضیاء! کا خیال ہے کہ ان سے ایسی کوئی چیز لے لی جائے جس سے یہ سکون قائم رہے، وہ کہہ بھی گئے تھے کہ میں ان سے میرٹھ میں مل لوں، میں ضیاء کا منتظر تھا۔ ایک سفر کرنے کی عادت ہی نہیں رہی۔“

اماں مطمئن ہو گئیں۔ طیب ہونقوں کی طرح مجھے سٹکنے لگا۔ اس نے سن لیا تھا کہ مئے دادا میرٹھ جانا چاہتے ہیں، وہ بھی میرے ساتھ۔ اس کے ارمانوں پر جیسے پانی پڑ گیا۔ میں پھر بے پرواہی سے بولا۔

”کب جانے کا ارادہ ہے؟“

”آج منگل ہے، اگر کل نکلیں تو زیادہ بہتر ہے۔ ایک دن گھر میں گزار لیں گے۔“

”گھر میں نہ رہئے گا۔“ اہل بوکھلا گئیں۔ ”بی جان کے پاس چلے جائیے گا اور بھائی صاحب! میں چاہتی ہوں کہ مکان بخیج دوں۔ اب وہاں رہنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔“

منی دادی فوراً تائید کرنے لگیں جبکہ میں اس حق میں نہیں تھا۔ وہ برسوں ہمارا مسکن رہا تھا پھر جدی پشتی حولی تھی۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ پرانے لوگ اپنے اسلاف کے علاوہ اپنے درٹے کے معاملے میں بھی بہت جذباتی تھے۔ میں بھی ایسا نہیں چاہتا تھا، اماں کی

”ہیں.....! وہ پسلے چوٹا کا، کچھ سوچا پھر گرا سانس لے کر بولا۔ ”ہاں یار! وہ تو ہیں۔“  
”تم پڑی سے اتر جاتے ہو۔ پسلے تو لا کرو پھر بولا کرو۔ میں کب تک ترازو لئے تمہارے ساتھ رہوں گا؟“ میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کما اور جوتے اتارنے لگا۔ اب میں اتنی اسے ساتھ لانے پر بچھتا رہا تھا۔

”لیکن یار! یہاں ہونے اور دادا ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ آپ ہر معاملے میں دخل دے سکتے ہیں۔ دل کے معاملات میں بھی۔“

”تمہارے دل کے معاملات ماشاء اللہ اتنے دسجع و عرض یہیں کہ اس رتبے میں دوسرے بست سے دل اور معاملات بھی آجاتے ہیں اور یہیں سے تمام ہنگامے شروع ہوتے ہیں۔“ میں چلت یہ لیٹ گیا۔

”نہیں! میں شالی بیبا کے پاس نہیں جاؤں گا۔ زیو سا سے کوئی مطلب نہیں رکھوں گا۔ تمہارے کسی معاملے میں نہیں بڑوں گا۔ اس خوفناک اور عجوبہ شخص، رابرٹ کو قلعی طور پر بھول جاؤں گا۔ ایسا یا والی کوٹھی کے بارے میں تو خیر بالکل نہیں سوچوں گا،“ مویکا کی تاک کا ایک نختناک مجھے یوں بھی پسند نہیں تھا کہ ذرا سا اپر کو اخدا ہوا تھا۔ اس سے تو ملاقات سمجھو ختم۔ جیسے سے بھی بس واجبی کی دوستی سمجھ لو۔ وہ ختم لیکن میں میرٹھ ضرور جاؤں گا۔“

”بول پکے تم۔“ میں جنپھلا کر انھوں بیٹھا۔ اس نے یوں یوں شروع کر دیا تھا جیسے حلف اٹھا رہا ہو۔

”ہاں!“ وہ بلجنی انداز میں بولا۔ ”مگر ضیاء.....! پلیز! میری پر ایلم کو سمجھنے کی کوشش ضرور کرو۔ سارے کام چھوڑ کر تم پسلے یہ مسئلہ حل کرو۔“  
وہ میرے پلنگ پر آبیٹھا۔

”اٹھو.....!“ میں نے غصے میں کما۔

”کیوں؟“ وہ بوكھلا کر بولا۔

”اٹھو یہاں سے۔“ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”لو! اب بولو۔ یار! تم کو گے تو میں مرغناٹک بن جاؤں گا مگر.....“  
میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔

منے دادا نے کھانے پر ہی سارے معاملات نہ شادیے۔ سب سے پہلے طبیب ہی اٹھا تھا۔ سید ھامیرے کمرے میں چاگیا۔ منے دادا بھی سمجھ رہے تھے کہ وہ ڈانٹ کھا کر بد منہ ہو چکا ہے۔ میں نے دادا سے رازداری پر خود کو کچھ مضبوط محسوس کر رہا تھا۔ یہ جان کر بھی اطمینان ہوا تھا کہ بے کنک واقعات پر یقین دلانے کے لئے مجھے ازری ضائع نہیں کرنا پڑی۔ دادا انہیں سب کچھ بتاچکے تھے۔ کھانا کھا کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔ منے دادا نے کہہ دیا تھا کہ ہم کل سویرے میرٹھ کے لئے نکل جائیں گے۔ تجھی بات یہ ہے کہ میرٹھ کے نام پر میرے ذہن میں صرف فرحت کا نام جگلگایا تھا۔ حالانکہ تمام برے حالات و واقعات اور کئی امورات بھی میرٹھ ہی میں ہوئی تھیں، طبیعت کو مکدر ہونا چاہئے تھے مگر آج پہلی بار میں نے محسوس کیا کہ حالات کچھ بھی ہوں، محبت کا جذبہ سب پر حاوی ہوتا ہے۔ ہاں.....! کم از کم میں اس وقت اپنے اس بے نام سے جذبے کو اس کے علاوہ کوئی نام نہیں دے پا چاہا۔ آج سوچتا ہوں تو جذبوں کو الگ الگ کر سکتا ہوں، اس کی بنیاد اور پھر و سمعت کے بارے میں دلائل دے سکتا ہوں۔ انسانی نفیيات اور جذبوں کے مابین اس بے نام کشش کی نشاندہی بھی کر سکتا ہوں۔ اسباب کے بارے میں مدلل ثبوت دے کر ثابت کر سکتا ہوں کہ کون سا جذبہ بے دھیانی میں محبت کا روپ دھار کر کچھ عرصے تک آدمی کوڑا نہیں میں رکھ سکتا ہے۔

بہر حال یہ لمبی بحث ہے، گو کہ کمالی کے اختتام پر یہ بحث ضروری ہے مگر یہاں اس کا ذکر کروں گا تو آپ اپ سینٹ ہوں گے اور کمالی میں بھی شاید جھوٹ پیدا ہو جائے۔ میں اس کمالی کو سیدھے سپاٹ انداز میں بتانا چاہتا ہوں۔ جہاں جس معاملے کی ضرورت ہوگی، میں وہاں آپ کی الجھن دور کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔  
ہاں، تو میں بتا رہا تھا کہ میرٹھ سے وابستہ فرحت کا وجود میرے انتشار کو ختم کرنے کا سبب رہا مگر جیسے ہی میں نے اپنے کمرے میں قدم رکھا، طبیب نے مجھے ہیجانی کیفیت میں بٹلا کر دیا۔

”یار ضیاء! یہ منے دادا کون ہوتے ہیں میرے معاملات میں دخل دینے والے؟“ وہ پچھٹ پڑا۔

”تمہارے سگے دادا ہیں۔“ میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کے ساتھ مسئلہ یہی تھا کہ وہ حالات کی ہی نہیں، رشتہوں کی علیین کا بھی خیال نہیں کرتا تھا۔

”دیکھو طیب.....! یہ جو ادھورا پن اور خلاء تم محسوس کرتے ہو تو اپنے اندر.....“ میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس نے شکل پر مسکین طاری کیا اور بڑی زور سے اثبات میں سرہلا لیا۔ ”یہ تو!“ ”اس ادھورے پن کا احساس نہ صرف مجھے ہے بلکہ منے دادا کو بھی شدت سے یہ احساس ہے۔ اُکار وہ تو یہاں تک کہ بچے ہیں کہ یہ ادھورا پن اس لئے ہے کہ تم سن بوغت کو نہیں پہنچے اور ابھی تمہاری عقل داڑھ بھی نہیں تکلی اس لئے ہے کہ تم اپنے دماغ میں خلاء سامحسوس کرتے ہو۔“

اس کے چہرے کے تاثرات پلے تو ایسے رہے جیسے میں اس پر ہونے والے ظلم کی وضاحت کر رہا ہوں پھر اچانک شاید بات اس کی سمجھ میں آتا شروع ہو گئی، اس نے آنکھیں پھٹپا کر مجھے دیکھا۔ اسن سے پلے کہ وہ کچھ اور کہتا۔ میں نے کہا۔ ”اور پیار کے سب دشمنوں میں تمہارا اپنانام سرفہrst ہے۔“ ”بکواس مت کرو“ وہ ایک دم اچھل پڑا۔

”یہ سونی صد حقیقت ہے۔ ان پر اسرار حالات میں گویہ حقیقت بھی کافی پر اسرار محسوس ہو رہی ہو گئی تھیں گرے۔“

”لغت ہے ایسی زندگی پا!“ اس نے پھر کپڑے نکال کر دوبارہ اپنی کیس میں رکھنا شروع کر دیئے۔ ”سالے تم پر برا وقت پڑا تو دیکھوں گا۔ اللہ کرے تمہیں بھی کسی سے بیار ہو جائے۔ اللہ کرے جدائی کی رت تم دونوں کے درمیان دیوار چین بن جائے۔ اللہ کرے ایک منے دادا تمہارے سامنے بھی ظالم سماج کی طرح اکڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ اللہ کرے.....“

”بس!“ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے چپ کر دیا۔ ”اسے اور بست سے کام ہیں۔“

”کے؟“ اس نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔

”اللہ تعالیٰ کو.....“ سارے کام تو بندے خود ہی نمائیتے ہیں۔ مجھے نیند آری ہے، تم بھی سونے کی و.....“ میں بستر پر لیٹ گیا۔ طیب واقعی حیرت انگیز طور پر۔ وغیرہ فطرت کا تھا۔ وہ آج ہونے والے واقعے پر ذرا بھی نہیں سوچ رہا تھا جبکہ میر کوئی بیکار کا عادی تھا اور دن بھر ہونے والے واقعات پر رات کو ضرور سوچتا تھا۔ اس

”کیا کر رہے ہو یا رہ؟“ وہ بوکھلا گیا اور یہ دیکھ کر تو اس کے چہرے پر ہوا یہ اڑا لگیں کہ میں اسے منے دادا کے کمرے کی طرف لے جا رہا تھا۔ اماں وہیں صحن میں لیٹ تھیں اور دادی مسلسلے پر بینہ کر تسبیح پڑھ رہی تھی۔ دونوں نے حیرت سے میری اور طیب کی طرف دیکھا۔ طیب ان دونوں کو دیکھ کر گڑ بڑا گیا۔ ”ضیاء! میری بات تو سنو۔“ اس نے دھمے سے کما اور خود کسی اڑیل گھوڑے پر طرح زمین پر جم گیا۔

”یہ معاملہ میں نہیں،“ منے دادا ہی حل کر سکتے ہیں۔“

اس سے پلے کہ میں اسے دادا کے کمرے تک لے جاتا، وہ بدک گیا۔ ہاتھ چھڑا رکرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

”ارے! کیا ہوا ہے، کیوں دھاچو کڑی چمار کھی ہے۔“ اماں اٹھ کر بینہ گئیں۔

”پچھے نہیں اماں.....!“ میں واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔

طیب اپنے اپنی کیس میں کپڑے رکھ رہا تھا۔ بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ مجھے آنار کے کروہ آخری جوڑا اپنی کیس میں پیچ کر پنگ پر بینہ گیا۔

”تم میرے کسی کام نہیں آسکتے۔“ مونیکا کو تم نے اٹھ سیدھی حرکتیں کر کے گھر سے نکلا اور اٹھ سیدھے الزامات رکھ کر میرے دل سے۔ جیسے تم ملنے کو تیار نہیں ہوئے۔ اس پیکر صحن کو، جس نے مجھے پہلی بار مدد ہوش کیا تھا، جو ایسا کی کوئی نہیں میسر استقبال کو کھڑی تھی، پر اسرار کہہ کر نکال دیا۔ اب تو بینہ لگتا ہے کہ عورتوں کی طرح مجھے بھی بن دیکھے کسی سے بیا دیا جائے گا۔ دادا میرا جھکا ہوا سرقاضی کے سامنے ہلا دیں گے اور پھر..... پتا نہیں، میرا کیا حشر ہو گا۔“

میری نہیں چھوٹ گئی۔ وہ کسی جلی بھعنی عورت کی طرح ہاتھ نچانچا کر کہہ رہا تھا۔ اس نے میرے مذوے سے آنا قافتانہ اٹھایا۔ فوراً میرے قریب چلا آیا اور بولا۔

”اتھنے ضیاء! میں خود کو ادھورا محسوس کرتا ہوں۔ ایک خلاء سامحسوس ہوں ہے مجھے اپنے اندر..... میں..... میں تمہاری مدد کا طالب ہوں ضیاء! اس ظالم دنیا میں پیار کے دشمن بہت ہیں مگر دوست.....! دوست کوئی نہیں۔“

جب وہ یہ سب کچھ دلپ سکار کے انداز میں کہہ رہا تھا تو مجھے نہ صرف وہ فلم باد آگئی جس کے یہ ڈائیاگ نتھے بلکہ کچھ گانے بھی یاد آگئے۔

اچک ہی کمراں کے خراں سے گونجئے گا تھا۔  
اگلی صبح مجھے اٹھانے والا طیب تھا۔ اس کے چہرے پر انتہائی بُبی اور بے چارگی کے ہماڑات تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے بس وہ اب روٹے ہی والا ہے۔ پسلے تو میں چونا کمر نور آہی سنبھل گیا، اٹھ بیٹھا۔ اس نے تاک سڑکی، شاید وہ چاہ رہا تھا کہ میں اسے غور سے دیکھوں گے! میں نے پھل پنے اور کمرے سے نفل گیا۔

پرانہوں کی خوبیوں نے بھوک بڑھادی تھی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر برآمدے تک پہنچا تو طیب پر اٹھ کھا رہا تھا۔ اماں، دادی اور منی دادی کو "مغلِ عظیم" کی اسٹوری سنارہتا۔ میں نے شکر بھجا کہ اس کا مودہ بحال ہے۔

"بس کرو۔ تین دفعہ کی دیکھی ہوئی فلم ہے۔" عصمت آپا نے سپاٹ انداز میں اسے ڈانت دیا۔

"تین دفعہ.....! ارے! میں نے تیس دفعہ دیکھی ہے مگر اب بھی ایک بار اور دیکھنے کی حضرت نے دم نہیں توڑا۔"

"یہ حضرت تمہارے دم کے ساتھ ہی ٹوٹے گی" انہوں نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

اگر اسی وقت میں دادا نہ آگئے ہوتے تو جانے کیا ہوتا کیونکہ میں طیب کے چہرے پر تھماہٹ بھی دیکھے چکا تھا اور اس کے نہنؤں کو پھرستے ہوئے بھی..... عصمت آپا کو بھی احساس ہو گیا تھا کہ بات اس کے بیوں کے کوارے تک آچکھی ہے۔ انسیں شاید ترس آگیا تھا کہ وہ اٹھ کر جلدی سے چلی گئیں ورنہ بات اس کے بیوں سے پھسل جاتی اور وہ ہر بیوے سویرے میں دادا کی ڈانت کھاتا۔

خنے دادا کی صورت دیکھ کر مجھے فور آہی احساس ہو گیا کہ وہ تمام رات نہیں سو سکے ہیں۔ کیوں.....؟ یہ کافی سوپنے کے بعد بھی میری سمجھو میں نہیں آیا۔ اب وہی کردا رہ رہ گئے تھے۔ پسلے تو صرف ان کا گھرانہ تھا مگر اب اماں اور ہماری موجودگی نے ان کی ذمے داریوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ سب سے نیا وہ پریشانی انسیں دادی کی تھی جو مٹی کی مورت بن کر رہ گئی تھی۔ مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ وہ دادا سے اس قدر محبت کرتی ہوں گی۔ میں نے زندگی میں تو انہیں ایسا کی وجہ سے دادا سے لڑتے ہی دیکھا تھا۔ یہ تو مگان بھی نہیں تھا کہ دادا کی موت ان کی زندگی کو یوں اپنی بانہوں میں لے لے گی کہ وہ زندہ

طرح اپنا محاسبة بھی آسان ہو جاتا تھا اور واقعات کے اسباب کی وضاحت بھی ہو جاتی تھی مگر وہ لیٹنے کی بجائے ہملنے لگا۔ اس کی تمام تر کوشش تھی کہ میں اسے اپنی کیس تیار کرتے نہ صرف یہ کہ دیکھ لوں بلکہ پوچھوں کہ وہ کمال جا رہا ہے اور پھر یہ جان کر کہ وہ کمیں جانے کا مضمون ارادہ کر چکا ہے اسے مناؤں۔ کوئوں کہ میں منے دادا سے بات کرنا ہوں کہ وہ میرٹھ لے چلیں مگر میں ایک گھنا آدمی تھا۔ یہ میری ہی تو خواہش تھی کہ وہ بہمیں چلا جائے۔ میں نے اپنی کیس کی طرف دیکھانے اسے کپڑوں کی اٹھائیخ کرتے دیکھ کر تشویش کا انہصار کیا بلکہ میں نے لائٹ بجھادی۔ انہیڑا ہوتے ہی اس کی آواز سنائی دی۔

"یہ انہیڑے جو تم میری زندگی میں بھرنے کی کوشش کر رہے ہو ہی ضایاء.....!  
ایک نہ ایک دن بھی انہیڑے سیاہ ہاگ بن کر تمہیں ڈس لیں گے۔"

"کون سی فلم کا ڈیلیاگ ہے؟" میں نے فوراً پوچھا۔  
وہ بے اختیار بولا۔ "رام تیری گناہ میلی" پھر خود ہی کھیا گیا۔ "بکواس کرلو۔ آن تمہاری باری ہے نا۔" کل جب میری باری ہو گی تب میں ہتاوں گا تمہیں۔" میں نے جواب نہیں دیا۔ میں وسلا اور پیٹر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں پیٹر کو جس حالت میں چھوڑ آیا تھا، وہ تشویشناک تھی۔ پتا نہیں، وہ ٹھیک ہوا ہو گایا نہیں۔ وسلا ایک معدور عورت تھی مگر ہم بھی کیا کرتے؟ منیر رکنا ہمارے بس میں نہیں تھا۔ منے دادا کی پریشانی الگ تھی۔ اب احساس ہو رہا تھا کہ ہمیں یوں نہیں آنا چاہئے تھا۔ پیٹر نے ہمارا ساتھ دیا تھا، وسلا سے ملایا تھا اسے اس حالت میں چھوڑ آتا صدقی صد ہماری بے خوبی لیکن اب رات تو گزارنا ہی تھی پھر وسلا نے ان زنجیروں کا مطلبہ کیا تھا۔ وہ میر کسی کام کی نہ تھی۔ میرے حساب سے تو انہیں وسلا کے حوالے کر دیا ہی بستر تھا مگر میں دادا نے مجھے اس ملٹے میں شالی بیبا سے مشورہ کرنے کی ہدایت کی تھی اور یہ ایک معقول بات تھی۔ ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ جلد ہی مجھے اس پر بھی بچھتا ناپڑتا۔

طیب کی آواز بند ہو چکی تھی۔ میں نے دھیرے سے سر گھما کر دیکھا۔ وہ کروٹ لئے لیٹا تھا۔ اپنی کیس اب بھی اس کے پلنگ کے اوپر ایک طرف رکھا تھا۔ پسلے میں سوچا کہ اسے اٹھا کر نیچے رکھ کر دوں مگر پھر یہ سوچ کر ڈر گیا کہ وہ بولنا شروع ہو گیا تو سارہ رات بتا رہے گا۔ بتا واقع اسے سوپنے کو مل چکا تھا، اس میں تو اس نے کئی فلموں ڈیلیاگ یاد کر لئے ہوں گے۔ میں دم سادھے لیٹا رہا اور دوسرے ہی لمحے اچھل پڑا کیونکہ

رہتے ہوئے بھی زندوں میں شامل نہ ہوں گی۔ نیشن ہو گیا کہ محبت گریز پا تھی۔ میں تو ناشتا خاموشی سے کرتا رہا۔ منے دادا سے اس وقت کچھ پوچھنے کا موقع نہ تھا طیب سے بات کرنا شد کی کمبوں کے چھتے کو چھیرنے کے متراوف تھا۔ دادا چپ تھی وہ زندہ رہنے کو دنوں کے کھالیتی تھیں اور گھر میں کسی سائے کی طرح بے چاپ پھراؤ رہتی تھیں۔ اماں اپنے ہی جھیلوں میں لگ گئی تھیں۔ جب اباکی موت نے ہی انہیں نہ حوال نہیں کیا تو دادا کی موت کب تک اثر انداز ہوتی۔

”هم آج شام کو نکل لیں گے۔“

اچانک منے دادا نے کہا۔ ”جی منے دادا.....!“ میں نے قطعی سر نہیں اٹھایا

طیب جمال بینجا تھا، وہاں جیسے کسی طوفان نے کروٹ لی تھی۔ ”اور تم.....!“ دادا نے گونج دار آداز میں کہا تو میں نے انہیں دیکھا۔ وہ طیب سے مخاطب تھا۔ ”تم بمبی جاؤ۔ انسانوں کی طرح گھر میں رہو۔ نوکری پر پابندی کے ساتھ جاؤ اور مغرب سے پسلے گھر لوٹ آئے کی عادت ڈالو۔ بمبی جا کر رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی اپنی تندیب بدل ڈالے۔“

”جی.....! جی منے دادا.....! میں آج تو نہیں، کل چلا جاؤں گا۔“ اس نے نواہ شاید بغیر چبائے نکل لیا تھا کیونکہ اس کا چڑھہ سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں بھی سرخ تھیں۔

”کیا کرو گے یہاں رہ کر اضیاء جارہا ہے۔“ انہوں نے اس بار کچھ نرمی سے کہا۔ ”منے دادا! ابھی تو میں نے منی دادی سے جی بھر کر باتیں بھی نہیں کیں۔“ روہاںسا ہو گیا۔

”تمیں منی دادی سے اتنی محبت کب سے ہو گئی؟“ انہوں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”ارے! کیا ہے۔ آپ تو چیچے پڑ کر رہ گئے چے کے..... ضروری تو نہیں کہ طاہر میاں نے جو کچھ کہا اور زہرہ بی نے جو بتایا، وہ سب کا سب سچ ہو۔ ہمارے یہاں پڑے ہونے کا صرف ایک ہی فائدہ اٹھایا جاتا ہے کہ خود بھی خوب ذات اور دوسروں سے بھی ذات پڑاو۔ چلا جائے گا۔ آپ جائیں میری تھی.....!“

منی دادی کو طیب کی حالت پر ترس آیا تھا یا اندر چھپی کسی محبت کا ابال تھا بہر حال

طیب کے چہرے کی مسکینی اور بڑھ گئی۔ ناشتے کے فوراً بعد منے دادا کے باہر جاتے ہی اس نے میرا تھے کپڑا اور کھینچتا ہوا اندر کمرے میں لے گیا۔

”میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں ضیاء! طاہر بھائی سے بھی جا کر پوچھوں گا کہ وہ یہاں اس لئے آئے تھے اور یا را! یہ تمہاری بہن کس منشی کی بنی ہوئی ہے!“

”اس پرے میں معلومات کم ہیں میری۔ بہر حال تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ میں نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔ وہ جو اس کے اندر ایک ابال سا آیا ہوا تھا، جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر لاثا سا بیٹھا پھر بولا۔

”جاتا ہوں بمبی.....! ورنہ منے دادا مجھے خود چھوڑنے جائیں گے۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کا اتنی جلدی مان جاتا مجھہ ہی تھا ورنہ مجھے یہ لٹک تھا کہ وہ کوئی بے وقفي کی ترتیب ضرور بیٹائے گا۔ اب میں نے اس سے کوئی بات کرنے کی بجائے تیاری شروع کر دی۔ جاتا تو ہمیں صرف دو تین دن کے لئے تھا مگر حالات کیارخ اختیار کر لیں، یہ اعتبار ختم ہو گیا تھا۔ بمبی میں تو طیب تھا، طاہر بھائی تھے، ان کے کپڑے کام آگئے تھے مگر میری ٹھیک نہیں تھا کہ میں اسکے جنیں میں ان کی جنیں استعمال کر سکوں۔ طیب مجھے تیاری کرتا دیکھتا رہا اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا۔

”سنو! میرا سلام محبت تو کہہ دو گے!“ وہ اچانک بولا۔ جی تو چاہا کہ پلٹ کر لاثا تھے دوں مگر بخط کر گیا۔

”کہہ دوں گا۔ اگر جو بنا تھپڑا تو وہ تم سے چکالوں گا۔ اب فرحت کے اور میرے تھپڑیں فرق تو ہے نا!“

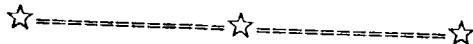
”ارے نہیں یار.....! تم دیکھنا، اس کی آنکھوں میں چراغ جل انہیں گے۔ ہونٹوں پر مسکان پھیل جائے گی۔ لانبی لانبی پلکیں جیا کے بوجھ سے جھک جائیں گی اور.....!“

”بس.....!“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ میرا الجہ تیز اور انداز اکھڑا ہوا تھا مگر اس پڑوڑہ برابر اثر نہ ہوا۔ میں اس کی طرف پلٹا تو وہ خلا میں تک رہا تھا اور اس کے چہرے پر سکراہٹ تھی۔

میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ پتا نہیں، کیوں میرا غصہ بڑھنے لگا۔ یہ بچ ہے کہ فرحت سے میرے جذباتی لگاؤ کا خود مجھے بھی اندازہ نہ تھا۔ ہم نے کوئی عمد و پیمان بھی

آواز تھی۔  
”اے! کیا بک رہا ہے تو؟“ منی دادی کی آواز آئی۔

”نہیں! نہیں! میرا مطلب یہ تھا کہ کیا پتا، میں جاؤں تو پھر کبھی لوٹ کے نہ آنکوں۔“ طیب نے گہرا کر جواب دیا۔ میں باہر کھڑا نہ رہا تھا۔  
”اگر آیا تو جو تے کھائے گا۔“ منے دادا نے غصے سے کما اور باہر نکل آئے۔



نہیں کے تھے۔ ہاں لی جان سے میں ایک وعدہ کر چکا تھا، اس ناطے میں اس کے لے جذباتی بھی ہو سکتا تھا مگر ایسا کہ میرا خدا غائب جائے، یہ میرے لئے حیرت کی بات تھی شاید اس میں زیادہ ہاتھ طیب کے چیخمورے انداز کا تھا۔ ہر حال اس کے بعد میں کچھ مصروف ہو گیا۔

مجھے واقعی آفس جاکر حالات معلوم کرنا تھے۔ میرا ایسی ڈی بردا خرد ماغ آدمی بندا میری کافی چھیاں ہو چکی تھیں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میں مزید چھیاں حاصل کر سکوں گا۔ ہر حال حالات کا جائزہ تو لینا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں میرے ہی ہاتھ کر لکھی ہوئی ایک اور درخواست پیچ چکی تھی جس میں مزید ایک ماہ کی چھٹی طلب کی گئی تھی اور وہ چھٹی منظور بھی ہو چکی تھی حالانکہ میں نے ایسی کوئی درخواست نہیں دی تھی بلکہ آج اپنے ساتھ لکھ کر لے گیا تھا۔ جب مجھے علم ہوا تو زیوسا کا نام میرے دماغ میں سرسریا مگر یہ بھی ضروری نہیں تھا؛ میں ابھی تک ایمن اور زیوسا کو الگ کر کے نہیں ہوں گے کا تھا۔



میں مگر پہنچا تو دن کے تین بجے رہے تھے۔ اس زمانے میں پانچ بجے میرٹھ کے لئے گازی روانہ ہوتی تھی اور گھنون میں کہیں جاکر رات گئے میرٹھ اتارتی تھی۔ منے دادا تیار تھے۔ امال نے بی جان، خالہ بی اور فرحت کے لئے بہت سی چیزوں دیں۔ رات کے لئے چائے، کھانا سب ساتھ کر دیا۔ طیب کسی اداں الو کی طرح برآمدے کے پلے؛ اکڑوں بیٹھا ہمیں تیاری کرتے دیکھ رہا تھا۔ اس کا اپنی کیس بھی قریب ہی رکھا تھا حالانکہ اسے بھی کے لئے کل صبح روانہ ہونا تھا۔ اپنی کیس سے شاید وہ منے دادا کا دل چکھا لئے کا آخری چانس لینا چاہتا تھا۔ میں نے رخصت ہوتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا تو اس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کر کے اور ہاتھ مانتے تک لے جاکر ”سلام محبت“ پہنچانے والا وعدہ بار دلایا۔ میں جبڑے بھینچ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میں نے منے دادا کا جملہ سا جو وہ منی دادی سے کہہ رہے تھے۔

”اس بذر کو میری واپسی سے پسلے بھینچ دینا۔“

”اگلے پل کی خبر نہیں ہے منے دادا! موت ہر وقت آدمی کے تعاقب میں رہتی ہے۔ آپ جاتے جاتے میرا دل دکھا رہے ہیں۔ وہاں ہربات کا حساب ہو گا۔“ یہ طیب کے

”میں نے کہا تاکہ میں شالی بابا سے ملاقات کے بعد ہی تمہیں صحیح صورت حال بتا سکوں گے۔ کیا تم ایسا کچھ محسوس نہیں کر رہے؟“ ان کی آنکھوں اور انداز میں کھوج تھی۔ ”نہیں!“ میں نے کچھ دیر خود کو اندر سے ٹول کر جواب دیا۔ ”میرا خیال ہے کہ کچھ بھی میری مرضی کے خلاف نہیں ہو رہا۔“

”کیا زیو سانے کچھ نہیں کہا۔“

”جی!“ میں چونک اٹھلے ”میں سمجھا نہیں۔ کیا زیو سامیرے خلاف یا حق میں فیصلہ کرنے کا استحقاق رکھتی ہے؟“

”نہیں! میرا مطلب ہے کہ کیا اس نے تم سے کوئی بات نہیں کی۔“

”میں تو منتظر ہوں کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرے“ میں نے خود کلائی کے انداز میں کہا۔ فوراً ہی میں چونک اٹھا۔ ان کے انداز سے پتا چل رہا تھا جیسے زیو سانے ان سے ضرور کوئی بات کی ہے۔ ”کیا بات ہے منے دادا! آپ صاف صاف بتائیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ آپ کو دھوکا دے رہی ہو اور آپ.....“

”ضیاء.....! بیٹا! بعض اوقات بچپن کی غلطیاں زندگی بھر تھا۔“ عطا نے جو کچھ کیا، وہ جان بوجھ کر کیا اور تم نے جو کیا، وہ انجانے میں کیا۔ انگر معاملات دونوں ہی تین میں ہیں۔ بہر حال، ”میرا خیال ہے کہ ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ زیو سا کا انداز زم ہے،“ حلا نکہ میں امید نہیں کر سکتا۔ یہ یوں میں ایک ایسی دیوبی کی شہرت رکھتی ہے جو انتہائی سفاک ہے۔ گواں کا تعقیل نفسانی خواہشات سے ہے اور انسانی زندگی میں نفسانی خواہشات لذت اور سرور کا باعث سمجھی جاتی ہیں مگر بیٹا! ہر جذبے کے درخ ہوتے ہیں۔ ایک خیر اور دوسرا شر۔ زیو سانام کی دیوبی شر سے منسوب ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ یوں میں بھی یہاں ہندوستان کی طرح مادرانی باتیں یقین کاروپ دھار لیتی ہیں کیونکہ وہاں کے لوگ بہر حال یہاں سے زیادہ سویلہ رہ ہیں مگر پڑا سار قوتیں تو پوری دنیا میں ہر جگہ موجود ہیں۔ یہ عقائد کی کمزوری سے ہٹ کر کوئی بات ہے۔ کوئی ایسا سار جو نظر نہیں آتا ہے۔ محسوس بھی ہوتا ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کر رہا ہوں۔ ”میرا خیال ہے کہ میں بہت جلد اصل بات کو پالوں گا لیکن فی الوقت ہم اپنے آپ کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں۔ شالی ببابا سے ملتے ہیں، اگر وہ نہیں ملے تو وشوانتھ کے پاس چلیں گے۔“

ہم اشیش پہنچے تو ٹرین چلنے میں کافی دیر تھی۔ ہم نے چھوٹی بوگی بک کر الی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ہم اس محاں پر بہر حال سوچ بچار اور بات چیز کرنا چاہتے تھے۔ یہ گھر میں بھی ممکن نہ تھا کہ کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔ گھر والے ہی چاروں طرف متلاطے رہتے تھے۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ صبح منے دادا کی ٹھکل دیکھ کر مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ رات بھر جائے اور پریشان ہوتے رہتے ہیں لیکن ابھی تک ان سے کچھ پوچھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ سیٹوں پر بیٹھے ہر ٹرین چلنے کا انتظار کرنے کے دوران میں، میں نے منے دادا کے اضطراب کو بڑھتا محسوس کیا۔ یہ اضطراب اس وقت تک رہا جب تک ٹرین نہیں چل پڑی۔ گوئیں دروازہ بند کر چکا تھا مگر کھڑکی سے شور کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں کیونکہ پلیٹ فارم پر رش تھا اور گاڑی رینک رہی تھی۔

جیسے ہی اشیش ختم ہوا، دادا ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”ضیاء! ہمیں کچھ ہی دنوں میں کچھ اہم فیصلے کرنے پڑیں گے۔“

”مثلا.....!“ میں ان کی طرف پوری طرح متوجہ ہو گیا۔

”یہ میں شالی ببابا سے ملاقات کے بعد بتاؤں گا مگر..... ضیاء.....! شاید تمہیں ان فیصلوں سے مایوس ہو۔“

اب میں چونک اٹھا۔ ان کے جملے کا مطلب تھا کہ وہ فیصلے یقیناً میرے خلاف ہوں گے مگر کیا.....؟ میں نے چند لمحے سوچا۔ ”منے دادا! کیا آپ نے وہ مکان بیٹھے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“ فوری طور پر میری سمجھ میں یہی بات آئی۔

”نہیں!“ وہ جلدی سے بوالے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے نگاہ چڑا گئے ہیں۔

”پھر.....؟“ اب میں مضطرب ہو گیا۔

میں جو منے دادا کی معلومات پر جیران ہو رہا تھا، وشواناٹھ کے نام پر چونکہ انھا۔  
وشواناٹھ کون ہیں؟“۔  
”تم لوگے تو پتا چل جائے گا۔“ منے دادا نے بات مال دی۔ ”میں کچھ دیر لیکر  
گا۔“

وہ تو یہ کہہ کر لیٹ گئے اور مجھے پلی بار خیال آیا کہ میں جو خود کو برا عقل سے  
معاملہ فرم اور گھاگ سمجھتا ہوں، زرا گاؤڈی ہوں۔ یہ تو میں بھی سن چکا ہوں کہ زیوساہ  
کی دیوی یوتان میں کس قسم کی شہرت رکھتی ہے۔ یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا کہ وہاں  
ماطیلوی میں اس کی تفصیل پڑھتا، وہاں کے عقائد جان کر معاملے کی تھے تک پہنچنے  
کو شش کرتا۔ یہ پتا کرتا کہ آخر ایلن کا ان زنجیروں سے کیا تعلق تھا۔ ٹھیک ہے کہ  
اسے کسی عورت نے یہ کہہ کر دی تھیں کہ وہ ان کی مالک بن کر دنیا کی امیر ترین عورت  
بن جائے گی مگر وہ تسلانے مجھے بالکل مختلف بات بتائی تھی کہ وہ زنجیروں کو محض اس لے  
حاصل کرنا چاہتی ہے کہ زیوساکو قابو میں کر سکے۔ یعنی اس طرح تو ابا اور رابرٹ  
ساتھ ہونے والی ساری کمائی ہی بے نیا ہو جاتی تھی پھر وہ تسلانے یہ بھی کہا تھا کہ ایلن  
جانے کے باوجود کچھ روحوں کو روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور انہیں اذیت سے دوچا  
کر رہی ہے۔ وہ زنجیروں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ میں یہ سب سوچ رہا تھا اور ساری باتیں  
آپس میں گذڑ ہو رہی تھیں۔

☆-----☆-----☆

قائدے سے توڑیں کو آٹھ نوبجے تک میرٹھ پہنچ جانا چاہئے تھا مگر وہ رات سوا  
گیارہ بجے میرٹھ پہنچی۔ اشیشن سے گھر کا فاصلہ بھی تقریباً آٹھ، نو کلو میٹر تھا۔ ہمیں  
ساہیک رکشا سے گیا۔ رکشا والا بھی سخیم، چوڑا چکلا لڑکا تھا۔ کافی باقونی بھی تھا۔ اس نے یہ  
فاصلے کافی تیزی سے طے کیا اور اتنی ہی تیزی سے میرٹھ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی  
حالات سے بھی آگاہ کرتا رہا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ سب کی خیریت بھی پوچھی۔ مبشر کے  
دالے پر کافی دیر تک اطمینان افسوس کرتا رہا۔ ہمارے مکان کے بارے میں بھی پوری  
معلومات حاصل کر لیں بلکہ ہمارا عنید یہ بھی لے لیا کہ ہم اسے پہنچا جائیتے ہیں یا نہیں۔ اس  
زمانے میں اٹیٹھ ایجنسیاں نہیں ہوتی تھیں جس طرح رشتے کروانے والی عورتیں ہوتی  
تھیں اسی طرح یہ تائے والے، ساہیک رکشا والے ہی جائیداد کی خرید و فروخت میں  
معاونت کیا کرتے تھے۔ ایک بات آپ نے کہ دی، اب رات تک وہ خبر ہر میرٹھ آنے

منے دادا آنکھیں بند کے لیئے تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ چھپا رہے ہیں۔  
بھر حال، یہ فیصلہ میں نے کر لیا کہ فرصت پاتے ہی میں اس زیوسانائی دیوی کے بارے میں  
معلومات ضرور حاصل کروں گا۔ جیرت مجھے یہ تھی کہ کمال یوتان اور کمال اٹیٹھ! اب اُر  
سیرپاٹوں کے شوقین نہ ہوتے اور رابرٹ وغیرہ سے ان کی دوستی نہ ہوتی تو شاید یا لہ  
دیوی، دیوتاؤں کا چکر اٹیٹھ تک نہ پہنچتا۔ اٹیٹھ میں کم دیوی دیوتا ہیں کہ جو باہر سے گز  
اس مگل ہو جاتے مگر جو کچھ ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ اب میری پریشانی تو صرف اتنی رہ گئی تھی کہ  
منے دادا ایسے کون سے فیصلے کرنا چاہتے ہیں یا کرنے پر مجبور ہیں جو میرے خلاف ہوں  
گے۔ جب سوچ سوچ کر میرا دماغ پھوٹے کی طرح پکنے لگا تو میں نے اپنے ذہن کو ہ  
اندیشے سے خالی کر لیا۔ میں اب کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ ان کریمہ سوچوں سے نجات د  
تو فرحت کا خیال نرم جھوٹکے کی طرح مجھے تزویزہ کر گیا۔

آدھے گھنٹے بعد ہی سب ٹھیک ہو گیا۔ اماں کی بھیجی ہوئی چیزوں نے بھی کچھ اطمینان دلایا۔ عصمت آپا نے فرحت کے نام خط بھیجا تھا۔ خیر خیریت کی باتیں ہوتی رہیں۔ نہ دادا سونے چلے گئے۔ غالہ بی بھی سو گئیں مگر میں، لی جان اور فرحت بڑی رات تک آنگن میں پہنچا۔ اے باتیں کرتے وہے۔ فرحت کی آنکھوں میں چک تھی۔ اس چک کو دیکھتے ہی مجھے طیب یاد آگیا۔ اس نے کہا تھا کہ تم دیکھنا، اس کی آنکھوں میں چرا غبل اٹھیں گے۔ ہونٹوں پر مسکان ہو گی اور لانبی لانبی پلکیں حیا کے پوچھ سے جھکی ہوں گی۔ بالکل دیساں تھا مگر یہ سب کچھ طیب کا نام لئے بنت تھا۔ میں نے قلعی اس کا کوئی ذکر کیا۔ سلام محبت پیش کیا۔

”جاوے فرحت! تم جا کر سوو۔ سویرے اٹھنا ہے پھر سلمندی ہو گی۔“ لی جان نے فرحت سے کہا۔ وہ شہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ گئی حلاںکہ وہ قلعی مجھ سے بے تکلفی سے بات نہیں کرتی تھی اور اس وقت بھی وہ کم ہی بول رہی تھی مگر پُرشوق نگاہوں سے اس کا دیکھا۔ پوری توجہ سے میری باتیں سننا ہی مجھے اچھا لگ رہا تھا لیکن میں لی جان کی بات سے اختلاف بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ زمانہ تو وہ تھا جب بارہ بجے تک لوگ آدمی نیند سو لیا کرتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اسے نیند بالکل نہیں آئے گی مگر وہ چلی گئی۔ اس کے جاتے لیلے جان کا الجہ تشویشاںک ہو گیا۔

”شیاء! سب خیریت تو رہی ہا!“

”تکی بی جان! واقعی قسم سے سب خیریت رہی“ میں نے یقین دلایا۔  
”لیکن یہاں خیریت نہیں رہی۔“

”یا..... کیا مطلب؟“ میں چونک کر سیدھا ہو گیا۔ ”کیا ہوا؟“  
”لوگوں کو مبشر دھائی دیتا ہے۔ اکثر نے قسم کھا کر بتایا ہے کہ وہ گلیوں میں کسی کو غلاد کرتا پھرتا ہے اور اس کی حالت بالکل ویسی ہوتی ہے جیسی مرتب وقت تھی۔ بدن اوہڑا ہوا ہوتا ہے۔ خون کے قطرے نپک رہے ہوتے ہیں۔ بس وہ بول نہیں پاتا بلکہ سب کی غلوں غلوں کی آوازیں نکالتا ہوا دایاں ہاتھ یوں آگے کو پھیلائے جیسے کسی کو کچھ درنا پڑتا ہو، گلیوں میں لڑکھڑاتا پھرتا ہے۔ یہ صرف اسی روز ہوتا ہے جس روز وہ مرا

اور ہر جانے والے کو پتا چل جاتی تھی۔ گویا یہی لوگ اشتماری انجمنی کا کام بھی کرنے تھے۔ بہر حال میں تمام تروجہ سے سارے حالات ستارہ بہ۔ اتنے عرصے سے باہر تھا۔ ار گلیاں اندر ہیرے میں بھی بڑھ کر استقبال کرتی محسوس ہو رہی تھیں اور اس لڑکے کا بیو پورے میرٹھ کے لجھے کی اپنائیت لئے ہوئے محسوس ہو رہا تھا۔

ہم گھر کے دروازے پر پنچے تو شاید پونے بارہ کا عمل تھا۔ آنگن کا ایک بلب۔ زرد روشنی سے پورے ماحول کو بو جھل کئے ہوئے تھے۔ ہم نے سائیکل رکشا والے کرایہ ادا کیا۔ میں نے دادا سفر سے تھک گئے تھے یا حالات سے مضھل تھے۔ میں نے دروازہ کھلکھلایا۔ مجھے اندر قدموں کی چاپ سنائی دی پھر معدوم ہو گئی پھر کھلکھلایا۔ غالہ بی کی آواز آئی۔

”کون ہے؟“

”غالہ بی! میں ہوں ضیاء.....!“ انہیں شاید یقین نہیں آیا یا وہ سمجھیں نہیں کہ کون ضیاء۔

”کون ضیاء.....! کس سے ملتا ہے.....؟“

”غالہ بی! میں دہلی سے آیا ہوں۔ ضیاء الرب.....! دروازہ کھولیں۔ میر ساتھ منے دادا بھی ہیں۔“

”اللہ خیر!“ غالہ بی کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی پھر انہوں نے کندھی کھولتے ہوئے اندر پکار کر بی جان کو ہماری آمد کی اطلاع دے دی۔ ”اے! دہلی سے ضیاء آیا ہے، اتنے رات کو۔“

لی جان کے کمرے سے باہر آنے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا۔ غالہ بی کے چہ پر ہوا یہاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے فوراً کہا۔ ”سب خیریت ہے۔“ اتنے میں بی جان اور فرحت بھی باہر آنگئیں۔ دونوں پریشان تھیں۔ ہمارے چروں پر کچھ نٹولتی ہوئی۔ بدب انسیں اچھی طرح اطمینان ہو گیا تب ان کی آوازیں نکلیں۔ میں دادا کو دیکھ کر وہ اور جیلان تھیں۔ وہ کبھی لی جان کے گھر نہیں آئے تھے۔ شاید پہلی بار یوں رہنے کے لئے آئے تھے مگر میں نے موقع ملنے ہی لی جان کو بتا دیا کہ ہم شالی بابا سے ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ ہم طرح خیریت ہے مگر حفظ ماقدم کے طور پر سکون کے وقت ان سے ملنا چاہتے تھے۔ نہیں، انہیں یقین آیا یا نہیں، مگر وہ شاؤ ختم ہو گیا جو ہماری آمد سے ان کے چروں پر چاہا

مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کیونکہ سائیکل رکشا والے نے سارے حالات بیان کر رکھا تھا مگر یہ نہیں کہا کہ ایسا کوئی واقعہ بھی گردش کر رہا ہے۔ ”جان! یہ آپ سے کس نے کہا؟“

”اے! سارا محلہ بلکہ سارا میرٹھ کہہ رہا ہے۔“  
میں الجھ گیا۔ میں بیان کو جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ ان لوگوں میں نہیں تھیں جو بات کا بنتا تھا لیتے ہیں یا کسی واقعے کا ذکر کر کے، سختی پیدا کر کے اپنا کافی شوق پورا کرتے ہیں۔

”صبح کو نکلو گے ہاتم..... خود سن لینا۔ محلے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ“  
یہاں سامنے والی سڑک سے بالکل یوں آ رہا ہوتا ہے جیسے اس روز آپ کے گھر کی طرف آ رہا تھا اور یوں کسی کی طرف ہاتھ پر ڈھار کھا ہوتا ہے جیسے اس روز سامنے ضیاء کھڑا تھا۔ ”خود سن لینا۔“

وہ شاید سمجھ گئیں کہ مجھے لیکن نہیں آ رہا ہے۔ ”نہیں! ظاہر ہے، آپ بتا رہی ہیں تو غلط تو نہیں ہو گا۔“ میں نے دھیرے سے کہا اور اپنے ٹنک کی وجہ بھی بتا دی۔ ”ہاں! تو اس نے یہ سوچ کر نہیں بتایا ہوا گا کہ تمہارے ساتھ بڑے میاں تھے۔“  
ہولناک قصہ بچوں یا بوڑھوں کے سامنے یوں منہ کھول کر رات کے پچھلے پر بتانا ٹھیک بھی تو نہیں تھا۔

اے! کوئی سلجمحا ہوا پچھہ ہو گا۔“  
وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ وہ کافی سلجمحا ہوا بلکہ پڑھا لکھا لڑکا لگ رہا تھا۔ ممکن ہے اس نے مبشر کا ذکر کیا یہ سوچ کے نکلا ہو پھر منے دادا کی وجہ سے گول کر کے بات پلٹ دی ہو کہ کہیں اتنی رات کو یہ خوف سے لڑھک نہ جائیں۔

”اچھا اب سولو۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد ہی پھر اٹھنا پڑے گا۔ میری آنکھوں میں تو بل ہونے لگی۔ اللہ تیرا شکر ہے کہ سب خیریت ہے ورنہ تو میں بالکل ہی ہوں گئی تھی۔“ بل جان یہ کہتی ہوئی سونے چلی گئیں۔ میں وہیں پلنگ پر پھیل کر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اگلے روز ہم ناشتے کے بعد اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ منے دادا مکان کو اندرا سے دیکھنا چاہتے تھے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اندر کی حالت دیکھ لوں۔ کمرے تو بند کئے

جئے تھے۔ سامان بھی اندر تھا۔ ایک نظر ڈالنا ضروری تھا۔ اماں نے تو تخت سے تاکید کی تھی کہ وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے مگر منے دادا کا اور میرا خیال تھا کہ ہم کم از کم ایک نظر ضرور دیکھ لیں گے۔ کچھ ضرورت کا سامان جو لے جیتا جا سکتا ہے، لے جائیں گے۔ پہلے تو ہم افراحتی میں گئے تھے پھر ایک آدھ وفعہ دادا آئے تھے مگر ہم سے کسی کو لے کر نہیں آئے تھے۔ ممکن ہے، منے دادا کو پتا ہو کہ کیا رہ گیا اور کیا دادا لے گئے۔ یہ تجویز منے دادا کی تھی کہ وہاں جانا چاہئے۔

ہم اپنے محلے میں پہنچے تو محلے والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ منے دادا کو بھی لوگ پہچان گئے اور مجھے بھی۔ میں تو خیر کچھ عرصہ پہلے ہی ہو کر گیا تھا۔ میں اور منے دادا اپنے گھر جانے سے پہلے مبشر کے گھر گئے۔ میں آپ کو بتا پکا ہوں کہ اس کا گھر ہمارے گھر کے بالکل قریب تھا بلکہ ہمارے گھر کی شمالی دیوار اور ان کے صحن کی دیوار ایک ہی تھی۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے تو یہ افسوسناک خبر بننے کو ملی کہ مبشر کے والد لمبے عرصے تک یہاں رہ کر گذشتہ میں مر گئے۔ اماں اور بھیں ہیں یا مبشر کے دو چھوٹے بھائی۔ یہاں بھائی کلکتہ چلا گیا تھا۔ وہ بُک میں کام کرتا تھا۔ وہاں پوسٹنگ کی وجہ سے یوں، بچوں کو بھی لے گیا تھا۔ چھوٹے دونوں کنوارے تھے اور اب وہی گھر سنبھالے تھے۔ یہ دونوں بھائی ہمیں نہیں ملے۔ کام پر گئے ہوئے تھے۔ مل، بھیں پر دہ کرتی تھیں۔ ہم دروازے سے ہی تعریت کر کے کوٹ آئے۔

بڑی بوا کا داماد بھی ملا۔ اس کا نام تو اس وقت مجھے یاد نہیں ہے مگر وہ بن کھلا تا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی بن کا رنگ پہلے سرخ ہوا، بتیں نکل آئی پھر میں نے محosoں کیا کہ وہ ایک دم ہی فق ہو گیا تھا۔ یہ تغیریں رونما ہوا، یہ مجھے اس وقت پتا چلا جب وہ منے دادا سے مصافحہ کرنے کے بعد ہم لوگوں سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ ہمارے گھر کے دامیں طرف کے گھر میں رہنے والے بیگ صاحب جو منے دادا کے ہم عمر تھے اور بقول منے دادا کے ان کے پرانے دوست بھی، منے دادا کو اپنے گھر کی بیٹھک میں لے گئے۔ اس بیٹھک کا دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا، سامنے کے حصے میں انہوں نے اس چھوٹے سے قلعے میں گھاس بچوں نگاہ کر کر کیا ریاں بنا کر چھوٹا سا باغیچہ بنالیا تھا۔ اس کے چاروں طرف لکڑی کا جنگل تھا، ہم اندر گئے تو بیٹھنے کے بعد میری نگاہ بن پڑی جو جنگل سے باہر ایسے کھڑا تھا کہ اسے میں صاف نظر آؤں۔ اس نے مجھے سرہلا کر باہر آئے کا اشارہ کیا اور فوراً ہی پلت

لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ورنہ راتوں کو ہر گھر کا ہر فرد جائے گا تھا۔  
اب گھر جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بیگ صاحب نے تنیسہ کر دی تھی کہ آپ  
شال بیبا سے پوچھئے بغیر گھرنے کھولیں۔

بات تھیک تھی۔ میں اور منے دادا فور آئی وہاں سے چل پڑے۔ پہلے تو سوچا تھا کہ  
دن بھر ہوم پھر کرو گوں سے ملیں گے، گھر کا دلی کے جانے والا سامان نکلا تھا میں گے مغرب  
سارے پروگرام دھرے رہ گئے تھے۔ منے دادا کو علم تھا کہ شال بیبا جنمے کی شام کو ملیں گے  
گھر ہم وہاں سے سیدھے اس آستانے پر پہنچ جماں شال بیبا کا مسکن تھا۔ میں اس کے  
بارے میں نہیں جانتا تھا مگر منے دادا کو شاید وہ بتاچے تھے۔

یہ میرٹھ سے کچھ باہر کا علاقہ تھا۔ ایک چھوٹا سا کچھ مکان تھا جماں باہر بہت پرانا  
پہلی کار رخت تھا۔ اس درخت کے گرد سینٹ کا پا چبوتراء بنا ہوا تھا۔ یہ چبوتراء گولائی میں  
قاچیں کے پیچوں بیچ درخت تھا۔ یہاں ٹھنڈے پانی سے بھرے ہوئے ملکے رکھے تھے۔  
زخت انگریز ملائے کا حساس تھا۔ شال بیبا کے چھوٹے سے کچھ مکان کے اوپر بھی پہلی  
کے درخت کی چھالیا تھی۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ مکان اندر سے بند تھا۔ ہم یہاں  
نکتائے میں آئے تھے۔ تانگا ہمیں چھوڑ کر جا چکا تھا۔

”شال بیبا اندر ہیں“ دروازے کو اندر سے بند دیکھتے ہی منے دادا نے کہا۔  
”مگر منے دادا! ہمارا آج یہاں آنا بیکار نہیں ہو گا؟ آپ نے کہا تھا کہ وہ جمعے کو ملیں  
گے۔“

”مگر میں بہت پریشان ہوں۔ میں ان سے درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ وہ آج ہی  
مل لیں۔“ منے دادا نے دروازے پر دیکھ دیتے ہوئے کہا۔

فور آئی دروازہ کھل گیا۔ سامنے شال بیبا کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ  
تھی۔ ”آؤ نے.....!“ جیسے ہی مجھے پتا چلا کہ تم میرٹھ پہنچ گئے ہو، مجھے لقین ہو گیا کہ تم  
کل تک صبر نہیں کر سکو گے۔ بیشتری داستان تمہیں آج ہی یہاں لے آئے گی۔“ انہوں  
نے میں اندر آئے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اندر ایک دری، ایک گھرے پلٹک اور ایک چھوٹے سے نیکے کے سوا کچھ نہیں  
تھا۔ دری کے ایک جانب جائے نماز پچھی تھی۔ اس کے سامنے تسبیح اور کلام پاک لکڑی  
کے ایک تختہ پر رکھا تھا اور یہ تختہ دیوار میں نصب تھا۔

گلے میں اس کے اس انداز پر حیران ہو گیا۔ میری اس سے قطعی بے تکلفی نہیں تھی ہر  
بھی اس کے چہرے کافی ہوتا تھا کہ اس کا کروں، کیا بات ہے۔  
بیگ صاحب نے چائے مٹکوں۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ میں نے دادا اور وہ بچپن کی  
باتیں کرنے لے گئے تھے۔ مجھے باہر آتا دیکھ کر بن ایک طرف کو بڑھ گیا اور پھر اس نے مجھے  
قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”کیا بات ہے بن.....؟“ میں نے قریب جا کر پوچھا۔  
”بھائی! ابھی آپ اپنے گھر نہیں گئے کیا؟“ اس نے ہمارے گھر کے بڑے سے  
گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔  
”نہیں! اب جائیں گے۔ مجھے تو یہ سوچ کے ہی کوفت ہو رہی ہے کہ اندر سامان  
دول میں اٹا ہوا ہو گا۔“

”بھائی! وہاں مت جائیے گا۔“ اس نے کھمیائے ہوئے انداز میں کہا۔  
”کیا بات ہے بن؟“ میں چونک گیا۔  
”بھائی.....! وہاں بہشرہ تھا ہے۔“  
”کیا؟“ مجھے بی جان کی بات یاد آگئی۔ ”کون بیشتر؟“ یہ میں نے اس لئے پوچھا کہ  
شاید وہ کسی اور بہشر کی بات کر رہا ہو۔

”وہی.....! جو مر گیا تھا۔“  
”بن! تم ہوش میں تو ہو نا!“  
”ہاں بھائی! میں ہوش میں ہوں۔ میں نے خود اسے دیکھا تھا۔ سارے محلے  
دیکھا تھا۔“

”مگر کسی نے مجھے یہ نہیں بتایا۔ صرف تم بتا رہے ہو۔“  
”کسی سے بھی پوچھ لیں بھائی! میں غلط نہیں کہ رہا۔ وہ رات بھر گلیوں میں پھرنا  
تھا۔ شال بیبانے آکر اسے آپ کے گھر میں بند کر دیا ہے۔“  
پھر اس سے پہلے کہ میں کچھ اور پوچھتا یا وہ کچھ بتاتا، مجھے منے دادا نے آواز دے  
لی۔ بنن تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ میں منے دادا کے بلاں پر اندر چلا گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا  
کہ جو بات بن مجھے بتا گیا ہے، وہی بیگ صاحب نے منے دادا کو بتائی ہے۔ منے دادا بست  
ہر اسال تھے۔ وہاں جا کر بیگ صاحب نے بھی کیا کہ شال بیبا کو بلوایا گیا تب یہاں کے

”بیٹھو۔“

انہوں نے دری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ہم بھی انہی کے قریب دری پر بیٹھ گئے۔ اب وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔ ”ہاں میاں! بڑا شوق تھا تمہیں لڑکیوں کی طرح گزیا کھلیے کا۔“ میں بھیسپ گیا۔ ”بس شالی بیا.....! ساری دنیا کھلیتی ہے۔ میں تو محیب گور کو دھندے میں پھنس گیا ہوں۔ میں رہائی چاہتا ہوں بیا!“

”بیٹا! ایلن سے چھٹکارا تواب آسان ہو گیا ہے۔“  
میں چونک اٹھا۔ ”کیسے بیا؟“

”تم و تسلکو زنجیرس دے دو۔ وہ سچ کہتی ہے۔ ایلن پر تو وہ خود ہی قابو پالے گی  
لیکن اس کے لئے تمہیں اپنے اوپر قابو پانا ہو گا۔“  
”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ رابرٹ سورن سنگھ، پیاس اور جینو کو بھول جاؤ۔ وہ اپنے کئے کی سزا پا رہے ہیں۔ عطا اپنے انجام کو پہنچا۔ ان لوگوں کو تم نہیں بچا سکتے۔ زیوسا صرف اور صرف تمہارے ساتھ ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ان لوگوں کی کسی بھی قسم کی مدد کے لئے تیار ہو گی۔ بہر حال، یہ تو تم اور زیوسا ہی طے کر سکتے ہو۔ میں صرف یہ بتا دوں کہ زیوسا تمہاری ہمدرد ہے۔ اگر تم زنجیرس و تسلکو دے دو گے تو اس پر بھی احسان کرو گے پھر“  
سلکتا ہے کہ وہ تمہاری ہر شرم کی مدد کو تیار ہو جائے۔“

”زیوسا کون ہے بیا؟“

”اے چھوڑ دو۔ میں اتنا سمجھ لو کہ ایک طاقت ہے، قوت ہے جو خدا نے تمہارے مدد کے لئے بھج دی ہے۔ تمہیں اپنا رویہ اس کے ساتھ درست کرنا ہو گا۔ اگر اس پکمیں پڑو گے تو اور الجھ جاؤ گے۔ تم اگر بچتے رہے ہو تو اس کا سبب زیوسا ہی ہے۔“  
میں واقعی الچھ گیا۔ شالی بیا کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ وضاحت کرنے سے پچھا چاہتے ہیں۔ زیوسا میرے لئے قطعی ابھی سی چیز تھی۔ اس کا تاثر مجھ پر کچھ بہتر انداز میں ثابت نہیں ہو سکا تھا۔ میں اس سے اپنا رویہ درست اس وقت کرتا جب اسے جانتا ہو نہ سامنے آتی تھی۔ نہ میں اسے جانتا تھا۔

”بھول جاؤ سب کچھ..... وہ بہت جلد تم پر ظاہر ہو جائے گی۔“ شالی بیا نے پور کما جسے وہ میرے ذہن میں اٹھنے والے ہر خیال کو پڑھ رہے ہوں۔

”یہ بتائیں شالی بیا کہ یہ مبشر کا کیا چکر ہے؟“ نے دادا ایک دم بول پڑے۔  
”کچھ نہیں میاں، وہی ایلن کا چکر ہے۔ و تسلک سنبھال لے گی۔ تم یہاں سے جاتے ہی سب سے پہلا کام یہی کرنا کہ و تسلکو مطلوبہ زنجیرس دے دو۔ یہ سب چکر ختم ہو جائے گا بلکہ تم لوگ یہاں لوٹ آتا۔“

میں نہ دادا کو و تسلک کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا۔  
”سب نہیک ہو جائے گا۔ یہ لوگ دوبارہ یہاں آسکیں گے؟“ نے دادا خوش ہو گئے۔

”ہاں! بے فکر ہو کر آجاتا۔ بس زیوسا سے ضیاء بات کر لے۔“  
”کیا بات کرلوں بیا؟ وہ بھی نہ میرے سامنے آئی، نہ اس نے مجھ سے بات کی۔  
لوگوں کو ہر اساحی کیا ہے اس نے۔“  
”نہیں ضیاء! اس نے صرف اور صرف تمہاری مدد کی ہے بیٹا.....! یہ سب بدمعاشیاں ایلن کی تھیں جو زیوسا بن کر تمہیں پریشان کرتی رہی۔ زیوسا تو خود بے بس ہے۔“

”شالی بیا! زندگی اتنی بو جھل کبھی نہیں تھی۔ بھرا گھر چند سالوں میں خالی ہو گیا۔ یہ ہمارے لئے خوبخبری ہے کہ یہ سب واپس آسکیں گے“ نے دادا نے بات کاٹ دی۔  
”بیا!“ میں نے اٹھے ہوئے انداز میں انہیں مخاطب کیا۔

”بیا! ضیاء! زندگی ایک خاص ڈھب سے وقت کا ساتھ دیتی ہے۔ اچھا، برا، غم، خوش یہ سب انسان کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہتے ہیں۔ وہ اندر سے اگر مضبوط ہوتا جاتا ہے تو بعض اوقات باہر کی قوتیں اسے کمزور کر دیتی ہیں۔ کچھ مسائل تمہارے ساتھ یہیں لیکن وہ ایسے نہیں ہیں کہ جنہیں حل نہ کیا جاسکے۔ تم پہلے خوف کے اس مضبوط حصار سے باہر نکل آؤ۔ پچی بات یہ کہ یہ حصار تمہارے لئے اتنا تکلیف ہو نہیں ہے جتنا دوسروں کے لئے۔ میں اس کی وضاحت فی الوقت نہیں کر سکتا۔ تم پہلا کام یہی کرو کر و تسلک سے رابطہ کرو۔ جب ایک مسئلے سے نکل آؤ تو میرے پاس چلے آتا۔ میں تمام وضاحت کردوں گا۔ صرف اتنا خیال رکھنا کہ کوئی عورت تمہارے قریب نہ آئے۔ جب نکر زیوسا، ایلن کے زیر اثر ہے، تم آزاد ہو مگر زیوسا کی آزادی کے بعد تمہیں کچھ عرصہ نکر رہتا پڑے گا۔“

"یعنی بات پھر وہیں کی وہیں رہتی ہے بیبا! میں اس تمام چکر سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔" میں جھنگلا گیا۔ "مجھے زیوس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں ایں ہی سے نہیں بلکہ زیوس سے بھی دور رہنا چاہتا ہوں۔ انسانوں کی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ عام کی زندگی گزارنا میری خواہش ہے۔"

"بیبا! قدم بہ قدم آدمی آگے بڑھتا ہے۔ زیوس تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اس لئے اس کی دسترس سے نکانا اتنا آسان نہیں ہے۔ یاد رکھو، منقی جذبے کی نسبت مشتبہ جذبہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ میں اسی لئے کہہ رہا ہوں۔ دیے یہ بھی ممکن ہے کہ زیوس تمہاری خواہش کا احترام کرتے ہوئے تمہیں پھوٹ کر پلی جائے۔"

"یہی ہونا چاہئے بیبا.....!" میں نے زور دے کر کہا۔ منے دادا حیرت سے بیبا کی گفتگو سن رہے تھے۔

"بس ضایاء! میں اب زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ میں نے بڑی مشکل سے وقت نکلا تھا۔ جب دوبارہ آؤ گے تو میں تمہیں زیادہ وقت دے سکوں گا۔"

شالی بیبا نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ میں اور منے دادا مجبوراً کھڑے ہو گئے۔ ابھی ہم ان کے کروں سے باہر بھی نہیں لکھے تھے کہ میں چونک اٹھا۔

"ضایاء.....!" ایک دبی سی آواز گونج اٹھی تھی۔ میں نے چونک کر پلے شالی بیبا کی طرف دیکھا۔ ان کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ وہ گھبرا کر مجھے دیکھ رہے تھے۔ منے دادا بھی چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

"جااؤ تم....." شالی بیبا نے انتہائی بے چینی سے کہا اور ہمیں تقریباً گھیر کر کمرے سے باہر لانے لگے۔ میں نے باہر جاتے جاتے ان کے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر اس کمرے کے ایک کونے میں ایک پتلے سے دروازے پر نگاہ پڑتے ہی میں سکتے میں رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں پیروں کے بل کسی جانور کی طرح وہاں سے جھانک رہا تھا۔

"تم..... کون ہو تم.....؟" میں بے ساختہ بول اٹھا کیونکہ آواز مجھے جال پچانی لگی تھی۔

"ضایاء جاؤ!" شالی بیبا نے جیع کر مجھے دھکا دیا۔ "نہیں ضایاء.....!" تم نے وعدہ کیا تھا۔ مجھے بچانے کا وعدہ ضایاء.....؟ میں بے قصور ہوں۔" وہ رو رہا تھا۔

اور مجھے یاد آگیا کہ یہ آواز میں نے کب اور کہا سنی تھی۔ میں جھنکے سے آگے بڑھاگر شالی بیبا نے مجھے پکولیا۔

"ضایاء! آگے مت جاتا۔ سنو، میری بات سنو۔" وہ جیخ رہے تھے مگر مجھے لگ رہا تھا چیز کوئی قوت مجھے اس کی طرف گھیٹ رہی ہے پھر اچانک مجھے جھنکا گا۔ میں شالی بیبا کی گرفت سے نفل کر اس کے سامنے دروازے پر جا گرا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے کے اوپر چھا گیا۔ میں نے منے دادا اور شالی بیبا کے چیختن کی آواز سنی پھر لگا چیزے کر کے میں اندر ہمرا چھا گیا ہو۔

اندھیرا کر کے میں نہیں بلکہ میری آنکھوں میں چھلایا تھا۔ وہ اتنا ہی بیہت ناک تھا، آنکھیں بالکل گول تھیں، رنگ جو کبھی سنرا رہا ہو گا اس وقت تابنے کی طرح کا تھا اور اس پر سرخ سرخ تازہ زغمون کے نشان، ان سے ملکتا ہوا خون، پھولی ہوئی ناک، موٹے موٹے سوبے ہوئے ہوئے ہوئے جن کا گوشت کناروں سے جھٹپٹا کھا تھا۔ وہ اتنے خشک ہو چکے تھے کہ کھال جگہ جگہ سے تاریخی ہوئی لگ رہی تھی۔ بالوں کی جگہ سنرے رنگ کی موٹی موٹی پیاس کی تھیں، میل سے چکڑی ہوئی لیں جو سامنے جھوول رہی تھیں۔ اس کا بدن کے جیسی ساخت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس کے پاس سے عقفن اٹھ رہا تھا۔ آواز عجیب سی تھی ایسی کہ سننے والے کے کانوں میں خراشیں پڑ جائیں۔ حلق چھل جائے۔ وہ میرے اوپر جھکا شاید رورہا تھا۔ جو آواز اس کے حلق سے نکل رہی تھی وہ ایسی تھی جیسے سرکندوں کی ہوئی آواز۔

"لک..... کون ہو تم.....؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں ایڑیوں پر زور دے کر اس کے نیچے سے سرکنے کی کوشش کرنے لگا۔

"ضایاء! میں..... جینو ہوں۔ جینو یا لیا دیکھو.....!" میں بے قصور ہوں جلتے دبارہا ہو۔ گھونٹ رہا ہو۔

بلکہ پر ریتی ہوئی چیزوں کے سے احسان نے مجھے حواس باختہ کر دیا تھا مگر وہ مجھ پر جنمکا ہوا تھا۔ میں اس کے نیچے سے نکل نہیں پایا تھا۔ "جینو اتم!" میں حیران ہوا۔ وہ واقعی بیجنو تھا۔ میں اس کی آواز پچان گیا تھا۔

میں نے خود پر قابو پا کر انہیں پھر پکارا۔ وہ اب ساکن کھڑے تھے۔ ان کے چہرے کی تمام نیس گمراہ ہو کر ابھر آئی تھیں، گردن کی ریگیں بھی پھول چکی تھیں۔ آنکھیں اب بھی بند تھیں البتہ ساکن لب ایک دوسرے پر جنے ہوئے تھے۔ وہ بازو بھی گرچکا تھا جو میرے اور بنے دادا کے درمیان حائل تھا۔

میں آگے بڑھنے کی کوشش میں لڑکھڑایا۔ منے دادا نے پک کر مجھے سنبھال لیا۔  
”ضیاء.....! تم..... ٹھیک ہوتا ہاں؟“ منے دادا کی آواز لرز رہی تھی۔

میں دادا کی بات کا جواب دیے بغیر آگے بڑھا اور میں نے شالی بیبا کو جھکا دیا۔ انہوں نے آنکھیں کھوں دیں۔ سرخ تپتی ہوئی نگاہوں میں بلاکی اجنیت تھی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ یوں لگا جیسے سرخ شعلوں سے بھرا آگ کا ایک طویل سمندر ہے جسے میں پار کر رہا ہوں۔ پیش کا احساس دل میں ہوا، لیکن میں یونہی کھڑا نہیں دیکھا رہا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ان کی آنکھوں کی رنگت بدلنے لگی اور پندرہ ہی لمحوں میں ”دارمل ہو گئے۔ اجنیت ان شعلوں میں ہی کہیں بھرم ہو گئی۔ اس کی جگہ پر یشانی اور خواس باخکلی نے لے لی۔

”ضیاء.....! تم ٹھیک ہو۔ کوئی گزند تو نہیں پہنچائی اس نے؟“ وہ مجھے یوں نوٹنے لگے جیسے میرے جسم پر زخموں کو حللاش کر رہے ہوں حالانکہ زخم میرے بدن پر نہیں، دل و دماغ پر لگے تھے اور دکھن بن کر پورے وجود میں پھیل رہے تھے۔  
”وہ بے چارا گزند پہنچانے کے قابل ہوتا شالی بیبا تو..... تو آپ میرے سامنے اپنے پیر دل پر نہ کھڑے ہوتے۔“

میرے لجھ کے طفر کو انہوں نے ہی نہیں منے دادا نے بھی محسوس کر لیا۔ شالی بیبا نہ عال ہو کر تخت پر بیٹھ گئے۔ ان کا سانس قابو میں نہیں تھا۔ منے دادا نے آگے بڑھ کر شالی پر کپڑ لئے۔

”ضیاء.....! انداز تنبیہی تھا۔“

”وہ جینو تھا منے دادا..... جینو.....!“ ابا کے گروپ کا بے حد مقصوم اور بے گناہ لڑکا۔ جس کی نوجوانی انجانے میں اسی طسم کی نذر ہو گئی ہے اور آج وہ سزا کی بدترین غل کا شکار ہے۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ یہاں قید کیا گیا ہے۔“ آخری جملہ میں نے دونوں نیلگیاں تخت کے کنارے پر نکائے، سرجھکائے بیٹھے شالی بیبا کو دیکھ کر کہا۔

اس وقت وہ پھسل کر مجھے سے دور چلا گیا۔ میں نے دیکھا کہ شالی بیبا آنکھیں بند کے کچھ پڑھ رہے تھے۔ پسلے میرا خیال تھا کہ شاید اسے میرے اوپر سے شالی بیبا نے کھینچا ہے، میں ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا اور یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ شالی بیبا اس سے ”وہ کھڑے کچھ پڑھ رہے تھے اور جینو.....!“ اگر وہ جینو ہی تھا تو یوں اس پسلے ہے۔ دروازے کے اندر میں پھسل کر مجھے سے دور ہو رہا تھا جیسے اس کی پشت پر کھڑا کوئی اس کھینچ کر اندر لئے جا رہا ہو لیکن اندر کوئی نہیں تھا اگر اسے کوئی کھینچ نہیں رہا تھا تو وہ کوئی نادیدہ قوت ہی ہو سکتی تھی۔ منے دادا زرد چہرے لئے سامنے کھڑے تھے۔ وہ شاید میری طرف بڑھنا چاہتے تھے اور شالی بیبا نے انہیں بازو بڑھا کر روک دیا تھا یہ میں ایسے جان بیبا کر شالی بیبا کا بازو دب بھی میرے اور ان کے درمیان حائل تھا۔

جینو کی آواز میں بے پناہ کرب تھا، میں سخت جیران تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا؟ شالی بیبا سے اس کا کیا تعلق ہے؟ پھر مجھے شالی بیبا کا جملہ یاد آگیا جو انہوں نے مجھ سے کچھ ہی در پسلے کہا تھا کہ مجھے رابرٹ، پسas جینو اور سورن سکھ کو بچانے کا خیال ذہن سے لگا ہوا گا، میں نے چونکہ کرشالی بیبا کو دیکھا۔ ”کیا یہ واقعی شالی بیبا ہیں؟“ یہ عجیب سوال میرے دماغ میں شور سا چاکیا۔ ”کیا ایں یا زیوسا، میں دھوکا دے رہی ہے؟“

میں اب خود کو سنبھال کر کھڑا ہو چکا تھا۔ جینو اس نیم تاریک کرے کے وسط میں پہنچ پکا تھا۔ اس کا ہیولا مجھے نظر آ رہا تھا اور اس کی کرب میں ڈوبی آواز سنتاتے ہوئے تیریوں کی طرح میری ساعت میں اتر کر زخمی کر رہی تھی۔ میں نے جینو کو جواب دینا چاہا تلی دینے کے لئے منہ کھولا گر میرے حلق سے آواز نہیں نکل سکی۔ اس دوران میں دروازہ بند ہو گیا۔ اب جینو رو رہا تھا۔ میں نے چالا کہ آگے بڑھ کر شالی بیبا کو جھنجھوڑ دیں ان کی محیت توڑ دیں، جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں، اسے بھلا دوں مگر میں اچھ بھر بھی اپنی جد سے نہیں سرک سکا۔ میرے قدم منوں وزنی ہو کر جیسے کسی کھونٹے کی طرح زین میا چکے تھے۔

پھر اچانک مجھے جھکا لگا۔ میں نارمل ہو گیا مگر اب جینو کی آواز نہیں تھی، اسی بازگشت اب بھی میری ساعت میں گونج پیدا کر رہی تھی۔  
”شالی بیبا.....!“ میں نے بے اختیار پکارا۔ اس بار میرے حلق سے بھی ”شالی بیبا.....!“ میں نے بے اختیار پکارا۔ اس بار میرے حلق سے والی آواز بہت تیز تھی۔ خود مجھے اپنی اونچی آواز کا احساس ہوا اور میں گڑبردا گیا۔ ”شالی بیبا.....!

کرنے پر مجبور ہوتا ہے، اس میں اس کے ارادے، اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ پر کسی کو گزند پہنچاتا ہے، یا ایسا کرنے پر مجبور ہوتا ہے، اس میں اس کے ارادے، اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ اس بھیانا جسم کے اندر اس کا اپنا معموم دماغ ہے، اس کے سفاک وجود میں اس کا ضیر اسی طرح بے دماغ ہے اس لئے وہ جس اذیت کا شکار ہو جاتا ہے، اس اذت سے چنانی اب اولین مدد ہے۔ میں..... صرف یہی کر سکتا ہوں سو کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اسے ایں کی قید سے رہائی والا کریمان تک لانے میں مجھے کن کن خوف ہاں سیفتوں سے گزرتا چڑا ہے۔ کیسی اذیتیں اٹھانا پڑی ہیں مجھے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حد نہیں کر سکتا۔ اور کوئی بھی نہیں کر سکتا ضیاء..... نہ تم نہ زیوسا۔

وہ جتنے نہ ڈھال تھے، اتنا ہی سچائی سے بھر پور، ان کا لمحہ تھا۔ مجھے اپنے اندر آئے اس طوفان کو روکنے میں کچھ وقت لگ گیا۔ جینو کی آواز کا کرب ان طوفانی جھکڑوں میں مسلسل چکرا رہا تھا۔ میرا بس چلتا تو میں ابھی، اسی وقت اسے اپنی بانسوں میں بھر کر تسلی دیتا۔ اس کی تمام تر ظاہری خبات، گندگی اور درندگی کے باوجود مجھے اس پر ترس اور پیار آ رہا تھا۔

”ضیاء.....! تم جاؤ بیٹا.....! اسی لئے میں نے کما تھا کہ مجھے دیر ہو گئی ہے۔ میں جو وظیفہ پڑھ رہا ہوں، وہ جینو کے لئے ہے۔ میں اسے پرانی بیت میں واپس تو نہیں لا سکوں گامگرا سے مزید درندگی کرنے سے روک سکتا ہوں۔“

”شالی بیا! کیا ایساں والی کوئی نہیں میں ڈگل کا خون کرنے والا جینو ہی تھا؟“ میں نے اپنے خیال کی تدبیق چاہی۔

”ہاں، وہ یہی تھا ضیاء اور تمہیں حرمت ہو گی کہ کوئی بھی خون کرنے، خون میں لٹھرے گوشت کے لکڑے کھانے کے بعد وہ اپنے فرار کی ہر راہ پر قادر ہو جایا کرتا تھا۔ وہ ایسا کی کوئی کے اسی کمرے میں تھا جسے تم اور طیب مل کر بھی نہیں کھوں سکتے تھے اور وہ ڈگل کو مارنے کے بعد دروازے کے نیچے سے کسی کپنپوے کی طرح ریگ کر اندر گیا تھا۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا تھا؟“  
”جس روز مجھے زیوسا نے بتایا کہ تم خطرے میں ہو اور ایں طاقت سے بھر پور ہو کر تمہیں گزند پہنچانے کی تیاری کر چکی ہے، زیوسا بے بن ہے تب میں نے کوشش کی

شالی بیا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں لمحہ بھر کو بے بسی لہرائی۔ پھر ان کے ہونتوں پر دکھ بھری مسکراہٹ پھیلی تو میں نے سوچا، شالی بیا بہت بڑے ایک ہیں۔

”نہیں ضیاء.....! تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ انہوں نے جیسے ترپ کر میرے خیال کی تردید کی۔ ”جینو کو میں بڑی مشکل سے وہاں سے نکال کر لایا ہوں ورنہ..... زد شاید ڈگل کی طرح تم اور طیب بھی اس کی درندگی کا شکار ہو چکے ہوتے۔“

جیسے بھلی سی کونڈی اور میرے دماغ میں وہ سین پورا کا پورا گھوم گیا جو میں ڈگل کے قتل کی رات دیکھا تھا، وہ بھیانا نما، سسری لیٹیں چھرے پر ڈالے چاروں بائی پیروں پر چلتا ہوا، خون میں لٹھرا چڑھا، ڈگل کا اوہڑا ہوا جنم، ہاتھ کا وہ حصہ جو بھیانا شخص چباتے چھوڑ کر اچانک کمیں غائب ہو گیا تھا، سب کچھ صاف و کھالی دینے لگ طوفانی جھکڑ سے چل گئے دماغ میں۔

”جینو نے تم سے فون پر بات کی تھی ضیاء اور..... بیاں فون نہیں ہے۔ اس نے آباد علاقے میں..... میرے پاس ایسی کوئی سوت نہیں ہے۔“ شالی بیا دھمکے لجئے میں کہہ رہے تھے۔ جس میں سچائی بھی تھی اور نکالت خوردگی بھی۔

منے دادا نے مجھے دری پر بھا دیا اور خود بھی قریب بیٹھ گئے تھے۔ شالی بیا بائیٹھ انہوں نے ایک بڑے شیشے کے جار میں سے جو تخت کے بالکل کونے پر رکھا تھا اور اب تک میری نگاہوں سے پوشیدہ تھا، گلاس میں پانی بھرا اور ایک گھونٹ میں اسے پا گئے چند لمحے خاموشی سنگلاخ چنانوں کی طرح کمرے میں سینہ تانے کھڑی رہی پھر شالی بیا آواز نے اسے توڑ دیا۔

”وہ یقیناً مظلوم تھا،“ بے گناہ اور معموم تھا مگر ضیاء آگ کبھی یہ نہیں دیکھتی کہ اس کو پکڑنے کی کوشش کرنے والا قصور وار ہے، سفاک ہے، ”زم دل یا معموم.....“ کی خاصیت ہے جلا دتا..... وہ بہت چھوٹے سے معموم بچے کو بھی اسی طرح جلا دتا ہے جیسے شیشم کے کسی تناور بے جان درخت کو۔ پتھر کو یا کسی جانور کو۔ جینو مص اور بے گناہ سی..... مگر آگ میں ہاتھ اس نے بھی ڈالا تھا، سو جانا ہی اس کا مقدمہ۔ اس کے اندر پیدا کی جانے والی سفاکی، درندگی اور خونخواری کو قابو میں رکھنا ہی بس اس اور دوسرے لوگوں کی مدد ہے۔ وہ جب بے اختیاری طور پر کسی کو گزند پہنچاتا ہے، یا:

”ہاں ضیاء! بس تم و تسلک کے پاس چلے جانا۔ وہ جو کچھ کہتی ہے، ٹھیک کہتی ہے۔ تم اس پر مکمل اعتقاد کر سکتے ہو اور ہاں سنو، زیوسا تمہاری ہمدرد ہے۔ یہ تم نہیں جانتے مگر میں جانتا چاہتا تھا کہ تم لوگوں کو کس قسم کا خطروہ درپیش ہے۔ یہ بات زیوسا بھی نہیں جان سکی تھی کہ وہ کس قسم کے حالات پیدا کرنا چاہتی ہے۔ بس اتنا جان سکی تھی کہ اس باراں کا حملہ بھرپور انداز میں ہو گا۔ تبھی میں نے وہاں جینو کو اندر دیکھا۔ تمہاری اس سے فون پر جو باتیں ہوتی تھیں، وہ وہیں سے ہوتی تھیں مگر یہ بات نہ تمہارے علم میں تھی کہ بیرون کھلا ہے، نہ خود اس کے علم میں۔۔۔۔۔ وہ تمہیں پہچان بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ اسے نہ تم ملے تھے نہ کسی نے تمہارا حلیہ اسے بتایا تھا۔ اگر اس روز زیوسا گھیر گھار کر ڈگلس کو وہاں نہ لاتی تو اس کا خشکار تم یا طیب ہوتے۔“

ان کی آخری بات سن کر میرے بدن میں جھر جھری دوڑ گئی۔ مجھے ڈگلس کا ادھڑا ہوا بدن یاد آگیا جسے میں نے اور طیب نے بڑی مشکل سے ٹھکانے لگایا تھا۔

”ابن اپنی ناکاہی پر بل کھاتی رہی۔ میرے درمیان میں آجائے سے اس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں جنہیں دور کرنا اس کے بس میں نہ تھا اس لئے کہ وہ مسلمانوں کی سی ایمانی طاقت سے محروم تھی بلکہ وہ تو خود اپنے مذہب پر بھی اتنا یقین نہیں رکھتی تھی کہ اس کے عقائدی اس میں ایمان کی طاقت کو فروغ دیتے۔ اگر اس میں کسی بھی قسم کا، یعنی اپنے عقائد کے متعلق بھی ایمان ہوتا تو شاید وہ میرے لئے ایسا تنوالہ ثابت نہ ہوتی اور مجھ سے مقابلہ کرتی مگر بے ایمانی، سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ وہ کمزور ہے، میرے اعتقاد کی مضبوطی کچھ اور بڑھ گئی اور میں بڑی مشکلات کے بعد جینو کو اس کی قید سے نکال لایا۔“

”شالی بابا! کیا وہ ٹھک نہیں ہو سکتا؟“

”ہو جائے گا! خدا چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ تم بس دعا کرو۔“ ان کا انداز بات ختم کرنے جیسا تھا۔

”چلو ضیاء!“ دادا بولے جواب تک ساکت بیٹھے تھے۔ ”ہمیں شالی بابا کا وقت ملنے نہیں کرنا چاہئے۔“

”شالی بابا! میں اپنے اور گھروں کے سلسلے میں کافی پریشان تھا اس لئے حفظ ماقبلہ کے طور پر آپ کو ہبنا اور حل پوچھنا چاہتا تھا لیکن اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

”میں دادا نے شالی بابا سے کہا۔“

اور تم دونوں کو دیکھا، جس رات ڈگلس مرا ہے۔ یہ اس سے ایک رات پہلے کی بات ہے۔ میں جانتا چاہتا تھا کہ تم لوگوں کو کس قسم کا خطروہ درپیش ہے۔ یہ بات زیوسا بھی نہیں جان سکی تھی کہ وہ کس قسم کے حالات پیدا کرنا چاہتی ہے۔ بس اتنا جان سکی تھی کہ اس باراں کا حملہ بھرپور انداز میں ہو گا۔ تبھی میں نے وہاں جینو کو اندر دیکھا۔ تمہاری اس سے فون پر جو باتیں ہوتی تھیں، وہ وہیں سے ہوتی تھیں مگر یہ بات نہ تمہارے علم میں تھی کہ بیرون کھلا ہے، نہ خود اس کے علم میں۔۔۔۔۔ وہ تمہیں پہچان بھی نہیں سکتا تھا اس لئے کہ اسے نہ تم ملے تھے نہ کسی نے تمہارا حلیہ اسے بتایا تھا۔ اگر اس روز زیوسا گھیر گھار کر ڈگلس کو وہاں نہ لاتی تو اس کا خشکار تم یا طیب ہوتے۔“

ان کی آخری بات سن کر میرے بدن میں جھر جھری دوڑ گئی۔ مجھے ڈگلس کا ادھڑا ہوا بدن یاد آگیا جسے میں نے اور طیب نے بڑی مشکل سے ٹھکانے لگایا تھا۔

”ابن اپنی ناکاہی پر بل کھاتی رہی۔ میرے درمیان میں آجائے سے اس کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں جنہیں دور کرنا اس کے بس میں نہ تھا اس لئے کہ وہ مسلمانوں کی سی ایمانی طاقت سے محروم تھی بلکہ وہ تو خود اپنے مذہب پر بھی اتنا یقین نہیں رکھتی تھی کہ اس کے عقائدی اس میں ایمان کی طاقت کو فروغ دیتے۔ اگر اس میں کسی بھی قسم کا، یعنی اپنے عقائد کے متعلق بھی ایمان ہوتا تو شاید وہ میرے لئے ایسا تنوالہ ثابت نہ ہوتی اور مجھ سے مقابلہ کرتی مگر بے ایمانی، سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ جس نے مجھے حوصلہ دیا کہ وہ کمزور ہے، میرے اعتقاد کی مضبوطی کچھ اور بڑھ گئی اور میں بڑی مشکلات کے بعد جینو کو اس کی قید سے نکال لایا۔“

”شالی بابا! کیا وہ ٹھک نہیں ہو سکتا؟“

”ہو جائے گا! خدا چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ تم بس دعا کرو۔“ ان کا انداز بات ختم کرنے جیسا تھا۔

”چلو ضیاء!“ دادا بولے جواب تک ساکت بیٹھے تھے۔ ”ہمیں شالی بابا کا وقت ملنے نہیں کرنا چاہئے۔“

”شالی بابا! میں اپنے اور گھروں کے سلسلے میں کافی پریشان تھا اس لئے حفظ ماقبلہ کے طور پر آپ کو ہبنا اور حل پوچھنا چاہتا تھا لیکن اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہی۔“

”میں دادا نے شالی بابا سے کہا۔“

مگر کی طرف چل پڑے۔  
 بی جان کھانے پر دیر سے پسختے پر ناراض تھیں حالانکہ ہم ڈٹ کر ناشاکر کے لئے تھے اور ابھی تو بھوک بھی نہیں تھی مگر انہوں نے کافی اعتمام کیا ہوا تھا شاید اسی لئے پریشان تھیں۔ ہم دونوں نہاد ہو کر بیٹھے تو فرحت کھانا نکال لائی۔ اب وہ میرے بالکل سامنے بھی تھی۔ مجھے پاپک شالی باباگی بات یاد آگئی۔ شاید یہ نفیاتی اثر ہوتا ہے کہ آدمی کو جس چیز سے روکا جائے وہ اس کی طلب میں شدت پیدا کر لتا ہے۔ اسی شدت نے انہیں جذبے کا روبرو پر دھار کر میرے وجود میں ایسی انگرائی لی کہ فرحت کو چھوپ لینے کی خواہش بے طرح پچل اٹھی۔ بجائے اس کے کہ میں مقاطعہ ہو جاتا، میرا بھی چاہا کہ چاندنی رات کی ٹھنڈی، میٹھی اور پرا سرار روشنی میں فرحت کے وجود کی خوبیوں کو گھول کر اپنے سینے میں بھر لوں۔

میں اسی لمحے فرحت نے گھبرا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں لذت آمیز خوف تھا۔ میں اسے ہی دیکھ رہا تھا، اس کی گھبراہٹ پر مجھے ہنسی آگئی جسے میں نے بڑی مشکل سے بیبا۔ وہ جلدی سے بی جان، میں دادا اور خالہ بی کو دیکھ کر سر جھکا کے بیٹھ گئی۔ پھر بھی چین نہ آیا تو کھڑی ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ بی جان نے پوچھا۔

”وہ..... پانی..... بھول گئی..... لاتی ہوں.....“ وہ چل گئی۔ اس کی پشت پر سیاہ باؤں کی چوٹی کی زبردیلے ناگ کی طرح لمرا رہی تھی۔ جی چاہا اس کا سارا زبر اپنے باؤں سے چوس لوں۔ سرور کی کیفیت نے مجھے پور پور جکڑ لیا۔ میں میں تلاطم سا اٹھتا ہوں ہوا باہت لرز کر رہ گئے اور لگا جیسے میرے ارد گرد کی ہر چیز نشیں میں ہے۔ میں نے ایسی کیفیت اپنے اندر حسوس نہیں کی تھی حالانکہ مونیکا کو دیکھ کر اور ایلیسا کی کوٹھ میں اس صین لڑکی کو دیکھ کر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوا تھا مگر اس کیفیت نے میرے بدن پر نہیں صرف دماغ پر حملہ کیا تھا مگر آج..... آج تو میں سرور سے بے حال ہو گیا۔ شاید یہی وہ خوفناک نفیاتی حملہ تھا جو اس پابندی کا رد عمل تھا۔ ”اگر میں دادا بی جان اور خالہ بی نہ ہوتی تو.....!“ یہ جملہ تھا جو جانے کیوں میرے دماغ میں آیا اور میں ایک دم خوفزدہ ہو کر چونکا میں نے سب کو دیکھا۔ سب کھانے میں مصروف تھے۔ فرحت اب تک پانی لے کر نہیں آئی تھی۔ بی جان میرے بے حس و حرکت ہو جانے پر

احساس ہو گیا کہ میں..... اکیلا میں آزاد نہیں ہوں۔ میں دادا بھی کہہ سکتے تھے کہ انہیں کچھ فیصلے ایسے کرنے ہیں جو میری مایوسی کا سبب بن سکتے ہیں اور شالی بابا نے بھی مجھ پر ایک پابندی عائد کر دی تھی کہ میں فی الحال عورت سے دور ہوں۔ میں عورتوں سے بکھری قریب نہیں رہا تھا۔ میں نے اب تک کسی کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا سوائے فرحت کے..... اور تبھی مجھے پتا چل گیا کہ میں دادا نے کن فیصلوں کی طنز اشارہ کیا ہے۔ میرا دل گھبرا نے لگا۔ میں میں دادا سے وضاحت چاہتا تھا مگر مگر دھوپ میں اتنا طویل سفر پیدل طے کرتے ہوئے، پسینے میں شرابور منے دادا سے وضاحت طلب کرنے کا یہ موقع تھا نہ وقت..... بس میرے اندر کوئی مجھے یہ لقین دلا رہا تھا کہ شاید فرحت سے مجھے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گوئیں اس کے بارے میں صرف سوچ ہی رکتا تھا۔ اب تک تو اسے چھوپنے کا بھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ نادانیگی میں بھی میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا مگر اسے اپنالینے کا میں نہ صرف خود سے بلکہ بی جان سے بھی عمد کر پکتا تھا۔

میں کیسی سب کچھ سوچتا ہوا میں دادا کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں دادا پتا نہیں کیا سوچ رہے تھے مگر اندر ورنی خوشی سے ان کے چہرے پر تو انہی پھیلی ہوئی تھی۔ اب ہم ایک ایسی سڑک پر آپکے تھے جو میرٹھ شر کو سیدھی جاتی تھی اور یہاں سواری ملنے کا امکانا بھی تھا۔ ہم اس سڑک پر جا کر اسی سمت چلنے لگے جس سمت چل کر میرٹھ پہنچ کتے تھے۔ یہاں سے میرٹھ پیدل سفر کرنا منے دادا کے لئے آسان نہیں تھا۔ ہم میرٹھ سے کنی میں دور تھے مگر دھوپ میں کھڑے ہونے سے چلانا کیونکہ بہتر تھا، اس لئے چل رہے تھے۔

اس سڑک پر کچھ دور چلنے کے بعد ہی ہمیں وہ بس مل گئی جو دوسرے علاقوں سے مسافروں کو میرٹھ لے جاتی تھی۔ گواں میں پیٹھنے کی جگہ نہیں تھی مگر ہم میرٹھ پیدل جانے سے نج گئے۔ میرٹھ پہنچتے ہی میں دادا نے تانگا کر لیا۔ ہم پسلے سیدھے بیگ صاب کے گھر پہنچے۔ وہ ہمیں دوبارہ دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے مگر جب میں دادا نے شالی باباے ملاقات کا بتایا تو وہ خوش ہو گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ ہم اپنی کوٹھ کے دروازے پر پہنچے۔ میں دادا نے صرف چوکھت کے کناروں میں بلکہ جماں تک ہو سکا، وہاں تک پیدلی دیوار کی جڑوں میں بھی وہ مٹی بکھیر دی۔ آدھی بچا کر بڑی احتیاط سے روہاں میں باندھ کر جیب میں رکھ لی۔ پھر بیک صاحب کو ہدایت کر کے کہ اب ذرا مبشر والے معالم پر دھیان رکھیں، بات ختم ہوئی کہ نہیں اور جیسے بھی ہو وہاں خط لکھ دیں، ہم بی جان کے

”ہاں بی جان! اور لگتا بھی ہے کہ ٹھیک کہ رہے ہیں۔ اب یہ اماں پر منحصر ہے ان کا تو دل وہاں بہت زیادہ لگ گیا ہے۔“

”باؤلی ہے وہ تو اور عورت کا دل کیا! پانی کی طرح ہوتا ہے جس برتن میں ڈالو، اسی سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔ اتنے برس ہو گئے گھر چھوڑے ہوئے۔ ہولا یا تو ہو گاہی دل، پر کیا کرتی! دیکھ لینا، سنتے ہی پو ملیاں باندھ لے گی۔ اے ہاں! عصمت کا بھی بر جزا یا نہیں؟“ بی جان کی تو صیہ بھوک ہی اڑ گئی۔ وہ ہاتھ جھاڑ کر پیچھے سرک گئی۔

”ہاں! بات تو چلی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔ ہوتا تو اطلاع ہوتی“ نے دادا نے پانی کا گلاں اٹھاتے ہوئے کہا۔

”جاتے ہی مجھے اطلاع کرو کہ کب آرہے ہو؟ مگر..... وہ گھر تو.....“

اچانک بی جان کچھ کہتے کہتے زک گئیں۔ انہوں نے کن انگھیوں سے خالہ بی اور فردت کو دیکھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میشرکی وجہ سے پریشان ہو گئی ہیں۔ جمال اتنی بات سن رکھی تھی وہاں یہ بھی سننا ہو گا کہ شالی بابا نے اس کی بھلکتی روح کو ہمارے گھر میں قید کیا ہوا ہے۔

”نہیں بی جان! شالی بابا نے انتظام کر دیا ہے ایسا کہ اب کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔“  
منے دادا نے گول مول جواب دے کر انہیں مطمئن کر دیا۔

بی جان نے تصدیق کرنے کو میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی اثبات میں سربراہ دیا۔ وہ اتنی خوش ہو گئیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ وہ خوش نہ ہوتیں تو کون ہوتا! اماں بیٹی تھیں ان کی وہ بھی اکلوتی۔ تھیں خالہ کے دکھنے بھی اماں سے محبت کاروپ دھار لیا تھا۔ وہ اماں اور ہم لوگوں کے لئے کتنی پریشان رہتی ہوں گی اس کا اندازہ تھا مجھے۔ پھر خالہ بی کی وجہ سے وہ دیلی بھی نہیں زہ سکی تھیں۔ کچھ منے دادا اور منی دادی کی وجہ سے بھی وضع داری نہ بھانا پڑتی تھی۔ درستہ بیٹی کے لئے ترپ تھی ان کے اندر وہ تو بی جان سے چاہتی ہوں گی کہ وہ لوٹ آئیں۔ منے دادا کھاتا کھانے کے بعد آرام کرنے چلے گئے۔ خالہ بی برقد اور ٹھیے باہر نکل گئیں۔ میں بی جان اور فردت اوپنی چھت والے اس ٹھٹھے کمرے میں آگئے جمال بچپن میں، میں فردت اور بی جان سویا کرتے تھے۔ منے دادا باہر بنی۔ بیٹھک میں جائیں۔ بیرونی دیوار کے ساتھ بنا ہوا وہ کمرا جس میں بی جان کاٹھ کیا تھا ڈالا کرتی تھیں اور جس کے بارے میں سنا تھا کہ وہ آسیب زدہ ہے، آج بھی بند تھا۔ ہم کمرے میں جا کر لیٹ

کچھ چوٹکیں۔

”کیا بات ہے ضیاء کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟“

”بی..... بی..... نہیں..... بی ہاں..... کھا رہا ہوں“ میں گزر بڑا گلہ۔

”آجائے گی وہ..... باؤلی ہے، کسی اور کام میں لگ گئی ہو گی۔ تم شروع تو کرو۔“  
یہ کہہ کر انہوں نے فردت کو آواز دی۔ میں کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا مگر میرے کان باہر کی کسی آہٹ پر لگے رہے۔ پتا نہیں وہ کب آئی، ایسے دبے پاؤں کے احساس ہی نہیں ہوا۔ پتا اس وقت چلا جب وہ بی جان کو میرے سامنے والے حصے میں سرکا کر خود خالہ بی کے قریب بیٹھے گئی اور کچھ ایسے آڑی ہو کر بیٹھی کہ اس کا چڑھا خالہ بی کے کندھے سے چھپ گیا۔

جیسے بدلتی چھٹ گئی ہو، پچکدار دھوپ نکل آئی ہو۔ مجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔ میں بزم ہو گیا۔ سرور کی وہ ابر آسود قسم کی کیفیت بدلتی تھی۔

”ہم کل چلے جائیں گے۔“ منے دادا کی بات نے مجھے چونکا دیا۔ بی جان بھی نوالہ لیتے لیتے رک گئیں۔

”یہ کیا بات ہوئی منے میاں!“ بی جان نے شکایت آمیز لمحے میں کہا۔ ”کچھ روزاتر رہو۔“

”نہیں بی جان، آپ کو پتا ہے گھر بہاں کوئی نہیں ہے۔ رضا اور شجاع تو ایسے گئے ہیں کہ لگتا ہے واپس آنے کو ہی تیار نہیں۔ ناصر اور طاہر بھی بیکی میں ہیں۔ ایک یہ ضایہ ہے جس کی وجہ سے ملھارس ہے۔“ منے دادا نے جواب دیا۔

”شالی بابا سے ملاقات ہو گئی؟“ بی جان نے پوچھا۔  
”جی بی جان! بڑا حوصلہ ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب سب ٹھیک ہو جائے گا یہ لوگ واپس آسکیں گے۔“

”آئے نہیں“ وہ خوشی سے اچھل پڑیں۔ ”اے منے بچ کو!“  
”پوچھ لیں ضایا سے“ منے دادا مسکراۓ۔

میں فردت کے چڑھے پر چھلتی گایاں دیکھ رہا تھا۔ اپنا نام سن کر چونک اٹھا۔ فردت جو روئی لینے کو آگے سرکی تھی، فوراً خالہ بی کے پیچھے ہو گئی۔

”بیں ضیا! یہ منے میاں کیا کہہ رہے ہیں؟“

169 ○ گل بیل

”اٹھئے، شام ہو گئی۔ منے دادا بلا رہے ہیں۔“

”فرجی!“ میں نے جلدی سے کمرے کا جائزہ لے کر اطمینان کر لیا کہ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں ہے۔

”جی!“

”فرج! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اکیلے میں..... پلیز.....!  
”کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ اب ایسی کیا باتیں ہوں گی کہ.....“ وہ شرمائی۔ جیسے  
انہوں کے وہ کیسی باتیں ہوں گی۔

میرے اندر طوفان نے کروٹ لی۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ ٹھام لیا پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ شاید میں نے اسے اپنی جانب کھینچا تھا۔ وہ گھبرا کر پیچے ہٹی، میز سے نکلا گئی۔ میر پر رکھی چیزیں نہ اٹھیں۔

”کیا کرتے ہیں؟“ اس نے دبے لجے میں احتیاج کیا۔

مجھے میسے ہوش آگیا۔ پتا نہیں اس کے احتجاج میں کرب تھایا بے بی، حیرت تھی  
ہار انکل یا شاید میرے اندر کا آدمی ہی جاگ اٹھا تھا۔ وہ جو بھی تھا، اس نے مجھے جھنجور دیا۔  
”سوری..... سوری فرحت.....!“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فرحت نے خود کو سنبھالا۔ چند  
لحے مجھے غور سے دیکھا۔ میں نے شرمندگی محسوس کی۔ ”فرحت! پلیز مانندت مت کرنا  
مجھے..... مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔“ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں قلام لیا۔ ”میں قابو  
نہیں رکھ پایا حالانکہ..... حالانکہ یقین کرو، میں بڑے مضبوط کردار کا مالک ہوں۔  
فرحت..... میں عورت کا احترام کرتا ہوں۔ اسے جذبات کے طوفان میں شکنے کا سارا  
نہیں سمجھتا۔ اسے کھلونا نہیں جانتا مگر تم..... تم پر اپنا حق ضرور سمجھتا ہوں۔ لیکن  
جاننا ہوں کہ حق کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ یوں چھین لیتا..... پلیز فرجی.....!“ میں  
شاید معافیاں مانگ رہا تھا۔ یقین کریں، میں واقعی شرمندہ تھا۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی اپنے  
آپ پر کہ میں بھی اسی کوئی مچھوری حرکت کر سکتا ہوں؟ میں فرحت کے دل میں احترام  
ہن کر اترتا ہوا تھا۔ آج محسوس ہو رہا تھا کہ میں نے اپنے اس کردار کو ٹوڈی ملیا میث کر دیا  
۔

فرحت چپ تھی۔ میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں دیکھ لوں۔

"اے فرجی بیٹا! میرے سر میں مندی ہی لگا دے۔ ٹھنڈک پڑ جائے کی" بی جان نے اسے اٹھا دیا۔ مجھے لگا جیسے میں کوئی صیئن مظفر دیکھ رہا تھا جس پر کسی نے اچانک پر گرا دیا ہے۔ چونک اٹھا۔ مندی لگانا الماچوڑا کام تھا ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بی جان باتیں کرتے کرتے سو جائیں گی تو میں چپکے سے فرحت کو بتا دوں گا کہ اب اس کے بغیر زندگی لفشوں سی چیز لگنے لگی ہے اور یہ بھی کہ میں اماں کو لے کر آؤں گا تو سب سے پہلے تمہیں مانگ لوں گا مگر اب اس کا کوئی چانس نہیں تھا۔ گرمی میں دیر تک چلنے، اعصابی کشیدگی سے دوچار ہونے اور اب ٹھنڈک کمرے میں پنگک پر لینٹے سے آنکھیں بو جھل ہو رہی تھیں۔ مجھے دوپہر میں سونے کی عادت نہیں ہے مگر یہ میں جانتا ہوں کہ دوپہر کی نیند کیسی نشہ آدھر ہوتی ہے۔

میں کب سو گیا، احساس بھی نہ ہوا مگر سوتے سوتے میں نے فرحت کی آنکھوں میں بکھرتے ستاروں سے ہزاروں باتیں کر لیں۔ جب اس کی نگاہِ اٹھتی، وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے پا کر گھبرا جاتی گراحتی دیر میں مجھے لگا جیسے یہ ستارے میرے وجود میں ٹوٹ رہے ہوں۔ انہی خوبصورت کیفیات نے مجھے نیند کی پریسکون وادی میں پہنچا دیا۔

A decorative horizontal line consisting of three segments, each ending in a five-pointed star. The segments are connected by short dashed lines.

میں پتا نہیں کب تک سویا رہتا اگر کسی نے میری انگلی کونہ چھووا ہوتا۔ سرور کی تھی جو سوتے میں چونکا گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرے سامنے فرحت کھڑی تھی۔

اور جذبوں نے شدت اختیار کر کے اسے کتنا آسان بنادیا تھا۔ میں نے رات کے نصورو سے سرت محسوس کی۔

”اس کی قربت بھی تو سرور انگریز ہے۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور پھر بھی جان کی آوز سن کر جلدی سے انھ کر آنکھیں ملنے لگا۔ وہ کمرے میں داخل ہو رہی تھیں۔

”اڑے خیا! مغرب کا وقت ہونے والا ہے پھر ساری رات الوں کی طرح جاؤ گے۔ انھوں!“

”انھ گیابی جان!“ میں نے اسی شکل بنا لی جیسے ابھی ابھی ہی میری آنکھ کھلی ہو۔ انگرائی لی، منہ چالایا، چل پیروں سے گھسیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

”رات کو منی بوبو کے گھر چلانا ہے۔ پوتا آیا تھا ان کا بلاں کو۔ سارے میرٹھ کو خبر ہوئی کہ مسے اور تم آئے ہوے۔ انہوں نے کھانے پر بلایا ہے اور بھیا! یہ نہ دلی ہے نا بینی، یہاں لوگ سر شام ہی کھانا کھا لیتے ہیں۔ تم لوگوں نے اپنی عادتیں بگاڑ لی ہیں۔ دیر سے کھانا“ دیر سے سونا اور دیر سے انھنا۔“

”لبی جان! میں نہیں جاؤں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔ پچھلی بار مل کر تو گیا تھا۔“ میں صحن میں نکل آیا۔

”لو! کمال مل کر گئے تھے۔ وہ تو شکایت کر رہی تھیں“ وہ میرے پیچھے پیچھے تھیں۔ ”اور اب تو میں میاں بھی آئے ہوئے ہیں۔“

”ہاں! تو انہیں لے جائیں۔ ارے ہاں بی جان!“ میں نے ایک دم پلٹ کر انہیں روک دیا۔ پسلے پلٹ کر دیکھا تو قریب میں کہیں میں نے دادا تو نہیں پھر پوچھا۔ ”لبی جان! میں نے ساتھا کہ مسے دادا منی بوبو سے شادی کرنا چاہتے تھے۔“

”اے ہٹ“ وہ نہیں۔ ”فضول باتیں مت کر۔ ابھی سن لیں گے تو آفت آجائے گی۔“

”باتیں تو!“

”تاراض ہو جائیں گے مجھ سے“ وہ راہدارانہ انداز میں بول کر نہیں۔ ”جتنا مجھے ہے، کسی کو نہ پتا ہو گا۔ منی بھی تو بد کتی ہیں مجھ سے۔ بس بیٹا، منی بوبو کے ابا ی پخت خان بن گئے تھے ورنہ سمجھ نیا پار لگنے ہی والی تھی۔ اب تک شادی نہ کی منی بوبو نے تو اس کا سبب یہ مسے ہی ہیں۔“

”فرحت! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ میں نے کہہ دیا کہ اس سے بہتر کوئی موجود نہیں تھا۔ اس طرح میں اپنے کردار کی صفائی بھی پیش کر سکتا تھا۔ وہ میری اسی جذباتی غلطی کو معاف بھی کر سکتی تھی۔

”کتنی دری کر دی یہ کہنے میں۔“

میں اچھل پڑا۔ فرحت کی آواز بھرائی ہوئی ضرور تھی مگر اس میں پیار ہی پیار تھا۔ اسی کشش تھی، ایسا سرور تھا کہ میں نے جنکے سے سراخیا۔ اس کے چہرے پر شرم کے ساتھ ہی جذبات کی تتماہٹ تھی۔ میری ساری شرمندگی، سارا افسوس، ساری مایوسی کے بھر میں ختم ہو گئی۔ ”فرحی! تم نے مجھے معاف کر دیا؟“

”اچھا باب چلیں“ بی جان اور مسے دادا کیا سوچیں گے۔ اس کے لمحے میں مظاہر تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ”ویسے فرحی! میں نے جو کچھ کیا، اس میں میرا قصور کم ہی تھا۔ تمہیں دیکھ کر قابو پانا برا مشکل ہے۔“

”اچھا چلیں۔“ وہ پڑھی۔

میں نے اس کے دوپتے کا پلو پکڑ لیا۔ ”سنو فرحی! ہم کل چلے جائیں گے۔ آج میں کچھ وقت تمہارے ساتھ اکیلا گزارنا چاہتا ہوں۔“

”یہی سب کچھ کرنے کے لئے۔“

”نہیں نہیں۔“ میں نے جلدی سے کما۔ ” وعدہ..... صرف باشی..... نہیں چھو کر میں فنا نہیں ہونا چاہتا۔ تھوڑا سا انتظار کرلوں گا“ میں نے شرارت سے کما۔ وہ نہیں۔ ”اچھا باب، اب چلیں۔“

”پسلے بیاؤ نا!“ میں نے ضد کی۔

”ٹھیک ہے، رات تو آنے دیں۔ بی جان اور مسے دادا“ منی بوبو کے پاس جانے کے کہہ رہے ہیں۔ آپ مت جائیے گا“ اس نے شراتے شراتے کما۔

”اور وہ تمہاری خالہ بی!“

”اڑے بھئی! آپ مجھے پڑوادیں گے۔ مت آئیں باہر، مجھے جانے دیں۔“ وہ پک کر باہر نکل گئی۔

میں دھڑ سے پلٹنگ پر گر کر چوڑا ہو کے لیٹ گیا۔ محبت کا انظمار کتنا مشکل لگ رہا۔

"ایسا زبردست افیر!" میں حیران ہو گیا۔

"ہیں.....! کیا.....؟" بی جان نے منہ کھول دیا۔

"پچھے نہیں۔ آپ لے جائیں انہیں۔ میں کباب میں بہنی نہیں بنوں گا۔"

وہ ہنسنے لگیں۔ "بڑے میاں سے کوتو جانوں؟"

میں تو یہ لے کر غسل خانے چلا گیا۔ وہاں سے نکلا تو منے دادا تیار تھے۔ بی جان بھی تیار تھیں۔ فرحت پکن میں تھی۔ خالہ بی مسئلے پر بیٹھی تھیں۔

"جلدی کریں آپا۔ میں بھی نماز پڑھ کر نکلوں گی۔" بی جان نے خالہ بی کو سلام پھیرتے دیکھ کر کہا اور اپنا دوپٹہ کاںوں کے پیچھے سے سر پر لپیٹ لیا۔

"تم تو اور دیر کر رہے ہو" منے دادا نے بے چینی سے کہا۔

"نمیں منے دادا! میری بہت نہیں ہے اور میری ان لوگوں سے ایسی جان پکان کہاں ہے، میں سوچ رہا ہوں بڑی بوائے گھر ہو آؤں۔ اماں نے ان کی بسو کے لئے چیزیں بھوائی تھیں، وہ دوں گا کچھ دوستوں سے ملوں گا پھر لوث آؤں گا۔"

مجھے لگا منے دادا نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ یہ داستان میں نے زمانوں پلے نی تھی گردھیان نہیں دیا تھا۔ آج اتنے عرصے بعد منی بی بی کا ذکر سن کر مجھے سنی ہوئی تام باتیں یاد آگئی تھیں۔ اتنا اطمینان نے دادا کو نہیں ہوا ہو گا بھتنا مجھے ہوا تھا۔ میں نے بادرپی خانے کی طرف منہ کر کے فرحت کو آواز دی۔ "فرحت چائے پیوں گا۔"

"جی لارہی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ میں گلے باںوں میں تو یہ پھیرنے لگا، لی بی جان نماز شروع کر چکی تھیں۔ منے دادا بے چینی سے پلنگ پر بیٹھے پیر ہلا رہے تھے۔ خالہ بی اپنے کرے میں جا چکی تھیں۔

"خالہ بی نہیں جا رہیں؟" میں نے سرسری انداز میں منے دادا سے پوچھا۔

"ہاں.....! شاید وہ نہیں جا رہی۔"

"کہیں اور جانا ہو گا۔" میں زیر لب بڑرا یا۔ " محلے کے ہر گھر میں نہ جسنا کہ نہیں نہیں آتی انہیں۔"

"ایسے لوگ بڑے ہر دعیرہ ہوتے ہیں" منے دادا نے بہن کر جواب دیا۔

لی جان نماز پڑھتے ہی بر قع اوڑھ کر کھڑی ہو گئیں۔ ان دونوں کے گھر سے نکلے میں دبے پاؤں باورپی خانے کی طرف گیا۔ فرحت سالن بھون رہی تھی۔ اسے میری آں

چاہی نہ چلا۔ چولے کی تپش سے اس کا گلابی چروہ لال ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں کس کے ڈالنے نہیں تھے۔ اکثر گھروں میں کوئے انگیٹھی میں دہکائے جاتے تھے یا پھر بغیر چھٹ دالے تھے میں مٹی کے چولوں میں لکڑیاں جلاتی جاتی تھیں۔

فرحت انگیٹھی پر سالن بھون رہی تھی۔ اس کے اوپری ہونٹ پر پینے کے قطرے ششم کی طرح چک رہے تھے۔ لگ رہا تھا جیسے انگارے پر پارہ ٹھرا ہوا ہے۔ وہ کسی کام سے پلی تو مجھے دیکھ کر در گئی۔

"اوی اللہ!" اس نے اپنا ہاتھ بے اختیار سینے پر رکھ لیا۔  
میں بھی پڑا۔ "بہت ڈر پوک ہو تم۔"

"آپ سے تو ڈر لگنے لگا ہے۔" اس نے کھیا کر کہا۔ "بی جان چل گئیں کیا؟"  
"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ یہاں پہنچ گئے۔ ان کی موجودگی میں تو شاید یہ ممکن نہیں تھا۔" "جی نہیں! ان کی موجودگی میں بھی ممکن تھا اس لئے کہ وہ خوب جانتی ہیں کہ میں نے آپ کو حاصل کرنے کا عمد انتہی سے کیا ہے۔"

"کیا..... کب؟"

اس کی حریت بتا رہی تھی کہ اسے ابھی تک پچھے علم نہیں ہو سکا حالانکہ میں سمجھا تھا کہ اسے علم ہے۔ "جب کچھی بار آیا تھا تبھی کہہ گیا تھا کہ فری میری امانت ہے، اسے سنبھال کر رکھئے گا اسے کچھ ہو ا تو پوری دنیا کو آگ لگا دوں گا۔"

"رہنے دیں..... بس لگا چکے آگ۔" وہ شرم بھی رہی تھی اور باتیں بھی کہتا چاہتی تھی۔

"تھیں ابھی نہیں پتا چلے گا۔ یہ آگ جلاتی نہیں ہے، سلکاتی ہے، دھیسے دھیسے" میں نے اس کے چرے کی تپش سے اندازہ لگایا کہ وہ کس آگ کی بات کر رہی ہے۔ پچھے کوئے سلکا جو رہا تھا، اس کی تپش میں اب بھی محسوس کر رہا تھا اور وہ تو عورت تھی۔ اس کے لئے نے مجھے سلکایا تھا تو تپش تو اسے بھی محسوس ہوئی ہو گی۔ "فری اوپر چلتے ہیں۔ چاندنی میں۔"

"اوپر چاندنی نہیں ہے، سامنے طاہر اللہ کی بلڈنگ کا بلب ہے جس کی روشنی ہماری بھت پر پڑتی ہے۔ ان کے جھروکے اسی جانب کھلتے ہیں۔" اس نے تنیسرہ کے انداز میں دبے پاؤں باورپی خانے کی طرف گیا۔ فرحت سالن بھون رہی تھی۔ اسے میری آں

اپنے دل کو تسلی دیتا رہا۔ یہ خیال مجھے اچانک ہی آیا تھا کہ وہ آبھی گئی تو میں کیا کروں گا۔ انہمار محبت میں کرچکا تھا۔ اصولی طور پر تو اتنا کافی تھا۔ اب مجھے اماں وغیرہ کو بھیج کر منکنی کا یا ہوچ کا بند دست کرنا چاہئے تھا مگر میری بے قراری عجیب سی تھی۔ میں جو طبیب کے انداز کو چکھوڑپن یا لوٹھیارپن کہا کرتا تھا، خود حد سے گزر رہا تھا۔ فرحت کی آمد کے خیال ہی سے بدن میں چیزوں نہیں رینگنے لگی تھیں۔

آج چاند نہیں نکلا تھا۔ وہ روشنی جسے میں چاند کی روشنی سمجھ رہا تھا، واقعی سامنے والی بلڈمگ کی پیشانی پر لگے بلب کی تھی۔ وہ بجا تو اس چھٹ پر بھی تاریکی چھا گئی۔ اس اذہری کے ساتھ ہی میرے اندر کی بے چینی بڑھ گئی۔ کافی وقت گزر پکا تھا، فرحت نہیں آئی تھی۔ اب مجھے کوفت ہونے لگی تھی۔ صبح سوریے دہلي کے لئے نکل جانے کا پڑ گرام بن چکا تھا۔ پھر جانے کب آتا ہوتا۔ میں بے چینی سے شلنے لگا۔ آخر تنگ آکر میں نے واپس بستر پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی میں نے قدم سیڑھیوں کی طرف پر ہلایا ہی تھا کہ مجھے اپنی پشت پر آہٹ محسوس ہوئی۔ میں پلتا تو اس نسوانی ہیولے کو دیکھ کر ٹھنک گیا جو بے پاؤں میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں خوشی سے دیوانہ وار اس کی طرف پکا۔

”فرحت! اتنی دیر کر دی“ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہوں!“ وہ یوں بولی جیسے ہنسی دباری ہو۔

”میری بے قراری کا لطف لے رہی تھیں؟“ میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ پر دیں، بہت سرد۔

پھر وہی دبی دبی ہنسی سنائی دی۔ اس کے پاس سے بڑی مسحور کن خوبصورت آری تھی۔ ”ارکل رہا ہے ناٹھنڈے ہو رہے ہیں تمہارے ہاتھ۔“

میں غیر محسوس طریقے سے اس کے قریب ہو گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشنگوار حیرت ان کے فرحت نے مجھے پیچھے ہٹانے یا خود سرک جانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

”تینی چاند کی کرنوں کو گواہ بنا کر تمیں اپنانے کا وعدہ کرتا ہوں،“ فرحت! جو جذبہ ہنسنے سے میرے اور تمہارے درمیان کی دوری میں پلتا رہا، وہ محبت کا جذبہ تھا۔ اسے میں اب محسوس کیا ہے۔ تم بھی وعدہ کرو کہ میرے سوا کبھی کسی کے متعلق سوچو گی بھی نہ۔ ”عدہ کرو۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔ ”کیا مصیبت ہے یار، ذرا سی بھی روشنی نہیں ہے کہ میں تمہاری

کہا۔“

”مکمل ہوں گے، چبوس۔“ میں نے اس کا ہاتھ کپڑا لیا۔

”ارے چھوڑیں بھی! خالدے بی آجائیں گی۔ مجھے سالن بھوننا ہے۔“

”فرحت پلیز! اس لمحے کا انتظار میں نے برسوں کیا ہے۔“

”سب کچھ تو کہہ چکے آپ، اب کیا ہے؟“ وہ جھگک رہی تھی۔

”میں نے کہا ہے سب کچھ اور تم نے؟ تم نے کچھ بھی نہیں کہا۔“

”میں کچھ نہیں کھوں گی۔ مجھے کچھ نہیں پتا بس۔“ فرحت جلدی سے باور پی خانے سے نکل کر کھلے صحن میں آگئی۔

میں نے چائے کا کپ دیں رکھ دیا۔ فرحت کے انکار میں اقرار کا پلو مجھے مسودہ رک رہا تھا۔ لیکن یوں سمجھنے کہ اللہ نے کرم کر دیا۔ خالدے بی باہر آگر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے فرحت سے کہا کہ وہ ان کے سر میں تیل ڈال دے۔ میرے سارے پوگرام دھرے رہ گئے۔

فرحت کے چرے پر مایوسی صرف لمحہ بھر کو چھائی پھر وہ مجھے منہ پڑانے لگی۔ میرا بھی چالا کر میں سر دیواروں سے نکلا تا پھر ہوں۔ خالدے بی بہت گھاگ تھیں۔ انہوں نے گھٹا بھر سر دیوا۔

جب تک میں دادا اور بی جان آگئے ان کا اوایلا ختم نہیں ہوا، وہ رہ رہ کر ہائے کاغزوں کا لائل تھیں۔

بی جان اور میں دادا کی آمد نے تو میرا دماغ ہی اڑا دیا۔ آج کیا، میرٹھ سے نکلتے ہی یہ احساس ہو گیا تھا کہ جو ضیا فرحت کو باہمیوں میں لے کر اس کے کانوں میں پیار بھری سرگوشیاں کرنا چاہتا تھا، وہ میں نہیں، کیا باہر سے آیا ہوا کوئی شخص تھا جس نے میرے قاب میں ڈھل کر میرے شفاف کردار کو داغ دار کر دیا تھا۔ ہاں.....! اس رات جب

لی جان اور میں دادا کے علاوہ خالدہ بھی سو گئیں۔ اس رات میری آنکھیں جلتی رہیں۔ نہیں آئی۔ میں گھر میں پھیل جانے والے نائے کا منتظر تھا اور جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب

سب سوچکے ہیں تو میں دبے پاؤں اٹھا، فرحت آج بھی بی جان کے کمرے میں سوتی تھی۔ بن اب پلٹک الگ تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا پاؤں ہلایا اور یہ دیکھ کر وہ جاگ

گی ہے، اسے اشارہ کرتا ہوا سیدھا چھٹ پر پہنچ گیا۔

انتظار کے لمحے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ میری آنکھیں سیڑھیوں پر اور کان کو آہٹ پر لگے تھے۔ ”شاید فرحت کی ہمت نہیں ہو رہی یا شاید بی جان اٹھ گئی ہوں۔“ میں

فرحت نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکلا۔ وہ چپ چاپ میرے قریب مٹی پہنچ رہی۔ طوفان کا زور ٹوٹا تو احساس ہوا کہ میں نے کیا کر دیا۔ خوف آیا کہ نیچے منے دادا، میرا آپ بھلا گئی۔ طوفان تھا جو مجھے بنا کر کمیں سے کمیں لے گیا میں نے آگ کا سمندر پر گالہ لی اور لی جان ہیں۔ افسوس ہوا کہ میرے کردار کی مضبوطی ملے کا ذہیر بن گئی۔

شرمدیگی ہوئی کہ میں طیب کی سطح سے بھی نیچے گر گیا۔ میرا وہ رعب بدبہ، وہ وقار جو ہر ٹوٹی کی ٹوٹا میں میرا احترام پیدا کر دیا کرتا تھا، گویا ہوا میں تخلیل ہو چکا ہے۔ میں نہیں پہنچ سکتے۔ کسی لمحے کیڑے میں تبدیل ہو چکا ہوں۔

خوف سے دبے ہوئے تھے، سراہلانے لگے۔ پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ مدھو شی تھی کہ مجھے میرا آپ بھلا گئی۔ طوفان تھا جو مجھے بنا کر کمیں سے کمیں لے گیا میں نے آگ کا سمندر پر گالہ لی اور لی جان ہیں۔ افسوس ہوا کہ میرے کردار کی مضبوطی ملے کا ذہیر بن گئی۔



”فرجی! فرجی! مجھے معاف کرو۔ میں جاتے ہی اماں کو بھیجوں گا۔ بہت جلد.....“  
میں نے پیشانی پر آئے بیسے کو پوچھتے ہوئے کہا۔ فرحت نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا۔  
”زست! میں..... میں بے قابو ہو گیا تھا۔ فرحت.....!“

وہ اب چپ چاپ کھڑی ہو گئی جبکہ میں گھنٹوں کے مل بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اسی ہبائٹے قدموں پر ہتنا شروع کر دیا جس جانب سے آئی تھی۔ اب مجھے خیال آیا کہ وہ اس طرف سے کیسے آئی تھی؟ سیرھیاں تو دوسری طرف ہیں۔ وہ اب بھی اسی جانب بڑھ لی تھی۔ ”فرجی! اکمال جا رہی ہو؟ اوھر سے کیسے آئیں تم؟ رستہ ہے.....؟ سیرھیاں بیٹھا کیا؟“

اس نے جواب نہیں دیا۔ میں سمجھا کوئی راستہ ہو گا تبھی تو آئی تھی۔ ”سبھل کے رہنا۔“ اور اس نے یون دیوار کی طرف قدم رکھا جیسے سیرھی پر رکھا ہو۔ میں کھڑا ہو گیا، گھنٹوں سے او جھل ہونے سے پہلے اس نے میری جانب ہاتھ ہلایا تو شرمدیگی کا وہ احساس اس کی خاموشی نے شدید تر کر دیا تھا، کچھ کم ہوا۔ میں نے بوجھ کم ہوتا محسوس کیا اور اس کو کرہا تھا ہلایا۔  
”گویا فرحت نے مجھے معاف کر دیا۔“ اس خیال نے مجھے کچھ بہتر تو کر دیا مگر میرا اپنا

کے بعد آدمی اپنے ہوش کھو دیتا ہے۔ فرحت میرے سامنے بے ہوش پڑی تھی۔ خالہ لی بھی اس کے سرانے بیٹھی تھیں۔ کچھ پڑھ پڑھ کراس پر پھونک رہی تھیں۔ ایک تام چینی کے تسلی میں پانی تھا جس میں کپڑے کی پٹیاں تیر رہی تھیں۔ لگ رہا تھا کہ وہ جانے کب سے اس حالت میں ہے اور جانے کب سے بی جان اور خالہ بی اس کے سرانے بیٹھی ہیں۔

میں نے آگے بڑھ کر فرحت کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ بڑی طرح تپ رہی تھی۔  
”کب سے یہ حالت ہے؟“ میں ایسے بولا جیسے کوئی اور بولا ہو۔

”بس بستر پر لیٹیں ہے۔ میں باتیں کر رہی تھی۔ کہنے لگی کہ بدن میں درد ہو رہا ہے۔“  
میں نے اپنے پاس بلا لیا۔ ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ مجھے لگا میرے قریب آگ دکھ رہی ہے۔ اٹھ کے دیکھا تو عاشی چھائی ہوئی تھی اور بخار تیز ہو چکا تھا۔ تب سے یہ حالت ہے۔“

”پھر..... وہ..... وہ کون تھی.....؟“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”کون.....؟“ بی جان چونکیں۔

”نہیں..... کوئی نہیں.....“ میں گڑ بڑا گیا۔ ”اب کیا کریں! یہاں ڈاکٹر ہے  
قریب میں کوئی؟“

”نہیں، اسپتال میں لے جانا پڑے گا۔“

”اتنی رات کو سواری کا کیا ہو گا؟“ میں بظاہر ان سے باتیں کر رہا تھا مگر حالت غیر ہو رہی تھی۔

”سوریا ہونے والا ہے“ خالہ بی بولیں۔ ”میں حکیم ابن کو لے آؤں گی۔“

”تمَ مَاں تھے؟“ اچانک بی جان نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”نیند نہیں آرہی تھی۔ چھت پر چلا گیا تھا۔“

”ہااا! جبی تو میں کہوں، دو بار نکلی کمرے سے، تمہارے کمرے کے آگے تو مذکا رکھا ہے۔ تمیں پتا بھی نہ چلا سوچا پسلے تمیں اٹھا دوں پھر خیال آیا گھری نیند میں ہو ورنہ اٹھ گئے ہوتے۔“

وہ بول رہی تھیں اور میں فرحت کی لمبی چیلیا کو دیکھ رہا تھا جو کس کے بندھی ہوئی تھی اور اس کے سر کے نیچے سے نکلی پلٹک کی پٹی سے لٹک رہی تھی۔

”اس کے بال تو کھلے ہوئے تھے۔“ اس خیال نے میرے اندر سننی سی پھیلا دی۔

کردار، میری برداشت، میرا اپنا اشائل سب کچھ بدل چکھتا ہے۔ اس پر مجھے پچھتا ہے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس زمانے میں کسی لڑکی کی طرف میل آنکھ سے کوئی دکھ لیتا تھا تو لڑکی بدنام ہو جاتی تھی اور میں نے تو فرحت کے دل میں موجود شاید مار احترام کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس کے جاتے ہی پھر خوف، شرمندگی اور احساس جو مجھے جکڑ لیا۔ میں نے فرحت ہی کے نہیں، بی جان کے اعتاد کو بھی نہیں پہنچائی تھی۔ کی عزت کو بھی بیالگایا تھا۔ منے دادا کی آنکھوں میں بھی دھول جھوکی تھی۔ اگر کسی کو بھی ہو جاتا تو شاید قیامت آجائی۔

”اے خدا! مجھے معاف کرونا“ مجھے اپنے آپ سے زیادہ فرحت کا خیال آرا ”میں صح اس کا سامنا کیسے کروں گا؟“ یہ خیال مجھے پریشان کر گیا۔ میری ہمت نہ ہوں میں نیچے جا کر بستر پر لیٹوں لیکن جانا تو تھا۔ ہمت کی اور دبے پاؤں نیچے پہنچ گیا۔

لی جان کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ بی جان کی اواز بھی آرہی تھی،“ دم ہی نکل گیا۔ لگا جیسے انہوں نے فرحت کو رنگلے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ جی چاہا کہ بھاگ کر سے باہر چلا جاؤں اور پھر کبھی ساری زندگی ان لوگوں کا سامنا نہ کروں۔ ابھی میں یہ نہیں کر سکتا تھا کہ کیا کروں کہ اچانک بی جان کمرے سے باہر نکل آئیں۔ زمین نے میں پاؤں پکڑ لئے۔ میں جیسے پھر کا بن گیا۔ اس دھماکے کا انتظار کرنے لگا جس کے بعد ہم وجود کے، میری عزت و کردار کے چیتھڑے اڑ جاتے مگر بی جان نے گھبرائے ہوئے میں جو کچھ کہا، اس نے مجھے اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

”فرحت بخار میں بے ہوش پڑی ہے نیا! ایک گھنٹے سے ماتھے پر پٹیاں رکھوں، ذرا بھی آرام نہیں آیا۔ ذرا پانی تو لاو صراحی سے۔“

یہ کہہ کر اور کٹورا میرے ہاتھ میں تھما کرو وہ تو اسی تیزی سے اندر چل گی۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجھنے لگیں۔ کچھ دیر تک تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا ہمہ میں کر بھاگا کیونکہ بی جان مجھے پکار رہی تھیں کہ جلدی لاو پانی۔۔۔۔۔۔ میں نے صراحی اپنڈیا اور لرزتے ہاتھوں میں کٹورا تھائے بی جان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کاشٹ کر پھر میرے اندر طوفان سے اٹھنے لگے مگر یہ طوفان سرور آمیز نہیں تھے بلکہ ایسے تھے جس میں آدمی کا سب کچھ بہ جاتا ہے۔ جہاں سے نکلنے کی کوئی امید نہیں ہوتی۔ طوفان نہیں تھا جو اترتا ہے تو آدمی کو ہوش آ جاتا ہے بلکہ یہ وہ طوفان تھا جس کے

میں تیزی سے اپنے کمرے میں گھس گیا۔ جوتے پن کر باہر آیا۔ کپڑے تبدیل ہر نے کا وقت نہیں تھا۔ خالہ بی نے مجھے پتا سمجھایا۔ یہ اگلے محلے کے گھر کا پتا تھا۔ میں گھر ہے نکلا تو ملکجے اجائے میں پرندوں کے غول پرواز کر رہے تھے۔ آسمان کے کنارے سرمی ہو چکے تھے اور قریبی مسجد سے اذان کی آواز گونج رہی تھی۔ جانے مجھے کیا ہوا کہ اذان کی آواز کاںوں میں پڑتے ہی مجھ پر بہت طاری ہو گئی۔ دل خوف اور گناہ کے احساس سے بھر گیا۔ میں حکیم کے پاس جانے کی بجائے سیدھا مسجد کے قریب بنے حمام میں چلا گیا۔ میں نے نسل کیا، حمام ہی سے تبدیل اور بنیان لے کر ایک تولید کندھوں پر ڈال کر سیدھا مسجد چلا گیا۔ وہاں رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ صراط مستقیم پر چلنے کی تمنا کی۔ ہدایت کے لئے گزر گیا اور پھر حمام جا کر اپنے کپڑے پن کر حکیم ابن کے گھر پہنچا۔ انہیں ساتھ لے کر گھر آیا تو منے دادا بے چینی سے نسل رہے تھے۔

”اتی دیر کروی تم نے؟ تم بے پرواکب سے ہو گئے!“ انہوں نے کما اور پھر حکیم ابن کو لے کر کمرے میں چلنے گئے۔ میں وہیں صحن میں پڑے پلٹک پر ڈھنے گیا۔

حکیم ابن نے کچھ دوائیں دیں اور چلنے گئے۔ بی جان بست پریشان تھیں۔ منے دادا بھی مضطرب تھے۔ خالہ بی مسلسل دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ سب فرحت کے لئے پریشان تھے مگر میں.....! میں عجیب سی کیفیت سے دوچار تھا۔ یہ تو میں ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ وہ جس کے ساتھ میں نے دو ڈھانچی گھنٹے گزارے، جسے محسوس کیا، چھووا، جس کی خوبی کو اپنے اندر اتار لیا، وہ کوئی مادرانی حقوق تھی۔ وہ سو فیصد انسان تھی۔ اگر وہ فرحت نہیں تھی تو پھر کون تھی؟ یہ وہ سوال تھا جس نے مجھے ہر طرف سے بے نیاز کر رہا تھا، اس سے تو مجھے شرمدگی کے جس احساس سے اپنی شخصیت کو کچلا ہوا محسوس کر رہا تھا، اس سے تو مجھے آزادی مل گئی تھی مگر اب میں جس کرب سے دوچار تھا، وہ انشتا کا تھا۔

اس لڑکی کی سانسوں کی حدت اب بھی میرے اندر بیسی ہوئی تھی۔ اس کے نرم و ملائم ہاتھ، اس کے خوبصوردار ہال، اس کی گھنگرو بجائی سی نہیں، یہ سو فیصد انسانی تھی۔ یہ وہ بات تھی جس پر میرا داماغ اصرار کر رہا تھا مگر وہ فرحت نہیں تھی۔ یہ بات بھی بار بار گونج رہی تھی۔ ”کون تھی وہ؟“ میں اتنا بے اختیار ہو گیا کہ یہ جملہ میرے مہے سے نکلا اور پاس سے گزرتے ہوئے منے دادا کے کاںوں میں پڑ گیا۔

”ضیاء! کیا بات ہے.....؟ کیا..... کوئی.....؟“

”وہ کون تھی؟ کیا وہ اس لئے چپ تھی کہ وہ..... وہ فرحت نہیں تھی۔ میرے نیچے آنے سے دو منٹ پہلے ہی تو وہ گئی تھی۔“ میرے دماغ میں جھکڑ چلنے لگے۔ ”وہ کون تھی؟“ جیسے مجھے کسی نے ڈنک مارا۔ ”وہ اس طرف سے آئی تھی جہاں سے میری معلومات کے مطابق اپر آئے کو سیرھیاں نہیں تھیں۔“ یہ خیال آتے ہی میں پلٹ کر چھٹ پر بجا گا میں بے اختیار اس طرف بڑھا جہاں سے وہ آئی تھی۔ جیسے ہی میں نے نیچے جھانکا، دم بخورہ گیا۔ وہاں سپاٹ دیوار تھی۔ کمیں پاؤں نکانے کی بھی جگہ نہ تھی جبکہ میں نے اترے وقت کچھ فاصلے سے اسے دیکھا تھا اور یوں لگا تھا جیسے وہ پہلی، پھر دوسری اور پھر تیسری سیرھی پر قدم رکھتی ہوئی دھیرے دھیرے میری آنکھوں سے او جھل ہو رہی ہو۔

”یا خدا!“ میں نے وہیں بیٹھ کر اپنا چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ”وہ..... وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ میں نے یہ کیا کر دیا؟“ میں بڑی رہا تھا۔

”ضیاء! ضیاء!“

نیچے منے دادا مجھے آوازیں دے رہے تھے۔ میں نے جلدی سے خود کو سنبھالا۔ سوچنے کا کوئی لمحہ میرے پاس نہیں تھا۔ یہ تو ایسا واقعہ بھی نہیں تھا کہ میں منے دادا کو رازدار بناتا جو کچھ میں کر بیٹھا تھا اس جنم کے احساس نے پہلے ہی مجھے ادھ موکار دیا تھا اور اب یہ خیال کہ وہ فرحت نہیں تھی، کوئی اور تھی، مجھے اور ہولائے دے رہا تھا۔

”ضیاء!“

”جی آیا منے دادا!“ میں نے چرے پر ہاتھ پھیرنا جیسے میرے ہاتھ پھیرنے سے پریشانی اور خوف کے سارے تاثرات مت ہی تو جائیں گے۔ پھر میں تیزی سے نیچے آیا۔

”یہ وقت ہے چھٹ پر جانے کا۔ فرحت کی حالت دیکھی ہے!“ وہ مجھے دیکھتے ہی ڈانٹنے لگے۔

”جی.....! جی، منے دادا! خالہ بی کہہ رہی تھیں کہ وہ حکیم کو بلا ایسیں گی۔“ میں نے گزر ڈا کر جواب دیا۔

”اور تم سن کر چھٹ پر چلنے گئے؟“ انہوں نے ناراضگی سے کہا۔

”نہیں! وہ تو..... میں تو.....“

”جاوہ!“ وہ گر جے۔ ”پتا کرو حکیم کا اور لے کر آؤ۔ ساری رات بچی تریپی ہے اور

”..... تم.....“

”کوئی نہیں آیا بیٹا! اتنی رات کو کون آتا ہے؟ اب تو فخر کی اذانیں ہو رہی ہیں“ بی  
بانگی آزادیک دم رنده گئی  
”کون آیا تھا فرحت!“ میں نے اشارے سے بی جان کو چپ کر کے اس سے

بچا۔ ”آں.....! ہاں.....! وہ آئی تھی..... چلی گئی..... خوشبو.....  
پندلی میں..... بلڈنگ کا بلب ہے.....“

میرا خون خنک ہو گیا۔ وہ غشی کے عالم میں جانے کیا کہ رہی تھی، یا کیا کہنے والی  
فی۔ ”بی جان! آپ جا کر سو جائیں۔ خالہ بی! آپ بھی کچھ دیر لیٹ لیں۔ اس پر غشی طاری  
ہے۔ میں کافی سویا ہوں۔ میں بیٹھ سکتا ہوں“ میں گزرا کر کہ رہا تھا۔

”نماز پڑھ لوں، نیند بھلا کیسے آئے گی“ بی جان گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے  
لیں۔ ”آپ! آپ جا کر کچھ لیٹ جائیں“ آخری جملہ انسوں نے خالہ بی سے کہا تھا۔ انہیں  
ہی نماز پڑھنا تھی۔ غمیت ہوا کہ ان دونوں کے کرے سے جانے تک فرحت کچھ نہیں  
لی۔ بڑھاں سی پڑی رہی۔ میں نے بھی اسے نہیں چھیڑا۔ میں جان گیا تھا کہ ان لوگوں کی  
بڑگی میں اسے چھیڑنا خطرناک ہے۔ ان دونوں کے جاتے ہی میں نے فرحت کا بغور  
ہڑو لیا۔ وہ جو بھی تھی، فرحت نہیں تھی، اس لئے کہ فرحت کائن کے کپڑے پنے تھی  
لہ میں ریشمی کپڑوں سے الجھا تھا۔ فرحت کے کسی ہوئی چوٹی بندھی تھی اور اس کے  
ٹھیک بال کھلے ہوئے اور بالکل سیدھے تھے جبکہ فرحت کا بال موٹا بھی تھا اور ان میں بلکہ  
اکل آیا ہوا تھا۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر لس کو محسوس کرنا چاہا۔ میری حس  
سر میں چیخ اٹھی کہ نہیں..... یہ وہ لس نہیں ہے، وہ گداز نہیں ہے۔ اس لمحے مجھے  
تھا۔ باکری تھی، وہ میرے سوچ کر کہ میری جو حیرت انگیز بیانی تھی، جو انہیمیرے میں بھی سوتی کو واضح  
تھی اور کون آتا فری!“ بی جان نے آئی! میں گھنٹوں الجھا رہا اور مجھے اس میں اور  
نہیں! تمہارا ہاتھ جلتا ہے۔ مجھے نہیں چھوڑو۔“

فرحت کسمی۔ میں نے جلدی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا حالانکہ وہ بالکل غلط کہہ  
تا گی۔ اس کا ہاتھ تپ رہا تھا اور میرے ہاتھ ٹھنڈے تھے۔  
”فرجی! سنو، میں ضیاء ہوں۔ تم اپر کیوں نہیں آئی تھیں؟“ میں نے جھک کر اس

”نہیں میں نے دادا! وہ..... میں نے شاید خواب دیکھا تھا۔“ میں گزرا کر اٹھ بیٹھا  
”کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے ؟“ انہوں نے رازدارانہ انداز میں بھک کر  
پوچھا۔

”نہ..... نہیں..... سب ٹھیک ہے۔ فرحت کیسی ہے؟ اسے ہوش آیا؟“  
”ہاں“ میرا خیال ہے کہ اب کچھ بہتر ہے۔ دوا کی دو خوراکیں دی ہیں۔ کچھ دری میں  
اور ٹھیک ہو جائے گی۔ تم اندر جا کر بنھو۔ بی جان تو ہولی ہوئی ہیں۔“  
وہ یہ کہتے ہوئے پانی کی نیکی کے پاس جا بیٹھے اور وضو کرنے لگے۔ اب آسمان پر  
روشنی چھانے گئی تھی۔ جو ہو چکا تھا، اس پر سوپنے کو زندگی پڑی تھی۔ کیفیت اچھی ہو یا  
بُری، آدمی کو ایکیلے ہی اس کے نشیب و فراز سے گزرنا پڑتا ہے۔ میں جس اذیت سے دوچار  
تھا، جس اسرار میں پھنس چکا تھا۔ منے دادا کے رازدار ہوتے ہوئے بھی انہیں کچھ نہیں بتا  
سکتا تھا۔ میں مٹھاں سا اٹھ کر اندر چلا آیا۔ فرحت کا سامنا کرنے کی جو ہمت ٹوٹی تھی وہ تو  
بندھ گئی کہ وہ میرے کردار کے کمزور پلوے نا آشنا رہی مگر اس کی قیمت پکانے میں، میں  
ٹوٹ پھوٹ پکا تھا۔

”آں.....! کون ہے..... کون آیا ہے بی جان.....؟“  
اچانک فرحت کی کمزور سی آواز سنائی دی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید اس نے  
میری آہٹ سن لی تھی۔

”کون نہیں بیٹا! خیا ہے۔“ خالہ بی نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار  
سے جواب دیا۔

”اوہ کوئی نہیں آیا؟“  
وہ پھر گردن کو ایک طرف ڈال کر بولی۔ اس بار اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش  
کی مگر شاید بخار کی شدت سے کھول نہیں پائی۔

”نہیں اور کون آتا فری!“ بی جان نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا۔  
”مہمان آئے تھے؟“

اب میں اس کے قریب جا بیٹھا۔ مجھے لگا ہے وہ کسی اہم راستے پر دہ اٹھانے والی  
ہے۔ اور داقی یہ راز میرے لئے کتنا اہم، کتنا سرستہ تھا، یہ تو میں ہی جانتا تھا۔ میرے اندر  
کی تمام قوتیں ساماعت بن کر اس کی جانب گمراہ ہو گئیں۔

کی آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ لگتا ہے پوری دنیا میں گونج رہی ہے۔ سب سن رہے ہیں۔  
مالانکہ یہ گونج اندر ہی رہتی ہے گر اس گونج سے ہی تو چرے پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں۔  
بزم بچپنا جاتا ہے، جھوٹ پکڑا جاتا ہے، آدمی نروس ہو جاتا ہے، یہی میری کیفیت تھی۔  
بمحض لگ رہا تھا جیسے رات کی پوری داستان میرے چرے پر لکھی ہوئی ہے۔ منے دادا سب  
کچھ پڑھ رہے ہیں۔ میں خود پر قابو پانے کے چکر میں اور نروس ہو رہا تھا۔

”آپ ناشتا کریں، مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے اور پرانے تو یوں بھی مجھے بالکل  
پسند نہیں ہیں۔ ہضم ہی نہیں ہوتے۔“ میں نے بیٹھتے ہوئے کما اور اپنے لیج کو کافی مضبوط  
بنایا۔ لگا کہ جیسے میں اپنی کیفیت کو چھانے میں کامیاب رہا ہوں مگر اس وقت اور بوکھلا گیا  
جب منے دادا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”کون سے ناشتے اور کن پر انھوں کی بات کر رہے ہو؟“

میں نے چونک کر پہلے انسیں پھر ان کے سامنے رکھے چائے کے سامان کو دیکھا۔  
وہاں صرف چائے والی، دودھ والی، چینی والان کے علاوہ تین چائے کی پیالیاں تھیں۔ ناشتے  
ہم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ”تی نہیں.....! وہی جان کہہ رہی تھیں کہ ناشتا کرلو۔“  
”پرانے تو بیٹھا فرحت ہی بنا لیتی ہے۔ وہ بھی کبھی کبھی جی چاہتا ہے اس کا، ورنہ میں  
اور آپا تو باسی روٹی اور رات کے سالن سے ہی ناشتا کرتے ہیں۔“ بی جان میری بات نہیں  
بھیں۔

”چائے پیو!“ منے دادا نے یوں کہا جیسے کہہ رہے ہوں، ہوش میں آجاو۔  
میں جلدی سے جھک گیا۔ پھر مجھے نہیں پتا کہ منے دادا اور بی جان کیا باتیں کرتے  
رہے۔ کبھی کبھی میرا دھیان ان کی باتوں کی طرف ہو جاتا تھا ورنہ میں اپنے اندر ہی چھپا  
رہا۔ خود کو ٹوٹا رہا اس لڑکی کو کھو جانا رہا جس نے اتنا وقت میرے ساتھ بیٹھ کر ربط کے  
گزار لیا تھا۔ ”ایں.....؟“ اچانک مجھے اس خیال کے ساتھ ہی جھر جھری ہی آگئی۔  
ایک مری ہوئی عورت کا تصور کرتے ہی مجھے ابکلی آگئی۔ میں اٹھ گیا۔ جی خراب ہونے لگا۔

”یہ! ایں ایسی حرکت نہیں کر سکتی اور پھر شالی بیانے کہا تھا کہ وہ مجھے نقصان پہنچا ہی  
نہیں سکتی۔ و تسلانے بھی کہا تھا کہ وہ مجھے تو نقصان نہیں پہنچا سکتی اسی لئے مجھے پریشان  
کرنے کو اس نے پیڑ کا یہ حال کر دیا۔“

”نہیں! اس میں اتنی بہت نہیں کہ..... وہ..... پھر.....؟“ میرے دماغ

کے کان میں سرگوشی کی۔

”میں گر جاتی ہوں۔ چڑھ نہیں سکتی۔ خوشبو بہت تیز ہے۔ نہیں..... میں..... میں.....  
جاوں گی اور..... ذر لگتا ہے۔“ وہ پھر بے ربط جملے بول رہی تھی اور میں انہیں ہر  
کر رہا تھا۔

”میں نے بلا یا تھا نا فرحت! تم آئی تھیں؟“ میں نے پھر سرگوشی کی۔

”نہیں! ذر لگتا ہے پھر.....“ اس نے بست گمراہیاں لے کر جملہ اوہ موراہم  
دیا۔ جیسے تھک گئی ہو۔

”پھر کون آیا تھا؟ تم اور میں تھے تا..... اور، چھست پرا!“ میں اس پر جھکا ہوا ز  
”کوئی آیا تھا۔“

وہ بولی اور پھر لگا جیسے سو گئی ہو۔ میں نے کئی بار ہلایا، بات کرنے کی کوشش کی  
بے خبر ہو چکی تھی۔

اس کی باتیں واضح نہیں تھیں اور اب کچھ پوچھنا بھی بیکار تھا اس لئے کہ غالباً  
جان نماز ٹڑھ چکی تھیں۔ منے دادا اور ان کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔  
فرحت کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ کیا اسے ہوش میں آنے کے بعد یاد ہو گا کہ کوئی آیا تھا،  
اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپر نہیں آئی اور جو بھی آئی تھی اس سے فرد  
کی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر کیا ہوا؟ وہ رات اچھی بھلی تھی تو اتنی بیمار کیسے ہو گئی یہ  
جانے کے لئے مجھے بہر حال اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنا تھا۔

”ضیاء! ہوا چائے پی لو۔ ناشتا کرو گے؟“ بی جان اندر آکر بولیں۔

”نہیں بی جان! ناشتا تو نہیں کروں گا۔ بس چائے پیوں گا۔“ میں نے کھڑے ہوئے جواب دیا۔

”سو گئی یہ.....؟“

”تی! میرا خیال ہے کہ آرام کرنے سے جلدی بہتر ہو جائے گی۔“

”ہاں! حکیم صاحب بھی کہہ گئے ہیں کہ جتنا سو لے، بہتر ہے۔“  
ہم دونوں باہر آگئے۔ منے دادا چائے پر منتظر تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے نغمے  
دیکھا۔ میں نروس ہو گیا۔ احساس جرم آدمی کو نہیں کا نہیں چھوڑتا۔ لاکھ وہ دنیا کی ٹھیکانے  
سے اپنے جرم کو چھپا لے مگر وہ جو اندر بیٹھا ہے، اس جرم کی حکایتیں ساتا رہتا ہے।“

میں پھر جھوڑ چلنے لگے۔ ”کیا اس محلے کی کوئی لڑکی تھی، کیا فرحت کی کوئی دوست تھی؟ کوئی جانے والی.....؟“

”خیاء! مشورہ دو..... کیا کریں؟“

منے دادا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے لمحہ بھر کو انہیں دیکھا پھر مجھے خود پر غصہ آگیا۔ میں نو عمر لڑکوں جیسی حرکتوں کا شکار تو ہوا ہی تھا۔ اپنی سوچ اور اپنی کیفیت پر بھی قابو پانے میں اسی طرح ہاکام ہو رہا تھا جیسے کوئی نو عمر لڑکا..... میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ جو بھی تھی، اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ بلکہ مجھے تو زندگی کے سب سے حسین پلو سے آشنا کیا تھا۔ آپ برامت مانے گا میری اس بات کا، اس لئے کہ انسان ان سروار گنیز لمحوں سے ہٹ کر اور کچھ بھی نہیں ہے۔ انہی لمحوں کی تو تخلیق ہے یہ..... یہ میرا نظریہ ہے۔ بھر حال یہ ضروری نہیں کہ میرا یہ نظریہ درست ہو اور میں اصرار بھی نہیں کروں گا کہ آپ دنیا کو، یہاں موجود رشتہوں اور جذبوں کو میرے ان نقطے نظر سے لیں۔ ہاں، تو میں بتا رہا تھا کہ میں خالی الذہن ہو کر منے دادا کے قریب آئیا۔ میرا اعتدال بحال ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ میں نے جو کچھ کیا سو کیا، اب اپنے آپ کو سنبھال لینے کا عدد بھی کر لیا تھا۔ شاید توبہ کر لئا اسی کو کہتے ہیں اور خدا کا معاف کر دیتا بھی، کہ وہی تو اعتماد بحال کرتا ہے۔ یہجانی کیفیت سے نکال کر قوت ارادی مضبوط کرتا ہے۔

”جی میںے دادا!“ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”کیا کریں! فرحت کو ایسی حالت میں چھوڑ کر جانا زیب تو نہیں دیتا۔“

”میرا خیال ہے کہ آج اور رک جائیں۔ یہاں لی جان اور خالہ بی ہی تو ہیں۔“ میشی می وغیرہ بھی یہاں سے چلے گئے۔ کوئی مرد نہیں۔ فرحت بھیک ہو جائے تو بترہے۔“

”ہاں! سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں مگر گھر کی طرف سے بھی پریشان ہے۔“

”وہاں کے لئے پریشان نہ ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے، طیب اب تک وہیں ہو گا۔“

وہ پوچکے: ”میں.....! ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس ناہجار کی پیائی کر دوں گا میں۔“

انہیں ایک دم غصہ آگیا۔

”اچھا ہی تو ہے منے دادا.....! ہمارے یہ پچھے کوئی تو ہے وہاں۔“

”تمہیں کیسے پتا کہ وہ نہیں گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے چلا گیا ہو!“ انسوں نے نرم انداز میں اور پر سوچ لیج میں کہا۔

”میں اس کی طبیعت سے واتفاق ہوں۔ وہ روزانہ میرٹھ سے دہلی جانے والی ٹرین اور ہمارے گھر پہنچنے والے وقت کا اندازہ کر کے گھر سے غائب ہو جاتا ہو گا اور پھر لوٹ آتا ہو گا۔ وہ لمبی چھٹیاں لے کر آیا تھا۔“

”بہت بے لگام ہو گیا ہے یہ لڑکا! ناصر میاں عاجز آئے ہوئے تھے۔“

”وہ چھوٹا بچہ شیں رہا منے دادا! جوان ہے، اچھا برا جانتا ہے۔ اب ہربات پر تو کناہ ہی نہیں ہے۔ ناصر بچا اسے بالکل چھوٹے بچے کی طرح ٹرٹ کرتے ہیں۔ گھر پر ہونے والی سختی ہی اولاد کو گھر سے فرار کی راہ بھاتی ہے۔“

انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”سبھی دار ہو گئے ہو بہت.....“ وہ دھیرے سے مکرانے۔ ”اچھا! پھر..... یعنی ہم آج روانہ نہ ہوں!“

”جی! کل چلیں گے۔ آج دادا کی کچھ خوراکیں لے کر شاید فرحت کل تک بستر ہو جائے۔“

”اگر نہیں ہوئی تو؟“ انہوں نے تشویش سے کہا۔

”تو پھر دلی لے جائیں گے۔ ایسی حالت میں نہ اسے یہاں چھوڑا جا سکتا ہے، نہ ہم لوگ مندر رک سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلی فرصت میں وہ منہوس زنجیریں و تسلک کے دولے کر کے ان عذابوں سے خود کو اور سب کو بجا لوں گا پھر زیوں سے بعد میں نہشا جا سکتا ہے۔“

”ہاں! نہیں ہے پھر رکتے ہیں۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”میں کچھ دیر کو آرام کروں گا تم بھی لیٹ لو۔“

”نہیں میںے دادا! میں تو کافی سویا ہوں۔ بی جان اور خالہ بی کو سلا کر میں فرحت کی بیکھاں کر دوں گا۔“

شاید میرے لجھے میں کوئی بات تھی، یا شاید انہیں کچھ یاد آگیا تھا۔ وہ میری بات سن کر جاتے جائے تھنکے۔ پہلے تو دوسری سمت منہ کے کھڑے رہے پھر میری طرف پڑے تو ان سے پہرے کے تاثرات خاصے پر اسرار تھے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔

”..... فیا.....!“

”جی میںے دادا!“ مجھے لگا جیسے وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہتے ہیں جسے کرنے کی خود میں نہ پیدا نہیں کر پا رہے۔ ”کیا بات ہے؟“

”ضیاء! میں نے کہا تھا انکہ..... ہمیں کچھ فیصلے کرنا ہوں گے، جو شاید.....“  
وہ پھر چپ ہو گئے۔

”می! آپ نے کہا تھا اور میں اب تک اس الجھن میں ہوں کہ ایسے کون سے فیضا  
ہیں جو میرے خلاف ہو سکتے ہیں۔ بتائیے منے دادا..... میرے اور آپ کے درمیان  
اب ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ آپ.....“

”نہیں! میرا خیال ہے کہ..... چلو، پھر بات کریں گے۔“ وہ پھر نالے لے گے۔  
”نہیں میں نے دادا! پلیز، بتائیے۔“ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے بھایا۔ غال  
بی اور بی جان وہاں نہیں تھیں۔ منے دادا کے چہرے پر عجیب سی بے بی چھاگئی۔ یوں کا  
بھی وہ جو کچھ بھی کہنے والے ہیں، وہ خود انہیں بھی پسند نہیں ہے یا ان کے بھی غافل  
ہے۔ ”بولے منے دادا!“

”بیٹا! میں نے سنا تھا کہ تم فرحت سے شادی کرنا چاہتے ہو مگر.....  
اب.....!!“

”کیا مطلب! اب کیا ہو گیا؟ دیکھیں منے دادا! میں فرحت سے اس لئے شادی کر  
چاہتا ہوں کہ وہ جس طرح تھاں کا شکار ہے، جس طرح بے گھری کاشکار ہے، جس صدے  
سے دوچار ہو چکی ہے۔ اسے بھر حال سارا چاہئے۔ بی جان اور خالہ بھی یقیناً اس کی طرف  
سے پریشان ہیں۔ میں نے بی جان سے کہہ دیا تھا کہ آپ فرحت کے لئے پریشان نہ ہوں۔“  
”مگر ضیاء بیٹا! اب شاید ایسا نہ ہو سکے۔“ انہوں نے یہ کہہ کر یوں سر جھکا لایا جو  
یوں کہہ دینا ان کا کوئی جرم ہو۔

”کیا مطلب منے دادا! کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا آپ کی نظر میں کوئی اور ہے۔“  
میرے اندر کوئی ایسا عجیب ہے یا فرحت میں.....“

”نہیں!“ انہوں نے ہاتھ انداز کر مجھے آگے کہنے سے روک دیا۔ ”نہیں ضیاء! ان  
میں کوئی عجیب ہے، نہ میری نظر میں کوئی اور ہے۔ اور فرحت..... وہ تو بہت پیاری ہے۔  
اسے بھوپال کرتے مجھے بے حد خوشی ہو گی مگر بیٹا! تمہارا معاملہ ذرا ابھی گیا ہے۔  
”زیوسا.....“

”زیوسا!!!“ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ”زیوسا سے اس بات کا کیا تعلق ہے؟“  
”وہ..... وہ ایسا نہیں چاہتی۔“

”ابھی نہیں منے دادا! یہ بات آپ کو کبھی بھی بی جان سے نہیں کر سکھا ہے۔“ میں  
سماں کی بات کاٹ دی۔ ”زیوسا ایسی ہی طرم خان ہے جو جب چاہے کسی کی زندگی کے  
بیٹا کر کے تو اسے میرے سامنے آکر رہانا ہو گا کہ وہ ایسا کیوں چاہتی ہے۔ اسے یہ حق

میں پھیلی دھوپ کو دیکھ کر بولی۔

میں اس پر نگاہیں جائے ہوئے تھا اور دیکھ کچا تھا کہ وہ بالکل صحت مند ہے۔ رات جو حالت تھی، اس کی رقم بھی نہیں تھی اس کے چہرے پر بلکہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خوب مزਬے کی نیند لے کر ابھی ابھی سو کرنا تھی ہے، ترو تازہ اور قطعی ٹھیک ہے۔ مجھے بیکن ہو گیا کہ فرحت کو غفلت میں لے جانے والی زیوں سماں تھی۔ شاید وہ میری دھمکی سے ڈر گئی تھی۔ میں نے منے دادا کی طرف دیکھا۔ وہ بھی جیرت سے فرحت کو فرحت کو دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے بھی میری آنکھوں میں دیکھ کر جیسے میرے خیال کی تقدیق کی۔ غالباً یہی خیال انہیں بھی آیا تھا۔ بی جان خود حیران تھیں۔

”اے! چلو یتو۔“ انہوں نے اسے بازو سے تھام لیا۔

”بی جان! کیا کر رہی ہیں۔ آپ لوگوں نے ناشتا بھی نہیں کیا ہو گا، مجھے اٹھایا کیوں نہیں آپ نے؟“

”ایں..... بی بی! تم ٹھیک تو ہو نا! ساری رات بخار میں پی ہو۔ حکیم اہن آکر دوادے گئے ہیں۔ ساری رات تمہارے ماتھے پر پیاس رکھی ہیں، ہم نے، ہم سب رات بھر جائے رہے ہیں اور تمہیں ناشتے کی پڑی ہے۔“

بی جان اسے زبردستی پلٹک تک لے گئیں۔ وہ جیرت سے بی جان کی باتیں سن رہی تھی۔ میں اور منے دادا بھی کمرے میں پہنچ گئے۔ میں اس کے چہرے پر نگاہیں گاڑے اس کی کیفیات کا اندازہ لگا رہا تھا۔ کئی بار اس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ٹکرائیں مگر ان میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو مجھے شرمende کرتی۔ نہ ہی ایسی کوئی بات لگ رہی تھی کہ اس نے کسی کو دیکھا تھا۔ یعنی وہ غشی میں جو کچھ کہہ رہی تھی، اس سے بھی تاواقف لگ رہی تھی۔ اسے بی جان کی باتیں سن کر جیرت ہو رہی تھی۔

”بی جان!“ میں جلدی سے آگے بڑھا۔ ”اب تو یہ ٹھیک ہے نا!“ میں فرحت کی عرف پلٹنا۔

”لاو، بغض دکھاؤ۔“ وہ جھگکی مگر میں نے کلامی تھام لی۔ ”ٹھیک ہے بالکل۔“ میں نے پٹکر بی جان سے کہا۔ اب خالہ بی بھی اپنے کمرے سے آچکی تھی۔

”ہاں بی جان! میں ٹھیک ہوں۔“

”ہاں، ہاں! جاؤ تم پر اٹھے بناؤ۔ بہت بھوک گلی ہے۔“ میں نے فرحت سے کہا۔

حاصل نہیں ہے کہ وہ میری یا فرحت کی زندگی سے کھیلے۔ اب تو مجھے یہ لگ رہا ہے کہ فرحت کی یہ حالت کرنے والی بھی زیوں ہے۔ اگر ایسا ہوا منے دادا تو میں اسے مazar نہیں کروں گا۔ اگر فرحت کو اس نے اذیت دی ہے تو پھر اسے اپنی تباہی کے لئے تیار رہ ہو گا۔ آپ سے ملے تو بتا دیجئے گا اسے کہ وہ چاہے کتنے ہی جال پھیکے، اپنی تمام سنایکی سمیت مجھ پر حملہ آور ہو، میں ہمارے والا نہیں۔ اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دوس گام گرانے بھی نہیں وہابد کر دوں گا۔“ میں غصے میں پاگل ہو کر چیختنے لگا تھا۔ ہوش تب آیا جب دادا نے آگے بڑھ کر میرے منہ پر اپنا چوڑا چکلا ہاتھ جمادی۔

”ضیاء! ہوش میں آؤ۔ فرحت ٹھیک نہیں ہے، بی جان سن لیں گی۔ ضیاء.....“ میں ہوش میں آگیا مگر شاید دیر ہو پچھی تھی۔ بی جان ہولائی ہوئی کمرے سے نا آئیں۔ ”کیا ہوا ضیاء! کیا بات ہو گئی؟“ ”کچھ نہیں بی جان! میں شرمende ہوں۔ میں منے دادا سے بات کر رہا تھا۔ بس اب ہی غصہ آگیا تھا۔“

”منے میاں پر غصہ آگیا تھا؟ ہوش میں تو ہو ضیاء!“ بی جان نے جیرت سے کمار ان کی تیوریوں پر مل پڑ گئے تھے۔

”عن..... نہیں بی جان! ایسا کیسے ہو سلتا ہے۔ وہ..... وہ اصل میں جس، ذکر آیا تھا، اس پر غصہ آگیا تھا۔“

”مگر میاں! ادب لحاظ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔“ ”سوری بی جان! معاف کر دیں۔“ میں واقعی سخت شرمende تھا۔ ”بی جان! دراصل بات ایسی ہو گئی تھی کہ ضیاء خود پر قابو نہیں رکھ سکا ورنہ میں اسے چھوڑتا!“ میں دادا نے انہیں بگڑا دیکھ کر میری طرف داری کی۔

”کیا ہوا بی جان!“ یہ آواز سن کر ہم تینوں ہی چونک اٹھے۔ میں نے نگاہ اٹھائی، کمرے کے دروازے فرحت کھڑی تھی۔

”ارے! تم کیوں اٹھ گئیں؟ کچھ نہیں ہوا چندا.....! چلو، جلدی سے لیٹو۔“ جان اسے کھڑا دیکھ کر سب کچھ بھول گئیں۔ اس کی طرف لپکیں۔ ”کیوں؟“ فرحت نے جیرت سے انہیں دیکھا۔ ”اب تو دن نکل آیا ہے۔“ وہ آٹھ

چندار چہرے پر تاریکی چھائی مگر بھی بات یہ ہے کہ میں اب اس معاملے کو درست کر کے آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی دانست میں وہ بے خبر سو گئی تھی اس لئے مجھ سے بات کرنے یا اوپر نہ آنے کا جواز پیش کرنے کو بے چین تھی مگر میں نے ایسا کوئی موقع دیا ہی نہیں۔

شام ہی کو ہم وہاں سے روانہ ہو گئے۔ سارے راستے ہم زیوسا، و تسلما اور جینو کی بائیں کرتے رہے۔ بیونو کے بارے میں تفصیل سن کر منے دادا بھی افرادہ ہو گئے تھے مگر شالی بیبا کہم نکھلے تھے کہ میں اس کی مدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں البتہ اگر زیوسا ہاں ہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

گویا بات زیوسا سے سودے بازی کی تھی۔ یا تو میں اس سے کنارا کر لتا یا ان سب کے لئے مدد مانگ لیتا۔ میں نے سوچا تو مجھے اندازہ ہوا کہ بقول شالی بیبا کے کیوں کہ وہ میری بنت میں گرفتار ہو پچھلی ہے۔ اس لئے شاید میری مدد کو تیار ہو جائے اور پھر میں رابرٹ، بیونو، پاس ٹریگو اور سورن سنگھ کے لئے کچھ کرسکوں۔ ادرا وہ تنیبیہ کر چکی تھی کہ میں کسی عورت کے قریب نہ جاؤ۔ فرحت کو مجھ سے دور کر کے بھی اس نے جو کھل کھیلا تھا وہ بھی اس پر دلالت کرتا تھا کہ میں ایک حد کے بعد بے بس ہوں۔ وہ جب چاہے، مجھے ماضی کر سکتی ہے، مجھے اپنی اسی بے بی پر طیش تھا۔ میں فرحت سے دستبردار ہونے کو بھی تیار نہیں تھا مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ میرے سامنے کیوں نہیں آ رہی! اسے ایسا کون سا ذر ہے کہ وہ میرے سامنے آ کر مجھ سے بات نہیں کر رہی تھی حالانکہ وہ میرے سامنے آ چکی تھی۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ زیوسا ہے۔ کیوں.....؟ اتنی قربت پا لینے کے بعد بھی یہ گریز کیوں تھا؟

ویسے ایک بات بتاؤ؟ میرا اس سے پسلا ربط، پہلی قربت ایسی میٹھی، ایسی سرور انگیز اور اتنی گری تھی کہ میں اس کے خیال پر اپنے اندر وہ کیفیت نہیں پا رہا تھا جو اب سے پہلے ہوتی تھی۔ بہر حال، یہ ایک سرورت راز تھا کہ وہ میرے سامنے ٹھوک کر کیوں میں آتی کہ میں زیوسا ہوں، اور یہ چاہتی ہوں۔

سفر اس بار بلا خوف و خطر گزرا۔ ہم صبح سوریے، منہ اندر ہیرے گھر پہنچ گئے۔ وہاں جا کر سب سے پہلی بات تو یہ پتا چلی کہ طیب میرے کمرے میں پاؤں پارے سو رہا ہے۔

”اے لڑکے! باولا ہوا ہے کیا؟“ خالہ بی چڑی گئیں۔ ”لو! بچی ساری رات ترپی ہے اور اسے خاطرداریاں سوچ رہی ہیں۔ چل فرجی بینا لیٹ جا کے۔“

”نہیں خالہ بی، پتا نہیں آپ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔ ساری رات سکون سے سوئی ہوں اور بھوک تو مجھے بھی لگ رہی ہے۔“ فرحت دوپٹا ٹھیک سے اوڑھتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

منے دادا جیرت سے کبھی مجھے اور کبھی فرحت کو دیکھ رہے تھے۔ بی جان جلدی سے فرحت کی مدد کو چلی گئیں۔ وہ دونوں یہی سمجھ رہی تھیں کہ فرحت ہم لوگوں کے خیال سے اپنی کمزوری کو چھپا کر ہماری خاطر کرنا چاہتی ہے۔ خالہ بی تو کافی دیر بڑھ رہی رہیں۔ میں پھر منے دادا کے پاس جا بیٹھا۔

”ضیاء! تمہیں بھی کچھ محسوس ہو رہا ہے؟“  
”جی منے دادا.....! شاید زیوسا میری دھمکی سے ڈر گئی۔ میں نے کہا تھا انکہ اگر فرحت کو کچھ ہوا تو میں اسے تباہ کر دوں گا۔“

”ہوں.....! ضیاء.....! جذبات میں بننے کی بجائے ہوش و حواس سے کام نہیں کر سکتے کا حل نکالنا۔“  
”لیکن بی جان سے ابھی آپ اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کریں گے اور اماں سے بھلی نہیں۔“

”ٹھیک ہے مگر تمہاری اماں سے تو بات ہو گئی تھی۔ ویسے انہوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ شاید مجھے وہ غیر سنجیدہ سمجھ رہی ہیں۔“  
”نہیں منے دادا! ان کی عادت ہی ایسی ہے“ میں نے بات ٹال دی کیونکہ بی جان ہمارے قریب آ رہی تھیں۔

فرحت بالکل صحت مند تھی۔ سہ پہر کو حکیم ابن خود بھی آگئے اور خاصے پھولنے کے ان کی دو ہی خوراکوں نے پچھی کو صحت مند کر دیا۔ بی جان اور خالہ بی ان کی خاطریں کرتی رہیں۔ ان کا اعتقاد پختہ ہو رہا تھا۔ میں ابھیں میں تھا مگر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ فرحت کو ٹھیک ٹھاک دیکھ کر منے دادا کی یہاں کی فکر ختم ہوئی تو گھر کی فکر نے انہیں گھیر لیا۔ انہوں نے شام کی ٹرین سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ فیصلہ من کر فرحت کے

گلہ بیل ۱۹۵

فاطر جان بھی دے سکتا ہوں مگر.....” وہ منے دادا کے گھٹنے پکڑے کہہ رہا تھا۔  
”مگر کیا؟“ اس کے چپ ہوتے ہی عصمت آپا بول انھیں۔

”مگر رسک تو نہیں لے سکتا ہاں!“ وہ مسکین شکل بنا کر بولا۔

”بیکاری خانے میں کوئی رُسک نہیں تھا“ عصمت آبائی ازگو

بی جائے میں ووی رسل میں ہا سمت پاپی اڑا  
زافر نام، سوت شنگ کلائیو گاجر، کا وہ مولہ دکاریا تھما

کہ اس نے اسیں بہت سُنک لیا ہوا کا س کا وہ بدله چکا رہی ہے۔  
”تھا! اتنا لامساخہ اکلا کسے کرتا؟“

”اب کسے کرو گے؟“ وہ امک قدم اور بڑھ آئیں۔

"نہایت کمالِ حفاظت و دادا" ۱۷۵۰ء میں بنائی گئی تھی۔

گنجائش، نہیں اسے کہا؟" اس نے منے وادا کے گھنٹے سے سرٹیک پا۔

”فَفِي حِنْدَنَ كَمْ كُنْجَانِيَّةٍ تَهْزَأُ مُهَاجِرٌ فِي نَسْمَةٍ سَاهِرٌ“ اَتَهْلَكَتْ اَنْسَانَی

عصر = آنچه همایکه نویسند

عصرت آپا ہنے پھلا ربویں۔

"اچھا بس لڑکی.....! قابو میں رہ....." منی دادی بکڑ لینے کے لئے

میں آنا چاہتا اور نہ غلط ہو جاتا۔ اماں بھی آچکی تھیں۔ انہوں نے عصمت

بادو جاتے عالم میلٹ کر کوئی نہ

دیا۔ وہ جائے جائے پت تربویں۔

اس بار طیب نے منہ کھولا مگر میں نے اپنی بھسلی اس کے منہ

منی دادی نے منے دادا کو ڈاٹ دیا تھا کہ اسے پکھ نہ کیں۔ بے چار ارٹ گیارہ بجے کی  
ثیرین کے بعد تو گھر میں گھا سا ہے۔ یہ سن کرنے نے دادا نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ میں اور من  
دادا صحن میں ہی سو گئے۔ صبح میری آنکھ اس وقت کھلی جب میں نے اپنے قریب ہی کم  
کھکھیانے کی آواز سنی۔ آنکھیں کھولتے ہی سامنے جو منظر تھا وہ دیکھ کر میں نہیں پڑا۔  
طیب ایک ہاتھ میں اپنی کیس اور دوسرے میں جوتے پکڑے غالباً گھر کے بیرونی دروازے  
کا پہنچنا شروع کیا۔

تل پچ پکا جا لے مسے دادا نے اسے لدی سے پڑلیا۔ اب وہ حکیما رہا تھا۔  
”منے دادا!“ میں پھسل کر گر پڑا تھا۔ پاؤں میں موج آگئی تھی اس لئے اس دن نیں  
تھا۔ کافے ام، مجھ کے لایا۔“

منے دادا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اس لئے کہ طیب انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ طیب کی آواز نے منی دادی اور اماں کو بھی جگا دیا۔ عصمت آپا دونوں ہاتھ کر کر پر رکھ سپاٹ چہرے لئے کھڑی تھیں۔

”ہوں.....! وہ تو اگر عصمت مجھے نہ اٹھا دیتی تو یہ نکل لیتا۔“ منے دارا نے رعیت دار آواز بناتے ہوئے کہا۔

”اوہ عصمت آپا! آپ..... آپ میری دشمن ہوں گی، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ طبیب نے روپی صورت پناکر کہا۔

”یہ سوچتا وچتا تمہارے بس کام نہیں ہے۔ وہ کیا کرو جو کیا جاسکے؟“۔ انہوں نے مخصوص مام ساتھ انداز میں، حجاب دما۔

”ارے بھی! سٹھیا گئے ہیں آپ!“ منی وادی نے جھوٹ کر طیب کو چھڑایا۔ ”میں نے، کا تھا۔ سے مجھے سے اتے کرے۔“

”اب تم سے کیا بات کروں؟“ نے دادا آرام سے پنگ پر بیٹھ گئے۔ طیب بچوں کی طرح منہجی، کرکٹنگ ہے۔ ملکا گھنٹا

”دُر گئے، دُر گئے“ طیب بے ساختہ بول اخْتا۔  
”آئیں جو کسی“ عصمت آئیں جو کسی

بُوئے پیپے رہ دو۔ سست اپاے اسے ہورا۔ وہ تریباً ترجوے پے ہے۔  
دعا مزہ آیا۔ طیب کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا تھا درست ثابت ہوا۔ منے دادا کا مولا

"دادو! میں آپ سے بہت پار کرتا ہوں۔ آپ کا ہر حکم بجا لاسکتا ہوں۔ آپ کی یہ رطیب جلدی سے ان لے فیرب زمین پر ھٹنوں لے مل بیٹھ لیا اور بولا۔

”کیسے مسائل؟“

اور پھر میں نے بلا کم و کاست اسے سب کچھ بتا دیا۔ بس چھت والے واقعے میں،  
میں فرحت کے انتظار والی بات کھا گیا اور اسے یوں بیان کیا جیسے میں چھت پر سونے گیا تھا  
جہاں مجھ پر مدھوشی طاری ہو گئی اور پھر وہ لڑکی آئی۔ میں قطعی ہوش میں نہیں رہا کہ  
سوچوں یہ کون ہے، اور وہ مجھے طوفانوں میں لے گئی۔  
”اشاء اللہ بلغ ہو کر آئے ہو۔“ وہ چکا۔

”میں وہاں بہت پریشان رہا طیب!“ میں نے لیٹھنے ہوئے کہا۔

”پھر بمشروع اے معاملے کا کیا ہوا؟“ طیب اب سمجھیدہ ہو گیا تھا۔  
”شالی بیبا کی ہدایت پر عمل تو کر آئے ہیں۔ دیکھو کیا ہوتا ہے، میرا خیال ہے کہ منے  
دادا ہفتہ دس دن میں دوبارہ وہاں جائیں گے۔“

”تم بمبی کب چل رہے ہو؟“

”کیوں، مجھے ذکری سے نکلانا ہے کیا؟“

”یار، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں نوکری کی ضرورت ہی کیا ہے اور وہ بھی  
آثار قدیمہ جیسے بور مچکے میں۔“

”میں بڑی اچھی جگہ نوکری کر رہا ہوں طیب، یہ میری نااہلی تھی کہ میں نے وہاں  
موجود اسرار سے واقعیت حاصل نہیں کی۔ اب میں نھیں سے نوکری کروں گے۔ زیوساکے  
بارے میں مکمل معلومات حاصل کروں گا تاکہ پتا تو چلتے کہ یہ یوں سے اتنی دور، یہاں  
آخر کیا کر رہی ہے؟“

”اپنا جوڑا ملاش کر رہی ہے۔ وہ یوں انفلسفہ نہیں نام تم نے کہ مرد، عورت جسمانی  
طور پر شروع میں ایک دوسرے سے ہڑے ہوئے تھے۔ دیوی دیوتاؤں سے نافرمانی پر  
انیں سزا کے طور پر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا اور کما گیا بلکہ بد دعا دی گئی کہ جاؤ،  
اب تم لوگ ساری زندگی اپنا وہ حصہ تماش کرتے رہو گے جو علیحدہ کیا گیا ہے اور بھلکے  
رہو گے۔ وہ جنہیں ان ہی کا حصہ مل جاتا ہے، ان کی زندگی مثل ہوتی ہے۔ گویا وہ دیوتا  
کے کرم حاصل کر لیتے ہیں اور وہ جو معاف نہیں کئے گئے، ساری زندگی بے جوڑ شایان کر  
کنڈو بھی برباد ہوتے ہیں اور سامنے والے کو بھی برباد کرتے ہیں۔“ طیب نے دلچسپ  
کمال کے طور پر بتایا۔

ابھی دن کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ اماں اور منی دادی وہیں بیٹھ کر بی  
جان وغیرہ کی خیریت پوچھنے لگیں۔ تبھی میں نے محسوس کیا کہ طیب پلنگ پر لکے میرے  
ہاتھ کو انگلی سے مس کر رہا ہے۔ میں نے چونک کرا سے دیکھا۔ اس نے مجھے آنے کا اشارہ  
کیا اور اٹھ گیا۔ میں اس کے پیچھے کرے میں چلا آیا۔

”میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟“ اس نے قریب آتے ہی پوچھا۔

”کیا پیغام؟ میں کبوتر نہیں ہوں۔“ میں سمجھا گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

”مناق مت کرو یار!“ وہ میرے کانڈھے پر ہاتھ مار کر بولا۔

”یعنی! میں کبوتر ہوں کیا؟“

”بتابا! تم نے وعدہ کیا تھا۔“

”میں وعدہ نہیں نہجا سکا۔ ویسے میں نے تم سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔“ میں پلنگ پر  
جا بیٹھا طیب کی بات سے میرا مودہ آف ہو چکا تھا۔

”یار ضیاء! تم بہت بے مرد ہو۔ میں نے تو اپنی جان کی بھی پردا نہیں کی تمہاری  
خاطر..... موت کے کنویں میں چھلانگ دی تھی گر تم.....!!“

میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ وہ نھیک کرہ رہا تھا۔ اس نے واقعی میری خاطر جان  
کی بازی لگادی تھی اور میں نے..... میں نے اس کی جھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں  
کی۔ میں سلام مجت نہ سسی، اسے سلام تو پہنچا ہی سکتا تھا پھر طیب کو یہ بتا۔ نہ کی پوزیشن  
میں ہوتا کہ ہاں میں نے تمہارا پیغام پہنچا دیا ہے۔ فرحت پر مجھے یقین تھا کہ اس کی نگاہوں  
میں، میں نے اپنے لئے ہی پسندیدگی دیکھی تھی اور اب تو میں باقاعدہ اس سے انہمار مجت  
بھی کر چکا تھا۔ جس کار سپانس بھی مجھے مل چکا تھا۔

”سوری یار! کچھ ایسے مسائل میں گھر گیا تھا۔ جاتے ہی کہ یاد نہیں رہا۔“

غماس سے پہلے کہ کچھ کہتا، وہ گرجدار آواز میں بولے۔  
”اس نے مذہب بھی تبدیل کر لیا ہے کیا؟“

اس آواز نے بم کا سا کام کیا۔ طیب اچھل کر ایک ہی جست میں کھڑا ہو گیا۔  
”وہ..... نہیں دادا.....! میں تو ایک فلم کی اسحوری سن رہا تھا۔ اس کی ہیر وئن اسی  
لمح بیٹھ کر اپنے پریتم سے.....“

”خاموش ناچیار.....! فلمیں بھی دیکھتا ہے اور پھر انہیں عملی طور پر مسخروں کی  
ی حرکتیں کر کے ناتا بھی ہے۔“

میں چکے سے کرے ہے باہر نکل آیا۔ مجھے لقین تھا کہ ابھی کچھ دیر بعد طیب ہاتھ  
میں اپنی لئے لئے، لئے کھا کئے باہر نکلے گا اور ناک سڑکتا ہوا باہر چلا جائے گا یا اسے منے دادا کان  
سے پکڑے باہر لا ایں گے اور خود بیرونی دروازے تک چھوڑ کر آئیں گے۔ بلکہ ہو سکتا ہے  
کہ وہ خود بمبی جانے والی ٹرین میں بھی بھاکر آئیں۔

مگر بہت دیر تک کوئی باہر نہیں آیا۔ میں جو منتظر تھا، پہلے جیران ہوا، پھر میرے  
جتنی نے بے چینی کاروپ دھار لیا۔ اندر کمرے کی طرف ناتا محسوس ہو رہا تھا۔ باہر بھی  
کوئی نہیں تھا۔ پتا نہیں منی دادی، دادی اور اماں وغیرہ کماں تھیں۔ دن کا وقت تھا۔ آنکن  
میں دھوپ پھیل ہوئی تھی۔ میں نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا پھر انھ کر اماں کے  
کمرے کی طرف پہل دیا کہ شاید اماں، دادی اور عصمت آپا وغیرہ وہاں ہوں۔ میں نے  
جنونی دروازہ کھولا، میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

وہاں گھر کا کوئی فرد نہیں تھا یعنی..... وہ کراہی نہیں تھا بلکہ لقین بیٹھے۔ وہ گھر  
نیں تھا۔ میں نے باہر سے جو قدم کمرے کے اندر رکھا تھا، وہ کراہیں کا تھا۔ میرے  
گھر کا وہ وتسلا کا کمرا تھا۔ وہاں وہی نہم تاریکی تھی۔ جالی دار پر دے سے چھن کر آتی  
ہوئی باہر کی بلکچی روشنی اور اس روشنی میں وتسلا اپنے چوڑے پیدا اپنے بھدنے جسم پر  
”سماچڑے لئے، آنکھیں بند کئے بیٹھی تھی۔ اس کے بھدنے ہونٹ برابر مل رہے تھے۔ وہ  
نمیں آمد سے قطعی بے خبر تھی۔ وہ باخبر ہوتی بھی کیے، میں کب اس کے پاس گیا تھا۔ میں  
ہمکا کہا تھا، اس سے پہلے کہ میرے منہ سے تحریر خریا بیت تاک قسم کی کوئی آواز نہیں، میں  
نے اپنے جسم کو پیچھے کی طرف جھکا دیا۔ یہ باہر نکلنے کی غیر شوری کوشش تھی۔ میں باہر  
نکل گیا اور یہ دیکھ کر سخت جیران ہوا کہ میں وتسلا کے گھر کے باہری تھا۔ وہی پتلی سی گلی،

”بڑی معلومات ہیں تمیں..... میں بھنا۔  
”حالانکہ میں نہ یوں ناگیا ہوں، نہ کوئی دیوی مجھ پر عاشق ہوئی ہے اور نہ ہی آنکھ  
قدیمہ کے دفتر میں ملازم ہوں۔“ اس نے رعب ڈالا۔

”میرا خیال ہے، تمیں پڑھنے پڑھانے سے بھی دلچسپی نہیں ہے پھر کیسے علم ہوا؟“  
میں مطمئن تھا کہ اب اس کی ذہنی روکارخ تبدیل ہو چکا تھا۔

”یہ فلسفہ میں نے کسی سے سنا تھا اور گرہ میں باندھ لیا تھا۔ سب سے پہلے میں نے  
اسے مونیکا پر اپلائی کیا۔ اسے بتایا کہ یونانی فلسفے کے مطابق میں اپنے حصے کی تلاش میں ہوں  
اور مجھے کچھ کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ میں کامیاب ہونے والا ہوں، کیونکہ میرا گشیدہ حصہ تم  
ہو۔“ میں زور سے نہ پڑا۔ ”کیا کہا اس نے؟“

”کہنے لگی، مگر میرا گشیدہ حصہ گھر پر آرام کر رہا ہے۔“ اس نے منہ بنا کر جواب دیا  
مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر پڑھو ش ہو کر قریب سرک آیا اور بولا۔ ”جب یہی بات میں نے  
جیہے سے کی تھی، تو وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اس بارے میں  
ضرور سوچے گی اور پھر ایک نہ ایک روز اس پر بھی یہ اکشاف ضرور ہو گا کہ میں ٹھیک  
کہہ رہا ہوں۔ اس کا گشیدہ حصہ میں ہی ہوں۔ وہ آئے گی، گھنٹوں کے بل بیٹھ جائے گی  
اور کہے گی، طیب دیوتا مجھ پر مہریاں ہو چکے ہیں۔ میں تمام زندگی تمہارے چونوں میں  
گزارنے کو آگئی ہوں۔ جیون بھر تمہاری سیوا کروں گی اور تمہارے نام کا سیندھ و رانگ اس کی پوزیشن میں  
میں بھر کر عمد محبت نجھاؤں گی۔ تم ہی میرے پریتم ہو۔ تم ہی ہو میرے.....“ وہ

آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑے میرے سامنے گھنٹوں کے بل بیٹھا تھا۔  
”وہ ہندی میں کہے گی یہ سب کچھ؟“ میں نے نہ کر پوچھا گرہ اس کی پوزیشن میں  
کوئی فرق نہیں آیا، وہ کہہ رہا تھا۔

”میں مندر میں جا کر ان گھنٹوں کو اس وقت تک بجاتی رہوں گی میرے پریمی!  
جب تک بھگوان مجھے تمہارے قدموں میں نہیں لاذائے گا۔ میں بھگوان کے سامنے آئے  
باکر، اس کی منیں کر کے تمیں حاصل کروں گی۔“ وہ اسی انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”میرے  
پریمی! میرے میت! میرے پتی.....!“

”میں اسی لمحے منے دادا کمرے میں داخل ہوئے۔ پتا نہیں، انہوں نے طیب کے کئے  
جنہلے نہ یا نہیں، اسے اس پوزیشن میں دیکھ کر وہ البتہ بھوپلے رہ گئے۔ میں گڑبردا کر رہا گیا

سر کالیا۔ ”ٹھیک ہے، ذونٹ وری بوائے.....! دو دن کے بعد وہ ہوا کے ماقن تانگا چلائے

گئے۔ وہ آج بڑے موڑ میں تھی، خوش تھی۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ اسے بتا دوں کہ میں مسافت طے کئے بغیر یک لفڑت یہاں پہنچا ہوں۔ جھانکا اماں کے کمرے میں تھا اور پہنچا یہاں گئر میں یہ سوچ کر چپ، ہو گیا کہ ممکن ہے، وہ خوفزدہ ہو جائے۔ اس نے اپنا انگیبہ درست کیا، کود کو اوپر کی طرف ذرا سار کیا اور بولی۔

”ام انتظار کر رہا تھا۔ تم کہ ہر میں چلا گیا تھا؟“

”کیا تم زنجیروں والے سودے پر اب بھی تیار ہو؟“ میں نے پھر اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

وہ خوش ہو گئی۔ ”ہاں! کیا تم وہ لے کر آیا ہو؟“

”نہیں.....!“ میں نے کہا۔ ”اگر یہاں آنے کے لئے گھر سے نکلا ہوتا تو یقیناً ساتھ لے کر آتا۔“

”کیا مطلب.....؟“

”مطلب یہ کہ تم نے کبھی اچانک کسی کو کسی جگہ سے غائب ہوتے اور پھر کسی اور یعنی کسی دوسری جگہ نمودار ہوتے دیکھا ہے؟“

”ہاں، دیکھا ہے۔ کمی بار، روحوں کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ ایک جگہ دکھائی دیں یا غائب ہو کر کمیں اور دکھائی دینے لگیں۔“

”میں روحوں کی نہیں، انسانوں کی بات کر رہا ہوں۔“

”ہوں!!!“

وہ پسلے چوکی پھر کچھ سوچنے لگی۔ میں خاموش رہا، یہی سمجھا کہ وہ اپنے علم سے انہاں کیا جانا چاہ رہی ہے مگر جب وہ بولی تو میں کو فت میں جتنا ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہاں! ایسا بھی ایک بار ہوا تھا۔ اس وقت ہم چھوٹا سا تھا۔ اوہ راسکوں کا فٹش تھا۔ وہاں ایک شعبدے باز آیا تھا۔ اس نے لوہے کے بڑے بڑے گولے کھائے تھے۔ منہ سے بہت سے رنگیں کاغذ نکالے تھے اور پھر اچانک کھڑے کھڑے غائب ہو گیا تھا۔ سب پہنچ شور چانے لگے۔ کچھ حریت سے اور کچھ خوف سے امادا پیچر ز لوگ بھی ڈر گئی تھیں۔

وہی سڑک پر لگائیس پوسٹ، وہی سر اٹھائے کھڑی چچ کی بوسیدہ عمارت جو اتنی بوسیدگی کے باوجود درپر قوار اور پر ٹکوٹھی تھی۔

میں چکرا کر رہا گیا۔ میں اپنے گھر میں تھا۔ اپنے کمرے سے ابھی ابھی نکلا تھا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوا تھا پھر.....؟ یہ کیا طسم تھا کہ میرا گھر و تسلما کے گھر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ دن کا وقت تھا، سورج ابھی سر پر نہیں آیا تھا مگر اس کی پیش ارد گرد کے ماحول کو تپائے ہوئے تھی۔ اب دو ہی راستے تھے۔ میں و تسلما کے کمرے میں داخل ہو جاؤں اور اس کی اس طسمی مصروفیت اور کیفیت کے ختم ہونے کا انتظار کروں یا گلی کا موز کاٹ کر گھر جاؤں مگر میرا دل چاہا کہ میں رکوں۔ اب کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی گیا ہوں ظاہر ہے اس اسرار کا بھید پانے کی خواہش نے میرے قدم روک لئے تھے تو سب کو معلوم کر کے جاؤں۔ میں ایک بار پھر و تسلما کے گھر میں داخل ہو گیا۔ وہ اب بھی آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہی تھی۔ اچانک اس نے اپنا بیالا ہاتھ بڑھا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا یہ جیسے وہ بند آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی ہو۔ مجھے دوبارہ باہر چلے جانے سے روک رہی ہو۔ میں نے وہیں رکھے ایک لکڑی کے اسٹول پر خود کو نکال دیا اور و تسلما کا گھری نگاہوں سے جائزہ لینے لگا۔

کمرے میں گراستا تھا۔ ہر چیز ساکت تھی صرف و تسلما کا پھولا ہوا پیٹ، سانس کے زیر و بم سے ہل رہا تھا یا اس کے موٹے اور بھدے ہونٹ جو زندگی کی موجودگی کا بھرپور احساس بننے ہوئے تھے۔ پیش نہیں تھا۔ میں اس کی خیریت کے لئے بھی بے چین تھا۔ آخری بار میں نے اسے بت بری حالت میں دیکھا تھا۔ میرے اندر بھی گراستا تھا جگایا۔ میں اس وقت نہ کچھ سوچ رہا تھا، نہ ہی کچھ سوچنے کی خواہش تھی۔ بس دیکھ رہا تھا اچانک و تسلما نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے سامنے پا کروہ بے ساختہ مسکرا دی یوں جیسے اس کی کوئی تمنا پوری ہو گئی ہو یا وہ مجھے ہی حاضر کرنے کا مستر پڑھ رہی ہو۔

”تم آگیا میں!“ وہ اوپنچے تکنے سے تکتے ہوئے بولی۔

”ہاں.....! کیا تم یہی عمل کر رہی تھیں؟“

”میں! ام پیش کا واسطے عمل کرتا تھا۔ تم یہاں آجائو۔“ اس نے بیٹھ کے اس طرف اشارہ کیا جائیں جگہ تھی۔ ”پیش کیا ہے؟“ میں نے اس کی بدایت کو نظر انداز کر کے اسٹول ذرا تربی

پھر وہ شعبدے باز اشیع پر نہیں بلکہ ہم سب کے بیچے دکھائی ریا تھا۔ اس کے ان شعبدوں کو لوگوں نے پنڈ کیا تھا۔

”وتسلا! میں کسی شعبدے باز کی بات نہیں کر رہا۔ کیونکہ میں شعبدے باز نہیں ہوں۔“ میں نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ”تم سمجھدے نہیں ہو، کہیں تم اپنے وعدے سے پھر نہیں کی صورت میں فضول باتوں سے مجھے بہلاتو نہیں رہیں؟“

اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ اب وہ سمجھدے دکھائی دے رہی تھی۔ ”کیا بات ہے مسٹر ضیا! کیا کوئی سیریس قسم کا بات ہے؟“

”ہاں، اگر تم سننا پنڈ کرو تو!“ میں نے زہر لیے لجھ میں جواب دیا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو گئی۔ میں نے تمام معاملہ اسے کہہ سنایا۔ شالی بیبا کی بات کا حوالہ بھی دیا۔ وہ خوش ہو گئی۔

”مین! وہ بیبا ٹھیک بولتا ہے۔ ایک دم کریکٹ۔“

”ہاں! اب مجھے یقین ہو چکا ہے کہ شالی بیبا درست کرتے ہیں۔ مجھے یقیناً وہی کہا چاہئے جو وہ کہے چکے ہیں مگر..... میں وہ زنجیر تمہیں دے کر بھی زیوسا سے چھکارا نہیں پاسکتا۔ شالی بیبا بھی اس کے آگے خود کو بے بن سمجھ رہے ہیں۔ اور تم خود اس بات کا اقرار کر چکی ہو کہ ان زنجیروں کو تمہیں دینے کے بعد صرف ایلين کی شیطانیوں سے مجھے پناہ نہیں دے سکے گی اور یہ پناہ تم مجھے دو گی۔ زیوسا اسی طرح مجھے پر حادی رہے گی۔ وہ زیوسا نے میں قطعی نہیں جانتا۔ وہ زیوسا جس نے بیکپن سے مجھے اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ وہ زیوسا جو بقول اس کے، میرے عشق میں بتلا ہو چکی ہے۔ بقول شالی بیبا کے، اس نے ہزار بار میری مدد کی ہے۔ مجھے خطرات سے نکالا ہے اور وہ زیوسا جس نے میرنگھ میں مجھے دھوکا دے کر مجھ سے گھناؤتا کھیل کھیلا گر آج تک وہی زیوسا میرے سامنے نہیں آئی، کیوں؟ جب میں زیوسا کے اسرار میں گھرا ہی رہوں گا تو ایلين کی شیطانیوں سے پناہ حاصل کر کے کیا کروں گا؟ اگر ایلين زیوسا کو قابو کرنا چاہتی ہے تو میں زنجیروں کو ایلين کی قبر تک پہنچا کر دونوں ہی سے نجات کیوں نا حاصل کروں؟ جب بقول شالی بیبا کے، جیزو، پیسا، سورن سنگھ اور دیرٹ کو اپنے کیے کی سزا بھکتی ہی ہے۔ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ میں اپنے باپ، مبشر اور ان لوگوں کو بھی بیویش کے لئے کھو چکا ہوں جو زیوسا کی وجہ سے ایلين کے یا ایلين کی وجہ سے زیوسا کے شکار ہو چکے ہیں اور پھر.....“

میں چند لمحے کو سانس لینے کو رکا۔ وتسلا بھی بھتی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کا رنگ سفید پڑ چکا تھا۔ میں سخت غصے میں تھا۔ لو میری کن پیسوں پر جیسے ٹھوکریں مار رہا تھا۔ وتسلا نے غالباً کچھ کرنے کے ارادے سے ٹھوک نگل کر منہ کھولا ہی تھا کہ میں پھر بیل اٹھا۔

”میری بات پوری نہیں ہوئی وتسلا! مجھے یہ اطلاع بھی مل چکی ہے کہ اب میری زندگی کے تمام اہم فیصلے زیوسا کرے گی۔ مجھے کسی عورت سے قریب نہیں ہوتا ہے۔ مجھے کسی سے شادی نہیں کرنی ہے۔ مجھے کسی سے عشق نہیں کرنا اور جانے کیا۔ کیا..... کیوں؟ وہ کون ہوتی ہے میرے بارے میں فیصلے کرنے والی۔ وہ خود کیا ہے، مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم اور سنو وتسلا! میں نہیں جانتا کہ تمہارے اس سے کیسے تعلقات ہیں مگر وہ ببھی تمہیں ملے اسے پتا کر جس شخص کا نام فیا ہے، وہ فولاد کا بنا ہوا ہے۔ موت کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ میں صاحب ایمان ہوں اور یقین رکھتا ہوں۔ وہ دنیا کا مضبوط ترین ٹھنڈا ہے جو صاحب ایمان ہو۔ سمجھیں تم! تم، ایلين اور زیوسا تینوں اپنی ڈرائے بیان بند کر دو ورنہ..... ورنہ.....“

”میں.....! او میں.....! پلیز بیٹھو.....! بیٹھ جاؤ.....! وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں غصے میں کھڑا ہو چکا تھا اور پھر..... میں اور وہ خدا، دونوں ہی چونک اٹھے۔ وہ کھڑی تھی، وہ جو معدور تھی، اٹھنے کے قابل نہیں تھی، وہ کھڑی تھی۔ اپنے موٹے بھدے اور بدہیت جسم کو اپنے پیروں پر اٹھانے ہوئے کھڑی تھی۔

”اوہ.....! خیا.....! مسٹر ضیا! تم نے دیکھا..... دیکھا تم نے.....؟“ وہ اپنے خوشی سے کاپنے لگی۔ ”یہ سب..... یہ سب اسی کی وجہ سے ہے۔ اسی زیوسا کی وجہ سے۔“

وہ میری کیفیت سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ میرے اشتعال، میرے غصے کو بھول کر بنا خوشی میں مست ہو چکی تھی۔ تب مجھے وتسلا سے بھی نفرت محروس ہوئی۔ اس نے اس لمحے جکہ میں سخت مشتعل تھا، اشتائی درجے کی خود غرضی سے کام لیا تھا۔ میں نے اس سوال کو ٹھوک کر ماری۔ جس پر چند لمحے پسلے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وتسلا گھبرا کر مجھے دیکھنے لگی۔ اسے فوری طور پر احساس ہو گیا کہ اس نے جو حرکت اس لمحے میں کی ہے، وہ سراسر

غلط تھی۔

”آئی ایم سوری میں.....! ریتلی سوری.....! تم جیجنو.....! پلیز.....!  
تم.....! شاید معاملے کی سیکنی کو محسوس نہیں کر رہے ہو۔“

”میں معاملے کی سیکنی کو خوب سمجھ رہا ہوں میڈم و تسلیا! تم اور وہ شیطانی قوت  
انسانوں کے بے وقوف باکراپنے آپ کو لا زوال کرنے کے خط میں بٹلا ہو۔“

”میں! تم پوری بات سن لو۔ تم جو ہم کو بلیم کرتا ہے، ام کو موقع دو۔ پلیز ایک بار  
پوری بات سن لو پھر جو دل چاہے کرنا۔“

وہ حکمیتی نہ گلی۔ اس نے میرا باتھ تھام لیا۔ میرا بھی تو چاہا تھا کہ اسے ایک صحیح  
سے اس بھلکے بیڈ پر دھکا دے کر گرا دوں اور خود وہاں سے نکل آؤں مگر جانے کیا بات  
تھی، کس چیز کا خوف تھا جس نے میرے قدم تھام لئے تھے۔ میں و تسلیا پر رعب ڈال رہا  
تھا، غصے میں اپنے آپ کو بہت مضبوط بھی طاہر کر رہا تھا مگر میں آپ سے جھوٹ نہیں  
بولوں گا۔ جو کچھ میرے ساتھ ہوتا رہا اور جو چند لمحے پلے ہوا تھا کہ میں بہ ہوش  
و حواس اپنے گھر کے دالان میں تھا۔ اماں کے کمرے میں داخل ہوا تھا اور یہاں پہنچ گیا تھا  
یہ واقعہ..... اکیلا یہی واقعہ مجھے اندر تک جھنجور دینے کو کافی تھا۔ میں ہل چکا تھا۔ میں  
خوفزدہ تھا اور شاید اسی خوف سے چھکا راپانے کے لئے و تسلیا پر جیخ رہا تھا۔ و تسلیا کے باقی  
تھامتے ہی مجھے لگا میسے میرے اندر کمیں گھمات لگائے بیٹھے خوف نے مجھے پورے کا پورا  
انپی گرفت میں لے لیا ہو۔ لمحہ بھر کے لئے میری ٹانگیں کامپیں اور میں دوبارہ اشول پر  
ڈھے گیا۔

”میں! کیا تم جانتا ہے کہ زیوسا کون ہے؟“

چند لمحے مجھے غور سے دیکھتے رہنے کے بعد و تسلانے دھیرے سے پوچھا۔

”اگر میں یہ جانتا تو اب تک اسے نیست و نابود کرچکا ہوتا۔“ میں نے دانت کچکا کر  
کہا۔ مگر میرے لمحے میں بے پناہ بے بی تھی جسے شاید و تسلانے محسوس نہیں کیا لیکن شر  
خود اپنی اس بے بی پر اندر ہی اندر روپڑا تھا۔

”دیکھو میں! ہماری باتیں غور سے سنو! ریلیکس ہو کر۔ اگر سینٹی میٹنل ہو کر سوچ  
گا، نئے گا تو فیصلہ بھی سیئی میٹنل ہو کر کرے گا اور یو نو،“ کہ ایسا فیصلہ غلط بھی ہو سکتا ہے۔  
تم سچ بولتا ہے۔ فتحہ سب سے بڑا قوت ہے مگر فتح کے لئے صرف ہارت ہی نہیں، ماننا

ہم پانچ سو ری ایکٹ کرتا ہو تھی فتح پادر فل ہوتا ہے۔ تاؤ آر یو ریلیکٹڈ؟“  
میں اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور واقعی اب پر سکون تھا۔ شاید اس لئے کہ  
بت بولا تھا۔ میں نے ابھات میں سرہلایا۔ اس کے موٹ اور بحدے ہوئوں پر آسودہ سی  
سکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جس میں تفکر بھی تھا اور رحم  
ہمیں، الجا بھی تھی اور اطمینان بھی پھر شاید وہ خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کرنے گئی۔  
اس نے سرانے کی نیبل پر رکھی بولت میں سے گلاس بھر کر پانی پلے مجھے دیا پھر خود پیا۔  
گلاس رکھنے کے بعد وہ چند لمحے فرش کو سکلتی رہی جیسے بولنے کے لئے مناسب الفاظ کا چنانچا  
کر دی ہو۔

میں اس محض خاموشی میں بھی الجھ گیا۔ لگا جیسے بہت زیادہ وقت گزر گیا ہو۔ کھنکارا تو  
”چوک اٹھی اور پھر جو کچھ اس نے مجھے بتایا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ دنیا کی قدیم قوموں  
میں جب افسوس طرازی کا دور شروع ہوا تو دو دیویوں نے خصوصی اہمیت حاصل کی جن  
میں اولاً ”عشتار“ تھی اور دوسری ”ارلیش کی مگل“ عشتار موسم بہار کی نمائندہ ہے جس  
میں پھول کھلتے ہیں، درختوں میں کونپلیں پھوتی ہیں اور فصلیں لہماقی ہیں۔ اس کے  
پرکس ارلیش کی مگل موسم سرما کی نمائندہ دیوی ہے جب درخت اور پودے اجز جاتے  
ہیں۔ ہر طرف خزان پھیل جاتی ہے۔ زمین سے ہریاں ختم ہو جاتی ہے اور موسم کی اس  
نہیں کا اثر انسانی نفیات پر بہت گمرا ہوتا ہے۔ انسانی کیفیات بھی تبدیل ہو کر انتشار غصے  
پر پورگی میں ڈھل جاتی ہیں۔ جب انسان زمین پر آباد ہوا اور زرعی دور میں اس نے قدم  
خاتوںہ موکی تغیرات کے اصل اسباب سے واقف نہیں تھا۔ اس کے لئے خزان اور  
نہر کی یہ آمدورفت ہیرت انگیز واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی کہ اچانک ان کے لگائے  
اسے پوچھے مر جا کر بے شر ہو جاتے اور کبھی اچانک ہی وہ لہماکر پھل دینے لگتے۔ چنانچہ  
نہیں نہ آئے وائل اس تبدیلی کی توجیہ انسوں نے اس طرح کی کہ بہار، محبت اور  
انکو، چیز بات کو تو حسن اور افزائش کی دیوی سے تعمیر کیا اور خزان کو موت، ظلمات،  
نہ بور اشتعال کی دیوی سے۔ قدیم انسانوں کے عقیدے میں ظلمات دنیا زیر زمین واقع  
نہیں بکھر جو محبت اور بہار کی دیوی آسمانوں سے زمین پر اتر کر اپنا حسن، محبت اور حسین  
بہار کو دور دور تک پھیلایا دیا کرتی تھی اور بہار کی دیوی کے میراں ہونے کا مطلب تھا  
کہ خواہ وہ باتات میں ہوں، حیوانات میں یا انسان میں.....

ہے۔ تباہی لانے والی، نفرتوں ایسے خوفناک جذبوں سے محبت کشید کرنے والی، کیا تمہیں اندماز ہے کہ اس کی محبت جسے وہ محبت کہتی ہے، وہ کیما انوکھا، کیسا سفاک اور کیسا سرد بندپ ہو گا! کتنا بد مہیت، کس قدر اذیت ناک اور تاہ کر دینے والا لگاؤ۔ یہوں سچ تم پر رحم کرے۔ مشرضیاء، ایسا بست کم ہوا ہے کہ زیوسا کسی پر عاشق ہوئی ہو اور اس نے اپنے مشوق کو اذیت نہ دی ہو۔“

”لیکن و تسلام تم اب سے پلے مجھے یہ بادر کراچی ہو کہ زیوسا نے مجھے کنی بار نظرات سے نکلا ہے، میری تکلیفوں کو دور کیا ہے، مجھے ایلن کی تباہ کاریوں سے بچایا ہے اور.....“

”ہاں مشرضیاء! میں نے یہ کما تھا۔“ اس نے میری بات کاٹ کر جواب دیا۔ ”اور اب بھی اپنی بات پر اصرار کروں گی۔ اس نے بیشہ تمہاری مدد کی ہے، ایلن سے بچایا ہے اور ہزاروں ایسی تکلیفیں ہوں گی جو حضن اس کی وجہ سے تم پر نہیں آئیں مگر.....“  
وہ اتنا کہہ کر بڑے پڑا اسرار انداز میں چپ ہو گئی۔ جیسے جو کہنا چاہتی ہو اس کی عینیں کا احساس اسے اچانک ہوا ہو۔ ”مگر کیا؟“ میں اور قریب سرک آیا۔ ”بولو.....!  
بولو!“

اس نے گمراہ انسان لے کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”مگر مشرضیاء! وہ اپنے شکار کی حفاظت کے لئے ایسا کر رہی ہے۔ آئی میں کہ اس کی محبت کا مرکز تم ہو۔ اس کی محبت کتنی اسی سفاک کیوں نہ ہو، اس کے لئے تو ایک حسین جذبہ ہے اور تم اس کے ال حسین مگر سفاک جذبے کی تسلیکن ہو۔“

اتنا کہہ کر وہ خلاوں میں گھورنے لگی۔ مجھے میرٹھ کی وہ رات یاد آگئی جو بت سیں گزری تھی مگر آج وہ سب یاد کر کے میری ریڑھ کی بہنی میں سنتاہت دوڑ گئی۔

”ہاں! البتہ اتنا ضرور ہے کہ تمہارے معاملے میں، میں اس میں کچھ تبدیلی محسوس کر رہی ہوں۔ کچھ چلک ہے، پڑا اسراری نرمی، شاید یہ اس لئے ہے کہ تم نادانشگی میں، پہنچا میں اس سحری بکڑی کی حفاظت کرچکے ہو۔ تم نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ تم نے اسے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اسی نرمی، تبدیلی اور پس کا یہی ایک سبب ہو سکتا ہے۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو میں!“

”ہاں، شاید..... لیکن و تسلام! میں اس میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ مجھے صرف اتنا بتاؤ“

یوں تملی دیوالا میں عشتار یعنی محبت کی دیوی ”اینیرووتی“ ہے جبکہ اریش کی گل، زیوسا ہے۔ عشتار اصل میں اعکادی اور اشوری قوموں کی تحقیق کردہ دیوی ہے جو اریش کی گل کی سکی بہن ہے۔ مصر میں ازیں، تحوت اور حمور ہے۔ فلسطین میں اثاث اور عذرتوں ایران میں شلا، اناہستا اور نانیا ہے۔ ہندوستان میں درگا، گوری، اوشا، سرسوتی اور رلہ ہے۔ عربوں میں زہرہ اور مشتری ہے جنہوں نے ہاروت اور ماروت کو اپنے دام محبت میں گرفتار کر کے اس عظم معلوم کر لیا تھا اور ستارہ بن کر آسمان پر چلی گئی تھیں۔

تمام قدیم داستانوں میں عشتار، ”اوتو“ یعنی سورج کی سکی بہن بتائی گئی ہے۔ اریش کی گل جو یونانیوں میں زیوسا ہے، ایرانیوں میں شرکی قوتون کے حوالے سے مذکوری گل میں اہرمن کے نام سے جانی جاتی ہے اور ہندوؤں میں کالی مانی ہے۔ کنعانی دیوالا میں ایل کی یہوی کا نام عاشرطہ (عشتر ہے) عاشرطہ کے بطن سے ایل کی تین اولادیں ہوئیں۔ بعل، موت اور اثاث! موت، جو بعل کا سگا بھائی اور اس سے سب خوف کھاتے تھے، اس نے ایک روز بعل کو ہلاک کر دیا تھا۔ یہی موت، یونانیوں میں مونٹ کی شکل میں زیوسا کے ہم سے جانا جاتا ہے اور اسی حساب سے یہاں زیوسا کی تمام ترقیات موت میں پائی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ مجھے و تسلانے انگریزی میں بتایا تھا۔ میں گنگ بیٹھا اس تقدم دیوالا داستان کو سن رہا تھا۔ وہ عقائد جو اربوں برس پلے کے انسان نے ظاہری تبدیلیوں، موکر تغیرات، انسانی جذبات کی تبدیلی، موت اور حیات جیسے حریت اگنیز واقعات دیکھ کر انہی دیوالاں کا درجہ دے کر نام دے دیتے تھے۔ وہ آج کے جدید دور میں بھی تھوڑی از تبدیلی کے ساتھ جوں کے توں موجود تھے۔

اس تمام داستان میں گو میری معلومات کے لئے بہت کچھ تھا مگر اس وقت نہ صرف زیوسا سے دلچسپی تھی۔ زیوسا جو خراں کی دیوی تھی، جس میں تمام تر کیفیات مدنی تھیں، تباہی کی تھیں۔

”مشرضیاء!“  
مجھے و تسلانے چونکا دیا جو ساری داستان سا کر بہت دیر بعد خاموش ہوئی تھی“  
اب اپنا انسان بحال کر رہی تھی۔  
”ہاں!“ میں چونک اٹھا۔

”اے میں تمہاری بیٹی لک کموں گی۔ تم پر عاشق ہونے والی دیوی انتائی بدھو۔“

اب سست سٹاکروہ کالی مائی کی شکل میں میرے سامنے موجود تھی اور میں اس سے  
رُوب ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اچانک میں کھڑا ہو گیا۔  
”اگل..... کمال جارہے ہو.....؟“

”اپنے ایمان اور عقیدوں کی سچائی پر کھنے۔“ میں نے انتہائی مضبوط لمحے میں  
جواب دیا۔ وہ مجھے پکارتی رہ گئی اور میں نے اس کے کمرے سے باہر قدم رکھ دیا۔

☆-----☆-----☆

کہ زنجیریں تمہارے حوالے کر دینے سے میرا کیا فائدہ ہے؟ اگر زیوسا مجھ پر پھر حادثہ  
رہے گی بلکہ میرا خیال ہے اگر میں وہ زنجیریں ایں کی قبرتک پہنچا دوں تو ایں بھی مجھے  
نقصان نہیں پہنچائے گی اور زیوسا تو اس کی قید میں جا کر یوں بھی بے بس ہو جائے گی۔ کہ  
خیال ہے؟“ میں نے تمثیرناہ انداز میں کہ۔

وہ سفید ہو گئی۔ اس کی گدی اور ویران آنکھوں میں خوف پھیل گیا۔ اس نے بے  
بینی سے مجھے دیکھا جیسے میرے چہرے کے تاثرات سے میری بات کی سچائی کا اندازہ لگا  
چاہ رہی ہو۔ وہ بے بینی کی کیفیت سے نکلی تو مزید خوف زدہ ہو چکی تھی۔  
”میں مسٹر ضایا! تم ایسا نہیں کرو گے۔“  
اس کا لجہ کھو گھلا تھا۔

”تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے مسٹر ضایا!“

وہ ملتی انداز میں بولی۔ ”ایسا کر کے تم ایک خوفناک حرکت کرو گے۔ زیوسا ایک  
دیوی ہے، چاہے وہ سفاک ہو یا نفرت انگیز! اسے ایں جیسی بدروح کے حوالے کرنا  
بہت بڑی تباہی کو دعوت دیتا ہے۔ تم شاید سمجھ نہیں رہے۔ تم دنیا کے کسی خطے پر، کلے  
آسمان کے نیچے، کہیں محفوظ نہیں رہو گے۔ اس لئے کہ زیوسا مختلف روپ میں جگہ جگہ  
موجود ہے۔ وہ ایں کی گرفت یا قید میں جا کر بھی اپنی صفت نہیں بدل سکتی۔ تباہی اور  
موت کی تمام تر قوتوں اس کے تابع ہیں۔ پلیز.....! دیکھو، میں تمہیں سمجھا نہیں سکت۔  
میں خود کو بے بس محسوس کر رہی ہوں یا تم..... تم سمجھنا نہیں چاہتے۔ دیکھو، میری  
بات سنو۔“

وہ گھبرا گھبرا کر بول رہی تھی اور جانے وہ کون سی قوت تھی جو مجھے مضبوط کرتی چلی  
جاری تھی۔ حالانکہ شالی ببابا بھی مجھے یہی مشورہ دے چکے تھے مگر میں آپ کو پہلے ہی تباہکا  
ہوں کہ میں کچھ عقیدوں کا قائل نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ شالی ببابا روحانیت کی اس منزل پر  
نہیں ہیں جس پر میں انہیں سمجھا تھا۔ اگر زیوسا وہی تھی جس کی تفصیل میں و تسلیت  
سن چکا تھا تو ان میں کہیں بھی مسلمانوں کے عقیدے کا کچا پن نہیں تھا۔ عربلوں اور  
ایرانیوں کے عقائد میں دوسروں سے زیادہ حقیقت کا دراکھا مگر یہ کب کی بات ہے اور  
یہ کس شکل سے، کس حیثیت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہ میں نہیں جانتا تھا اور جانے بنی  
لیقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

چاہئے تھا۔

”نہیں.....! یہ غلط ہے۔ سلیم نے عشق کیا تھا اور عشق کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔“ طیب نے بلکر احتیاج کیا۔

”تو پھر؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اس کا باپ دیوار میں چنوا دیا جاتا؟“

”ہاں! میرا یہی خیال ہے۔ وہ سماج کی دیوار تھا۔ دو پار کرنے والوں کے درمیان اسے ہی دیوار کا حصہ بننا چاہئے تھا۔“ طیب نے کہا۔

”اچھا چلو“ منے دادا کو زیادہ مکالگانے کی ضرورت نہیں۔ آج تمہیں کوئی ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔“

عصمت آپا نے گویا منے دادا کو یاد دہانی کروائی اور پر امید نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگیں۔ اب مجھے شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یا تو بیچ آنکن میں کھڑا کوئی درخت ہوں یا ستون۔ وہ سب میرے سامنے تھے اور مجھے نظر انداز کر رہے تھے۔ میں آگے بڑھا۔ جو نی ہیں نے ایک قدم بڑھایا، آپا جو بالوں کی لمبی چوٹی کو جھکلے سے پیچھے کر رہی تھیں، میری طرف دیکھ کر چونک اٹھیں۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“

”آں.....! ہاں!“ میں چونک کر آگے بڑھا۔ ”کہیں نہیں، یہیں تھا۔“

”چائے لے کر سارے گھر میں پھرتی رہی..... بنا کر لاوں؟“ انہوں نے کچن کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

”لے آئیے!“ میں نے بو جمل لبجے میں جواب دیا اور منے دادا کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”آؤ خدا! یوں بے بتائے کہاں چلے گئے تھے؟“ منے دادا نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”یہیں تھامنے دادا.....! لیکن..... پھر بھی یہاں نہیں رہا۔“

”کیا مطلب؟“ منے دادا نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کی فیلنگس اتنی ہی پچیدہ ہوتی ہیں منے دادا! اسے خود بھی نہیں پتا چلا کہ کیا ہے یا کیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آج ایک ایسا کوئی ایسی ضرور پیدا ہو چکی ہوتی جو بخوبی اس کے لئے خود کو دیوار میں چنوا لیتی۔“

”مجھے تاریخ سے بے پناہ دیکھی تھی متنے دادا!“

یہ آواز طیب کی تھی جو وہ تسلیک کرے سے باہر قدم نکلتے ہی میرے کالوں میں پڑی تھی۔ میں اچھلا مگر فوراً ہی میں نے خود کو سنبھال لیا۔ اپنے اطراف کا جائزہ نگاہ یا مر تمہماںے بغیر لے لیا۔ میں اپنے گھر کے آنکن میں بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ یہاں منے دادا کے کمرے میں بچا پلٹگ صاف نظر آرہا تھا۔ طیب ان کے گھنٹے پکڑے بیٹھا تھا۔ وہ نیم روز تھے۔ اماں کے کمرے سے سب کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھی۔ میں چند لئے حیرت زدہ کھڑا رہا۔ اسی لمحے عصمت آپا چاول کی سینی لئے کچن سے باہر نکلیں اور یوں گزر گئیں جیسے انہوں نے مجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ منے دادا کے دروازے پر رک کر وہ طیب کی باتیں سننے لگیں۔ طیب کہہ رہا تھا۔

”تاریخ سے دیکھی ختم ہونے کی سب سے اہم وجہ انارکلی کو دیوار میں چنوانہ نے والا واقعہ تھا منے دادا! مجھے بادشاہوں کے کردار بست ملکوں لگے۔ شزادہ سلیم کے باپ نے کیا کچھ نہیں کیا ہو گا، آپ خود سوچیں مگر..... شزادے سلیم کے عشق کے معاملے میں وہ بالکل الجیسا نکلا۔ ہربات پر توکنا، ہربات پر اعتراض..... وہ کوئی پچھے تھا؟“

”اگر شزادہ سلیم تمہارے جیسا تھا تو اس کے باپ نے بالکل ٹھیک کیا۔“ یہ عصمت آپا تھیں جو نتھنے پھلا کر کہہ رہی تھیں۔ ”وہی جو ناصر پچا کرتے ہیں تمہارے ساتھ۔“

”لیکن عصمت آپا! انارکلی کا کوئی قصور نہیں تھا۔“

”ہاں.....! یہاں مجھے تم سے قطعی اختلاف نہیں ہے۔ اصل میں شزادہ سلیم کے چنوانا چاہئے تھا۔“

منے دادا ان دونوں کی نوک جھوٹک سے محظوظ ہو رہے تھے اور میں کی سوچ رہا تھا کہ میں جو بیچ آنکن میں کھڑا ہوں، کیا عصمت آپا کو دکھائی نہیں دیا؟ اس دوران میں طیب نے جب عصمت آپا کی طرف دیکھا تھا تو اسے کچھ فاصلے پر کھڑا میں بھی نظر آ رہا۔

”ماش! وہ انار کلی تم ہوتے!“ عصمت آپ نے کچن سے ہانک لگائی۔

عصمت آپ اور طیب کی یہ نوک جھوٹ مچھے کچھ ایزی کر رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی چند لمحے جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، ماش! وہ خواب ہو۔ منے دادا مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔ میں منے دادا سے پوچھنا چاہتا تھا کہ انہوں نے مجھے کب سے نیں دیکھا مگر طیب کے سامنے بات کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسے اپنے چیچھے لگایتا۔

شاید منے دادا نے عحسوس کر لیا کہ میں کسی الجھن میں ہوں۔ انہوں نے طیب سے کہا کہ وہ جا کر جامن لے آئے۔ یہ جامن زمینوں سے آیا کرتے تھے اور اماں نے ایک کمرے میں انسیں پھیلایا ہوا تھا تاکہ خراب نہ ہوں۔ طیب جانے لگا تو منے دادا نے کہا۔

”طیب! میرا خیال ہے، تم ابھی ابھی جامن جن کر ٹھنڈے ہونے کو رکھ دو۔ ہم شام کو کھائیں گے۔ فی الحال میں آرام کروں گا۔“ وہ چلا گیا۔ عصمت آپ اب بھی کچھ کہہ رہی تھیں مگر اب میرا زہن الجھ گیا تھا۔ میں گزرے لمحات کو یاد کر رہا تھا۔

”ہاں نیاء! اب بولو، کیا بات ہے؟ کچھ گڑ بڑھ ہے کیا؟“ میں نے ساری بات منے دادا کو پتادی۔ ”پتا نہیں،“ منے دادا یہ سب کچھ سچ تھا، حقیقت تھا یا خواب؟“

”تم تصدیق کر سکتے ہو۔ و تسلسلے مل لو۔“ میں نے چونک کرنے دادا کو دیکھا۔ اتنی معمولی سی بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی۔ ”ہاں! ٹھیک ہے۔“

”مگر سنو! کیا تم واقعی وہ زنجیریں و تسلسل کو نہیں دینا چاہتے؟“ منے دادا نے پوچھا۔ ”کیا کروں گا دے کر منے دادا؟ میرا مسئلہ دہیں کا دہیں رہے گا۔ اگر واقعی و تسلسلے جو تاریخ ہتاں ہے، وہ درست ہے تو وہ مجھے کالی مالی کے مندر میں بھی مل جائے گی اور کیا آپ کے عقائد میں اس کی کوئی حیثیت ہے؟ کیا میری زندگی کا فیصلہ اب قائل ہائی، درگا دیوی کیا کرے گی؟ مجھے تو حیرت اور افسوس ہے کہ شالی بابا نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا ہے۔ وہ بھی زیسا کو میرا ہمدرد سمجھ رہے ہیں۔“

”نہیں بیٹا! ان کا مطلب یہ نہیں تھا بلکہ وہ تمہیں تباہیوں سے بچانے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ شاید وہ اس کی طاقت سے مروعہ ہوں۔“

”زیو سا بذات خود تباہی ہے اور اگر شالی ببا جیسا آدمی اس کی طاقت سے مروعہ ہو سکتا ہے تو پھر آپ عام آدمی سے کیا توقع کر سکتے ہیں؟“

”میری تو کچھ بھجیں نہیں آرہا۔ کاش! عطا نے یہ سب کچھ نہ کیا ہوتا۔“

”بھیں ماضی کو کونے کی بجائے سامنے کھڑے خطرے سے نہیں کی تدبیر کرنا چاہئے نہیں دادا! اور میں و تسلسلے تصدیق بھی کیوں کروں۔ آپ کہ رہے ہیں کہ آپ نے کافی دیرے مجھے نہیں دیکھا تھا اور میں بتا رہا ہوں کہ میرے ساتھ یہ سب ہوا۔ مجھے یوں بھی اپنے ساتھ ہونے والے کسی بھی واقعے پر احتبا نہیں ہوتا۔ یہ سب بھی ضرور ہوا ہو گا۔

”نہیں نے دادا! مجھے کچھ اور کرنا ہو گا، کوئی اور راستہ اختیار کرنا ہو گا۔“

”کیا کرو گے؟“ ان کے لمحے میں خوف تھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ میں نے انسیں تسلی دی۔

”شالی بابا کی دی ہوئی مٹی آپ نے یقیناً یہاں بھی پھیلا دی ہو گی۔ میرا جھ کی کوئی بھی کارے میں بھی جلد ہی آپ کو روپورٹ مل جائے گی۔ آپ چاہیں تو سب کو لے کر دہاں جا سکتے ہیں۔ میں البتہ سوچ سمجھ کر ہی کوئی فیصلہ کروں گا لیکن آپ فکر نہ کریں۔ میرے لئے کوئی خطرہ اہمیت نہیں رکھتا منے دادا! موت برحق ہے، میں خندہ پیشانی سے اسے خوش آمدید کوں گا۔ وہ اس سے زیادہ مجھے کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟“

”خوف موت سے نہیں ہونا چاہئے ضیاء! مگر کیا تم جینو، رابرٹ اور سورن سنگھ کو بھول گئے ہو؟ ایسی اذیت ناک زندگی موت سے بدتر ہوتی ہے۔“

”منے دادا! مجھے اپنے خدا کی رحمت سے بڑی آمیدیں ہیں۔ میں نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا اسی لئے مجھے یقین ہے کہ خدا بنا جرم کے سزا نہیں دے سکتا۔ وہ رحیم ہے؛ رحمان ہے۔ قمار وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو اپنے قمر سے دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ان پر بھی ایک قمار موجود ہے۔ آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ اس کی رحمت اور رحمانیت سے مایوسی کفر ہے۔“

”لیکن تم کیا کرنے والے ہو ضیاء! میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

”میں جو کچھ بھی کروں گا منے دادا! آپ کو اعتماد میں لے کر ہی کروں گا۔ فی الحال تو

میرے ذہن میں کچھ نہیں ہے۔ میں سوچنا چاہتا ہوں۔“

”آپ فکر نہ کریں۔“ میں نے ان کے گھنٹوں کو چھوڑا اور کھڑا ہو گیا۔ باہر آیا تو

وہ لال اشتوں کی نبی ہوئی کوئی بہت پرانی عمارت تھی۔ بے حد بو سیدہ جس کے طوپیں دعویٰ صحن میں خود رو جھاڑیوں کا جنگل سا بن گیا تھا۔ ان جھاڑیوں کے پیچے سے عمارت کا اندر ورنی حصہ نظر آ رہا تھا۔ اونچے اور کھلے گیٹ کے اوپر محابین بندی ہوئی تھیں۔ بہت چوڑی چوڑی سیڑھیاں اور اندر کا نیم تاریک حصہ مجھ سے کچھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور اس درمیانی فاصلے میں وہ جھاڑیاں تھیں۔ میں یہاں تک کیسے آیا، یہ تو کچھ یاد نہیں مگر مجھے اندر تک جاتا ہے، اس کا احساس نہ معلوم مجھے کس نے دلایا تھا۔ کوئی مجھے اس کا سارا رہا تھا۔ اندر جانے کی ترغیب دے رہا تھا۔ میں نے آخری بار اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے۔ اب سے پہلے میں یہاں کبھی نہیں آیا تھا ورنہ یہ جگہ ماوس ضرور لگتی۔

یہاں دور دور تک کوئی دوسری عمارت تھی، نہ کپی سڑک۔ جگہ جگہ لیکھس (Cactus) کے پودے تھے یا جنگلی پھلوں کے درخت۔ کوئی تنفس نہیں تھا۔ اب میں نے پھر گھوم کر اس لال عمارت کی طرف دیکھا۔ یہ عمارت ایسی تھی جیسے مغل شہنشاہوں نے اسے بنایا ہو۔ کسی کا محل یا مقبرہ ناٹپ کی عمارت۔ اس وقت مجھے قطعی یہ خیال نہیں آیا کہ مجھے واپس جانا چاہئے بلکہ میں یوں تھا جیسے میں آیا ہی اسی عمارت میں جانے کے لئے ہوں۔ ذہن میں شل تھا اور دل میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ مجھے اندر جاتا ہے۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ یہ وہ وقت تھا جب شام ختم ہو کر اپنا ہاتھ رات کے تاریک ہاتھ میں دے رہی ہوئی ہے اس لئے میں یقین سے نہیں کہ سکتا کہ دن ڈھل چکا تھا یا نہ لئے والا تھا۔

سوکھے پتے میرے بوٹوں کے نیجے اکر چچرا رہے تھے اور ان کی چچڑاہٹ کی آواز دور دور تک پھیل رہی تھی جس نے گرے نائلے کے احساس کو اور شدید کردا تھا۔ میں جھاڑیوں کو سامنے سے ہٹاتا، نگاہ اس عمارت کے نیم تاریخ اندر ورنی حصے پر جائے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے ہی قدموں کی آہٹ اجنبی بن کر مجھے کسی کے تعاقب میں ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ میں نے کئی بار چوک چوک کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اطمینان کر لینے کے بعد آگے بڑھا۔

اب میں اس عمارت کے کافی قریب پہنچ کا تھا اس عمارت کی بیرونی دیوار کے نیچے نئے پر سیاہ کالی جبی جس کے کنارے اب بھی سبز تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے کچھ اسے پہلے تک اس عمارت کا کافی حصہ پانی میں ڈوبا رہا حالانکہ اس کے نزدیک دوسرے پانی،

عصمت آپا، طیب سے جھگڑ رہی تھی۔ وہ طیب سے کہہ رہی تھی کہ اب وہ مہمان نہیں ہے اس لئے چکی سے آئے کی بوری بھی لانا ہوگی اور بازار سے سبزی گوشہ بھی اور طیب انیں اخلاقیات کی تفصیل بتانے کی سروڑ کو شکر رہا تھا کہ عرب بڑے مہمان نواز تھے اور حضور نے بھی یہی درس دیا ہے کہ میزانی کے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کیا کرو۔

”هم عرب نہیں ہیں اور پھر انہوں نے کچھ نہ کچھ مہمانوں کے بارے میں بھی کہا ہے جو فی الوقت مجھے یاد نہیں ہے لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ تم جیسے آدمی کی میزانی قطعی اخلاقیات سے باہر کی چیز ہے۔“

میں انہیں جھگڑتا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں جانتا تھا کہ عصمت آپا بہت جلد طیب کو بھیبھی بھجو کر ہی دم لیں گی۔ انہیں طیب سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ میں بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ میں سوچتا اور فیصلہ کرنا چاہتا تھا مگر میرے سامنے کوئی ایسی راہ نہیں تھی جس پر آگے بڑھنے کا پلان بناتا۔ لے دے کر شالی بیا تھے یا وتسلا۔ اب دونوں ہی کے پتاۓ ہوئے راستے غلط محسوس ہو رہے تھے۔ میں کسی سے مشورہ کرنا چاہتا تھا مگر کس سے کر رہا، میرے راز داروں میں میں نے دادا تھے یا طیب۔ طیب سے کسی معقول مشورے کی توقع عبث تھی۔ میں دادا کے پاس بھی ایک شالی بیا کی شخصیت کے سوا کوئی دوسری شخصیت نہیں تھی۔

میں سوچتا رہا۔ میرے دماغ میں مسلسل انتشار پھیلا رہا۔ مال نے کھلانے کے لئے بلوایا مگر مجھے بھوک نہیں تھی۔ میں نے منع کروا دیا۔ میں نے دادا نے مجھے نہ خود ڈسٹرپ کیا تھا طیب کو اس طرف آنے دیا۔ میں نے تمام دوپر اور تمام سے پر بند کر کے میں گزار دی۔ اب شام ہو چکی تھی اور اب بھی میں نہ تو کسی نتیجے پر پہنچا تھا اور نہ ہی اس معاملے کو ذہن سے جھٹک پا رہا تھا۔

اسی طرح رات ہو گئی۔ رات میں مال کھانے کے لئے بلانے آئیں۔ میرے انکا پر پہلے تو تشویش میں جلتا ہو میں پھر مجھے ٹھیک پاکر بڑوڑا میں بھی مگر میں نے انہیں مطمئن کر کے بھیج دیا۔ میں نے دادا نے اب بھی مجھے ڈسٹرپ نہیں کیا۔ سوچتے سوچتے جانے کب سو گیا۔

جوہر، دریا یا نہر کا شاہرہ تک نہ تھا۔ یہ سبز مائل سیاہ کالی عمارت کی بد صورتی میں امدا  
کر رہی تھی۔ بوییدہ عمارت کئی ہزار برس پلے کی لگ رہی تھی۔ اب قریب آنے پر مجھے  
لگ رہا تھا کہ یہ عمارت کسی پرانے مندر کی ہے۔ دیوار پر جگہ جگہ مورتیاں کھددی ہوئیں۔  
تھیں۔

اب میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ آثار بتارہے تھے کہ اس اندر وہی خلا پر کبھی  
دروازہ بنا رہا ہوا گرا ب صرف کھڑکی کی چوکھت قائم تھی جس کا نچالا حصہ برابر ہو کر جگہ  
جگہ سے جھوٹپا تھا۔ میں اس کھلے ہوئے دروازے کے میں سامنے تھا۔ اندر گھری تاریکی  
تھی۔ بے اختیار میرا ہاتھ جیب کی طرف بڑھ گیا۔ حسب تو قاصی میری جیب میں تھی  
میں نے اسے نکال کر چیک کیا۔ اس میں کافی تیلیاں تھیں۔ اندر داخل ہوتے ہوئے میں  
لحد بھر کو ٹھنکا۔ وہ پھکار کی آواز تھی شاید یہ میری چھٹی جس نے مجھے خبردار  
کر دیا تھا۔ میں نے عجلت میں ماچس جلانی اور سیاہ ناگ کو اپنے میں سامنے دیکھ کر میں پھر  
کا بن گیا۔ اگر میں نے ایک قدم بھی آگے بڑھا دیا ہوتا تو شاید میں آپ کو یہ کمالی سنائے  
کے لئے زندہ نہ ہوتا۔

میں نے فوری طور پر داہیں جانب چھلانگ لگائی۔ اسی دوران میں ماچس کی تیلی بجھی  
چکی تھی۔ اتنی دیر میں وہ سانپ بھی غائب ہو چکا تھا اور ہر غائب ہو جانے والی چیز سے  
انسان ڈرتا ہے۔ میں بھی خوف زدہ ہو گیا۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اب بھی مجھے لوٹ  
جانے کا خیال نہ آیا۔ میں اگلی تیلی کی نہ ہم روشنی میں آگے بڑھا۔ یہ چند فٹ لمبا کو یور  
تھا۔ سامنے کا کھلا حصہ مجھے نظر آ رہا تھا جہاں شام کی ملکجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے  
ایک جست لگائی اور آدھا کو یور عبور کر گیا۔ دوسرا جست کے ساتھ ہی میں کھلے ہے  
میں تھا۔ وہ چھوٹا سا تاریک رست اور اس رستے میں پھیلا ہوا اندر ہمراہ کو جانے والے  
سانپ کی وجہ سے مجھے خوف زدہ کر رہا تھا کہ جانے وہ موزی کس کونے میں اور کس جگہ  
میرا منتظر ہو۔

کھلے ہے کا جائزہ لیتے ہی میں جان گیا کہ یہ قدیم مندر ہے۔ اندر کی تمام دیواریں  
سیاہ پر چکی تھیں۔ کئی جگہ تو دیواریں بھی گری ہوئی تھیں۔ اب میں با آسانی دیکھ سکتا تھا  
تبھی مجھے احساس ہوا کہ آج بھی میری حیرت اگیز بینائی نے میرا ساتھ دیا ورنہ ادھر ادھر  
ملکجی روشنی ہونے کے باوجود اس تاریک حصے میں دیکھ لینا میرے لئے قطعی مشکل نہ تھا۔

شاید میں اپنی وہ حیرت انگیز طاقت کھو چکا تھا۔  
”کون ہو تم؟“

میں اچھل پڑا۔ آواز میرے انتہائی دائیں جانب سے آئی تھی۔ میں نے آنکھیں  
چھاڑ کر اس طرف دیکھا۔ کھلے ہے میں تو کوئی نہ تھا ورنہ شاید مجھے آنکھیں پھاڑنے کی  
مزدورت بھی نہ پڑتی مگر دائیں جانب بنے چھوٹے چھوٹے دروازوں کے دوسری طرف  
دیساںی گھپ اندھرا تھا۔ جیسا اس کو یور میں تھا۔

”لک..... کون ہے؟ کون ہے وہاں؟“ میں نے دھڑکتے دل کو قابو میں کرتے  
ہوئے پوچھا۔

اور پھر مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ..... وہ بہت لمبا چوڑا، سیاہ رنگ کا موٹے  
نقوش والا آدمی تھا جس کے سر کے بال ہی نہیں بلکہ موچھیں، داڑھی اور بھنوؤں کے  
بال بھی سفید تھے۔

”کیوں آئے ہو یہاں؟“ وہ بھاری آواز میں بولا۔

”میں..... پا نہیں..... م..... م.....“ میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا جواب  
دیں۔

”آکو پوری ایک صدی بعد کوئی اس مندر میں داخل ہوا ہے۔“ وہ میرے قریب  
اگلی۔ اس کے ہاتھ میں ایک عجیب سالیپ تھا۔ ایک چوکور شیشے کے اندر موم تھی جل  
رہی تھی۔

”کیا..... ایک صدی..... یعنی سو سال بعد!“  
”ہاں.....!“

وہ اور قریب آگیا۔ اب وہ بالکل میرے رو برو تھا۔

”پریشان ہو؟“ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔  
”ہاں.....!“ میں نے بے ساختہ جواب دیا تھا۔

وہ سکرایا۔ ”مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے.....“ وہ اتنا کہہ کر مجھے اپنے ساتھ  
آنے کا اشارہ لگ کر آگے چلنے لگا۔ میں بھی اس کے پیچے چل پڑا۔

”تم کون ہو؟“ اب میرا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔

”یہ جانتا تمہارے لئے ضروری نہیں لو کے!“ اس کے لئے میں ناگواری تھی۔

نہ معلوم کیوں میں نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ میں چپ چاپ اس کے پیچے چلا رہا۔ وہ بڑی پرچمی راہب اریاں تھیں جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ چند منٹ میں ہم نے کئی موڑ کائے تھے۔ کالی زرد دیواروں سے بڑی ناگوار بوجنگھے بوجمل کر رہی تھی۔ اب وہ خاموش تھا۔ میں بھی خاموش تھا۔ میرے قدموں کی چاپ ان ٹکلے راہب اریوں میں بازگشت بن کر گونج رہی تھی۔ میں ناگیں جھکائے زمین پر پڑتے روشنی کے دارکے میں قدم بڑھا رہا تھا اور میری ناگیں اسی غائب ہو جانے والے سانپ سے بچنے کو تیزی سے چاروں طرف گھوم رہی تھیں کہ میری نگاہ اس آدمی کے پیروں پر جنم گئی۔ اس نے صدیوں پرانے زمانے کے کڑی کے کھڑاؤں پہنچنے ہوئے تھے۔ جن پر اور کی جانب ایک پیتل کی پیٹی تھی جس میں اس نے اپنی الگیاں پھنسا رکھی تھیں۔ کھڑاؤں تو اس زمانے میں بھی تھیں مگر ان کی یہ ٹکل نہیں تھی پھر اچانک میرے روٹکے کھڑے ہو گئے کہ اس کی ایڑی سے ٹکرا کر زمین سے ٹکرانے والی کھڑاؤں کی کوئی آواز نہ تھی۔ اس کے قدموں کی کوئی چاپ نہیں تھی حالانکہ وہ پیر گھیث گھیث کر چل رہا تھا جبکہ میں اچانک ہی مختاط ہو گیا تھا۔

”س..... سنو!“ میں سکھیا کر رک گیا۔

وہ رکا۔ میری طرف پلتا۔ اس کی آنکھیں اتنی کم روشنی میں چڑاغوں کی طرح چکتی محسوس ہو رہی تھیں اور ان میں ایک عجیب سی سکینی مسکراہٹ تھی۔

”تم مجھے کمال لے جا رہے ہو؟“ میں نے تھوک ٹکل کر پوچھا۔

”جہاں تمہیں ہونا چاہئے..... تم ساری جگہ پر..... تم دیوی کے مہماں ہو..... ٹکر مت کرو..... وہ ایک صدی سے تم ساری ہی منتظر ہے۔ آج میں بت خوش ہوں آج میں آزاد ہو جاؤں گا..... آج وہ مجھے ملا مال کر دے گی۔ میری تپیا ویدت نہیں گئی۔ آج میں مندر میں چڑاغاں کروں گا۔ اس تیل سے چڑاغاں کروں گا جو اپنی ہی نسل کو جلا جلا کر جمع کرنے پر مجبور تھا۔ آج کے بعد مجھے یہ گھناؤتا ہم نہیں کرنا پڑے گا اور میں..... میں ایک نیا جنم لے کر دنیا کی سندرتا کو پر اپت کر سکوں گا۔“

وہ پتا نہیں کیا کہ رہا تھا مگر میرا روایا روایا لرز رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ بست زیادہ خوفناک ہونے والا ہے۔ میں اس کی آنکھوں کی تاب نہیں لیا پر رہا تھا۔ بس

اچانک میں نے اپنے اندر جدوجہد محسوس کی۔ میرا جی چلا کہ میں بھی پلٹوں اور ان پرچم راہب اریوں میں دوڑتا چلا جاؤں۔ میں پلانا یہ سوچے بغیر کہ میں کبھی ان بھول، میلوں سے نکل بھی پاؤں گا کہ نہیں۔ بھی میں نے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس سیاہ فام بھن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کی لمبی لمبی الگیاں چھوٹے چھوٹے ساپتوں کی طرح میری کلائیں میں پٹ گئیں۔ وہی چکنی چکنی، سرسراتی ہوئی سی۔ میرے ہاتھ سے ایک ڈنک جیچ نکلی اور راگبیسے میں کسی بہت اوپنی جگہ سے پیچ پھینک دیا گیا ہوں۔

”ضیاء.....! ضیاء.....!“ ایک دھمکی سی سرگوشی سنائی دی۔ میرے گرتے ہوئے بدن کو جھٹکانا گا اور میں نے آنکھیں کھول دیں۔ میرا اپر کا سانس اور نیچے کا پیچ رہ گیا۔ وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔

☆-----☆-----☆

کچھ دیر تک مجھے ہوش نہ آیا۔ ایسا گلتا تھا جیسے میرا ذہن دور تک پھیلے سمندر کی سطح پر تیر رہا ہے۔ دور دور تک خلا محسوس ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بھی وہند چھائی ہوئی تھی۔ ایسے میں وہ صرف ایک ہیولا محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آواز میرے اندر ٹکر لکھوڑے لے رہی تھی۔ ڈوبتے ذہن کو بار بار ابھر آنے کی تلقین کرتی ہوئی پھر لگا جیسے میری پیشانی پر کسی نے اپنا ہاتھ رکھ دیا ہے۔ حرارت نے مجھے حواس بخشنے۔ میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

”ضیاء.....!“

اس بار میں نے آنکھیں پوری کھول دیں۔ وہ فرحت تھی۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔

”تم کب آئیں؟“

”میں بھی تم سے دور نہیں ہوتی ضیاء!“ اس نے بڑے پرکشش لمحے میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر پیار تھا۔ ہونٹوں پر نرم مسکراہٹ تھی۔

”تم کب آئیں؟“ میں نے اپنا سوال دہرایا اور ساتھ ہی اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔ میں اپنے کرے میں ہی تھا۔ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ میرے بدن کا جوڑ جوڑ دکھ باتھا تھا۔ اس نے اس بار بھی میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اپنا نرم و ملائم ہاتھ بڑے چہرے پر پھیرا اور پولی۔

”ضیاء! میں تمہیں بھی تباہ نہیں چھوڑوں گی۔ میں ہر وقت، ہر لمحہ تم سارے

پاں ہوں ..... تم کبھی پریشان مت ہوئا ..... یہ پنڈت کی بے وقوفی تھی۔ اسے تمہاری اہمیت کا احساس نہیں تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ تمہارے بینے میں سوراخ کر دینے سے اسے آزادی مل جائے گی ..... ”

میں بھٹا کر انھوں بیٹھدے۔ اب میں پوری طرح جو اسون میں تھا اور سمجھ چکا تھا کہ میرے پاس میٹھی لڑکی فرحت نہیں بلکہ وہ سو فیصد زیوسا ہے۔ یہ پسلا موقع تھا کہ زیوسا میرے سامنے تھی۔ گو وہ فرحت کے روپ میں آئی تھی مگر اس نے خود کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”زیوسا!“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں ضیاء! یہ میں ہوں ..... میں .....“

”کیا چاہتی ہو تم؟“ میں نے بدن کے درد کو نظر انداز کر دیا اور اس کے روپ پر پہنچ گیا۔

”تمہاری توجہ، محبت جو تم نے مجھے شروع سے دی۔ میں اس قابل نہیں تھی فیماں گر تم نے میری حیثیت کو بالکل بدلت کر دیا۔“

”ایسا میں نے نادانشکی میں کیا تھا زیوسا! تم واقعی اس قابل نہیں تھیں ..... اور

میں پچھے تھا۔ چکدار چیزوں کا شیدائی ..... مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اپنی آئین میں سانپ پال رہا ہوں۔ بہر حال ..... آج تم آگئی ہو تو میں صاف صاف ان کرننا چاہتا ہوں۔ تم جو کچھ بھی ہو، جو بھی تمہارا بیگ گراونڈ ہے، مجھے اس سے لوئی مطلب نہیں ہے۔ اب اسے جو کچھ کیا، اسے بھگت لیا۔ رابرٹ جینو، پپاس اور سورن عالم سے مجھے صرف اسی حد تک دلچسپی تھی جس حد تک کسی پر سکون شخص کو انسانیت سے ..... سکتی ہے گر تم جانتی ہو گی کہ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اس پر براؤقت آتا ہے تو وہ پہلے اپنی جان بچانے کی تدابیر کرتا ہے۔ اس وقت اسے کسی دوسرے کا ہوش نہیں رہتا لہذا میں ان لوگوں کے بارے میں اب کسی تردید کا شکار نہیں ہوں۔ انسوں نے جو کچھ کیا، اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ ایں کون تھی، وہ پراسرار کیوں تھی، کیوں ہے، کیا چاہتی ہے مجھے اس بات سے بھی اب کوئی دلچسپی نہیں رہی ..... مجھے تم سے قطعی لفڑی نہیں ..... تم نے میرے ساتھ جو کھلیل میرٹھ میں کھیلا تھا، وہ بھی نادانشکی میں ہوا۔ آج مجھے پتا ہوتا کہ وہ فرحت نہیں تم ہو تو یہ کبھی نہ ہوتا۔ اب تم ان زنجیروں کو لے جائیں۔

”تمہارے انسانوں سے تعلق ہے؟“ میں نے اکھڑ لجھے میں پوچھا۔

”تمہاری حد تک۔“ اس نے اداسی سے مکراتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے اس کے چہرے پر پسلے کرب اور پھر طیش محسوس کیا۔ میں چپ چاپ اسے رکھ رہا تھا۔ میں واقعی اب اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا ..... وہ کچھ دیر بیٹھی بیڑی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ آنکھوں کے راستے کوئی گرم سیال سا میرے بدل میں اترتا ہے جا رہا ہے۔ میرے بدن میں تپش بڑھ گئی تھی۔ میرے روگنگے کھڑے ہو رہے تھے۔ میرا سر دھیرے دھیرے چکرانے لگا تھا مگر میں نے اپنے آپ کو ذرا بھی گزور ثابت نہیں کیا۔ اسی طرح آنکھوں میں آنکھیں گاڑے بیٹھا رہا .....“

”ضیاء! کس نبیا در میں تبدیلی لانا کتنا کشخن کام ہے مگر تم نے وہ کام سرانجام دیا مگر اب ..... اب تم مجھے کسی بگولے کی طرح بیچ میدان چھوڑ رہے ہو ..... جانتے ہو تو کہ بگولہ جہاں سے گزرے گا، وہاں تباہیاں بھی پھیلا سکتا ہے۔“

وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی مگر میں پھر گیا۔ ”کیا تم مجھے دھمکی دے رہی ہیں؟“

”نہیں!“ اس نے اس بار پاش بلکہ سفاک لجھ میں جواب دیا۔ ”تم تو نام ہو تباہی اسوت کا اور سفاکی کا اس لئے کبھی ایسی دھمکی دینے کی کوشش نہ کرنا۔“

”حقیقت سے آگاہ کر رہی ہوں ..... تم جان چکے ہو کہ اس کائنات میں ایسیں میرے نام سے منسوب ہیں۔“

”میں کچھے عقائد نہیں رکھتا زیوسا!“

”یہ عقائد کچھے نہیں۔ انسان نے اسے مختلف تجربیں دے کر اپنی بچان کے لئے بہرستہ، ایک طریقہ بنا لیا ہے ..... انسان اپنے اندر ایک پوری کائنات ہوتا ہے۔ اس کے پڑھنے، اپنے آپ کو مطمئن کرنے، اپنی ذات کو سیئشن کے لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہے۔ مرکزیت بنانا پڑتی ہے۔ انسوں نے یہیشہ ایسا ہی کیا ..... یہ جانے بغیر کہ وہ اپنی بحیثیت میں کسے الزام دے رہا ہے۔“

”تمہارے انسانوں سے تعلق ہے؟“ میں نے اکھڑ لجھے میں پوچھا۔

”تمہاری حد تک۔“ اس نے اداسی سے مکراتے ہوئے جواب دیا۔

”نمیں.....! تمہیں ہر انسان سے دیکھی ہے۔ اس کی تباہی سے، اس کی موت سے، اس کی پریشانیوں سے، لیکن تم یہاں سے چلی جاؤ..... اور کبھی لوٹ کر ادھر ز آتا..... اور ہاں یہ لئتی جاؤ..... اپنی نحوست جو تم نے ان زنجیروں اور ان کٹڑیوں کے ذریعے میرے خاندان میں پھیلائی تھی، میں اسے اب بالکل برداشت نہیں کر سکتا..... میں نے اپنے سرمانے رکھی الماری سے وہ زنجیریں نکال کر اس کے سامنے پھینک دیں۔“  
وہ کھڑی ہوئی..... اس نے ایک بھرپور نگاہ میرے سرپا پر ڈالی، اس کی نگاہ میں حرست بھی تھی اور دکھ بھی۔

”اور سنو!“ یہ چولا بدلتے ہو۔ میں فرحت کے روپ میں تمہیں کبھی دیکھنے کا خواہش نہیں ہوں۔ میں فرحت سے پیار کرتا ہوں۔ میں اس کی سادگی پر اس سے عقیدت رکھتا ہوں اس لئے یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم اس کا معصوم روپ دھارو۔“  
میرے جملوں نے جانے اس پر کیا اثر کیا کہ اس کا چھوڑ لال جھبھو کا ہو گیا۔  
اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ نیالے رنگ کے دھویں میں تبدیل ہو کر میری نگاہوں سے او جھل ہو گئی۔ میں سن بیٹھا رہ گیا..... ما ذہن ہی نہیں، جسم بھی شل ہو گیا..... میری چھٹی صس مجھے خبردار کر رہی تھی کہ اب کچھ نہ کچھ بہت غلط ہونے والا ہے۔ میں نے چاروں طرف دیکھا، وہ جاتے جاتے زنجیریں لے گئی تھی۔ مجھے ایک گونا اطمینان کا احساس بھی ہوا مگر بے چینی، گھبراہٹ میں تہذیب ہوتی جا رہی تھی۔ میں بے سده پلٹک پر لیٹ گیا۔

”ضیاء!“

اچانک منے دادا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”جی منے دادا!“

”بیٹے! خیریت تو ہے..... آج تم سارا دن کمرے سے نہیں نظر.....“  
میں نے اپنا تمام قصہ انسیں سنایا وہاں سے جہاں سے میں نے اماں کے کمرے میں جھانکا تھا۔ یہاں تک جب میں نے زیوسا کو بے حیثیت کر کے چلے جانے کو کہا تھا۔ دادا چپ چاپ بیٹھنے سب سنتے رہے۔ ان کے چرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ نگاہوں بڑی بے چینی تھی..... بڑا اضطراب تھا۔ میرے خاموش ہونے پر وہ کھڑے ہو گئے“

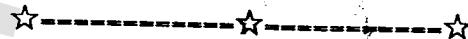
کمرے میں شلنے لگے.....  
”منے دادا!“ میں نے کچھ دیر خاموش رہ کر اپنی طرف متوجہ کیا۔  
”تم نے اچھا نہیں کیا ضایع.....! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“  
انہوں نے جس خوف زدہ لبجے میں جواب دیا اس نے میرا حوصلہ بھی پست کر دیا۔  
میں جو پہلے ہی اپنے اندر عجیب سی پُرمودگی اور خوف محسوس کر رہا تھا، مزید خواں باختہ ہو گیا۔ مگر میں اپنے خوف کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے کہ اس کا منے دادا پر کچھ اچھا اٹر نہیں پڑتا اس لئے میں نے اپنے انداز کو مضبوط بنایا کہ ”منے دادا! آپ کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ میں مجبوب ایمان رکھتا ہوں۔ زیوسا کا کوئی وجود نہیں ہے۔ یہ سب ہندوؤں کی شعبدے بازی ہے اور کچھ نہیں.....“

”اس دنیا میں اسرار بھرے پڑے ہیں ضایع.....! ابھی تک یہ طے نہیں ہو پا یا کہ دنیا بھر میں ہونے والے پر اسرار واقعات کا اصل محرك کیا ہے۔ ہم کائنات کے بارے میں ابھی کچھ بھی نہیں جان پائے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ شعبدے بازی ہوتی تو عقائد کے تحفظ کے لئے قویں تباہ نہ ہو رہی ہوتی..... زیوسا اسی کائنات کا ایک اسرار ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے بہر طور تم نے یہ اچھا نہیں کیا.....“  
میں جنمبلہ گیا۔ منے دادا میرا حوصلہ بڑھانے کی بجائے اور پست کر رہے تھے۔ ”تو کیا کر رہا؟“ میں نے چڑ کر جواب دیا۔ ”کیا اپنے آپ کو زیوسا کے حوالے کر دیتا، اسے وہ سفاک کھیل کھیلنے دیتا جو وہ برسوں سے کھیل رہی ہے؟“  
”تم شالی بیبا کی ہدایت پر عمل کرتے ضایع.....! زنجیریں اسے دینے کی بجائے دسلا کو دے کر تو دیکھتے، ہو سکتا تھا کہ تم پر سکون زندگی گزار پاتے..... اب..... اب جانے کیا ہو..... میں خوف زدہ ہوں۔“

”کیا ہو گا اب؟“ میں بھر گیا..... ”کیا کرے گی وہ؟“ میں چیخ اٹھا۔ یہ میرے اندر کا انتشار تھا جو بھٹی ہوئی آواز میں ڈھل کر باہر آ رہا تھا..... منے دادا چونک اٹھے۔  
انہوں نے مجھے غور سے دیکھا۔  
”ضیاء!“

”جی میں..... منے دادا.....! چلے جائیں پلیزا، مجھے کچھ دیر کے لئے اکیلا ہجھوڑ دیں۔“ میں نے روہانی آواز میں کہا۔ میرا گلا گزندھ گیا تھا..... حق نہیں ہو گیا

تھا۔ منے دادا تیزی سے باہر چلے گئے۔ میں دونوں ہاتھوں میں چکراتے ہوئے سر کو تھانے و پین بیٹھا رہ گیا مگر پھر میں اچھل کر باہر بھاگا کیونکہ عصمت آپا کی چیزوں سے سارا اگھر گونج اٹھا تھا.....



کمرے سے باہر کا منظر انتہائی خوفناک تھا۔ عصمت آپا چیخ صحن میں پڑی تڑپ رہی تھیں اور ان کے جسم پر ہزاروں شہری مکڑیاں ریک ہیں۔ طیب، منے دادا، دادی اور منی دادی سب انتہائی کرب کے عالم میں چیخ رہے تھے..... عصمت آپا کے جسم پر میرے دیکھتے ہی دیکھتے خون کی لکیریں بننا شروع ہو گئیں اور پھر مجھے بھی جیسے ہوش ہی نہ رہا..... میں بھاگ کر عصمت آپا کے قریب بیٹھ گیا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے ان کے جسم پر رینگنے والی مکڑیوں کو جھٹکنا شروع کر دیا۔ جبکہ طیب اور منے دادا چیخ چیخ کر مجھے ہٹ جائے کو کہہ رہے تھے مگر اس دوران میرے حلق سے مارے غئے، طیش اور غم کے بیب و غریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ مجھے صرف عصمت آپا کی چیزوں کی آوازیں سنائیے رہی تھیں۔ میں ایں کو بھی گالیاں دے رہا تھا زیوسا کو بھی اور و تسلما کو بھی۔ ایک بیانہ تھا، شور تھا، تسلکہ تھا جو ہمارے آنکن میں تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ باہر سے کوئی پوچھنے نہیں آیا کہ کیا ہو گیا..... میں نے عصمت آپا پر نگاہیں گاڑی ہوئی تھیں۔ کچھ ان مکڑیوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

یہ سارا ہنگامہ شاید گھنٹہ بھر جاری رہا یا اس سے بھی کچھ زیادہ عرصہ، مجھے یاد نہیں۔ یاد ہے تو صرف اتنا کہ میں نے عصمت آپا کے جسم سے ساری مکڑیاں جھاڑ دی تھیں۔ وہ زخمی ضرور تھیں، مگر ایسی نہیں جیسا بہتر تھا یا بڑی بو۔ وہ تو زندہ ہی نہ بچے تھے۔ ان کا جسم پورا کا پورا ادھڑ چکا تھا مگر عصمت آپا کے جسم پر باریک سوراخ ہو گئے تھے اس سے خون باریک لکیریوں کی صورت میں بسہ رہا تھا۔ میں نے ہمپتال لے جانا چاہا تو منے اسے مجھے روک دیا۔ ان کا کہنا بھی نہیک تھا ذا کمزز کو ہم کیا بتاتے۔ پسہ ہی میرٹھ کے سامنے خوف کی علامت بن چکے تھے، اب دہلی میں ہمارے لئے چہ میگویاں شروع ہئے۔ میرٹھ والے تو بہر حال ہمیں پشتون سے جانتے تھے۔ دہلی میں ہزار رنگ و نسل

کے ساتھ بمبی جانے کا فیصلہ کر لیا مگر عصمت آپا کو اس حال میں چھوڑنا بھی مجھے گوارا نہ تھا۔ ہم جو کچھ کر رہے تھے، اندازے کی بناء پر کر رہے تھے۔ میں ایک دو روز رک کر انسن صحت مند دیکھنا چاہتا تھا تاکہ اطمینان ہو جانے کے بعد جاسکو۔

وہ دو دن میں بالکل ٹھیک ہو گئیں۔ اب انسن خوف بھی نہیں تھا۔ شاید اس نے کہ وہ فطری طور پر سخت طبیعت کی واقع ہوئی تھیں۔ مٹے دادا نے اماں اور دادی کو سمجھا دیا کہ ضیاء ایک بابا کی تلاش میں جا رہا ہے جن سے مٹے کے بعد ہم ان چکروں سے نکل آئیں گے..... پتا نہیں، وہ مطمئن ہوئیں کہ نہیں البتہ انہوں نے مجھے جانے سے نہیں روکا۔ طیب نے جلد ہی بمبی جانے کی تیاری کر لی۔ مٹے دادا نے بی جان کو فوری طور پر دل آجائے کے لئے لکھ دیا۔ میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اگر اس بار خالہ بی جانے کی فمد کریں تو سختی سے انکار کر دیجئے گا یا پھر ان سے کہہ دیجئے گا کہ وہ ایکلی چلی جائیں فردت اور بی جان نہیں جائیں گی۔

☆-----☆-----☆

ہم بمبی روانہ ہوئے تو میرا زہن بالکل خالی تھا۔ طیب بھی کسی سوچ میں غرق تھا۔ ہم نے تین میں بوجی بک کرالی کھی۔ رش بھی اتنا نہیں تھا اس لئے کوفت بھی نہیں ہو رہی تھی۔ بوجی میں صرف میں اور طیب میں۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا ہمیں پھر اسی کو سختی میں جا کر رہنا چاہئے۔ میں نے طیب سے پوچھا۔ اس نے سختی سے انکار کر دیا اور سیدھا گھر پلے کو کہا۔ میں زہرہ اپا کی ہولو طبیعت کی وجہ سے زیادہ پریشان تھا۔ طیب نے کوئی اور انتظام کرنے کا وعدہ کیا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے خدا سے ہمت اور حوصلے کی درخواست کی۔ شالی ببابا کا دیا ہوا تعویذ اب بھی میرے گلے میں تھا۔ میں نے بے خیال میں اسے ہاتھ میں لے لیا اور مختلف دعائیں کرتا رہا۔ ہم سویرے دہلی سے نکلے تھے۔ پوری رات اور پورے دن کا سفر تھا۔ طیب بھی لیٹ کر چھٹ کو تک رہا تھا۔ جانے اس کے تھن شیں کیا تھا۔ اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ضیاء!“ اس نے مجھے پکارا۔

”ہوں!“ میں نے آنکھیں کھوں دیں۔

”ضیاء.....! میں ایک شخص کو جانتا ہوں۔ پتا نہیں، وہ کیا ہے گمراہا مجھے یقین ہے کہ وہ بھی پراسرار قوتون کا مالک ہے۔“

کے لوگ تھے۔ بات جانے کیا سے کیا بن جاتی اور پھر عصمت آپا نے مجھے تسلی دی کہ ”اندر رونی طور پر اب ایسی تکلیف محسوس نہیں کر رہی ہیں کہ تشویش ہو۔ بقول ان کے مکریوں کو دیکھ کر انہیں دہشت زیادہ تھی اور یہ خیال کہ اب موت سامنے صرف پھر سانسوں جتنی رہ گئی ہے بے پناہ خوف زدہ کرنے والا تھا اس لئے وہ اس بری طرح تھیں تھیں۔

میں تو تھکن سے بے حال ہو کر پڑ گیا۔ طیب حکیم صاحب کو بلا لایا۔ حکیم صاحب سے انہوں نے کیا کہا، مجھے خبر نہیں مگر حکیم صاحب نے ہمیں یہ کہہ کر حیرت زدہ کر دیا کہ یہ اسکن الرجی ہے۔ انہوں نے ہرے رنگ کا ایک لیپ سا بنا کر دے دیا کہ اسے ان جھگوں پر لیپ کیا جائے جہاں سوراخ بن گئے ہیں..... کچھ دوائیں کھانے کو بھی دے دیں۔ جنہیں کھا کر عصمت آپا کو گھری نیند آگئی۔ اماں نے ان کے زخموں پر مردم اپدیا..... عصمت آپا تو سکون سے سو گئیں مگر سارا گھر بے پناہ پریشان تھا۔ خاص طور پر میں۔

منے دادا کے بقول زیوسانے مجاز سنجھال لیا تھا اور یہ اس نے چھوٹا سا نمونہ دکھانا تھا۔ یہ گنگ اس سے بھی زیادہ خوفناک شکل اختیار کر سکتی تھی۔ بات ان کی بھی نیک تھی لیکن ماضی پر نگاہ ڈال کر مجھے یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ میں جمال موجود ہوں گا زیوسا صرف وہاں خوف و ہراس پھیلائے گی۔ اب گھر والوں کو اس اذیت سے نجات دلانے کا صرف ایک ہی راست تھا کہ میں دہلی بھی چھوڑ دوں۔ میں نے منے دادا سے بت کی۔ طیب بھی ساتھ تھا اور کافی سنجیدگی سے گفتگو میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ میری بات سے متفق تھا۔ میں نے اور طیب نے منے دادا کو بھی قائل کر لیا۔ اماں اور دادی کو سنجھانہ ازا کا کام تھا۔ انہوں نے مجھے اجازت بھی دے دی اور و تسلما کے پاس جانے کا مشورہ بھی۔ گرائب میں آزمائی ہوئی کو اور نہیں آزمانا چاہتا تھا۔

و تسلما مجھے ڈھونگ لگ رہی تھی۔ مطلبی جادو گرفنی..... میز دل بالکل اپنے ہو گیا تھا۔ فرحت اور بی جان وغیرہ کی طرف سے بھی پریشان ہو گئی تھی۔ زیوسا جان گئی تھی کہ فرحت میرے لئے کیا حیثیت رکھتی ہے، مجھے خدا شہ تھا کہ وہ اسے نقصان پہنچانے کو کوشش ضرور کرے گی۔ میں نے اپنے اس خدا شہ کا اظہار منے دادا سے بھی کہ انہوں نے تسلی دی کہ وہ ان لوگوں کو آج ہی خط لکھ کر یہاں بلوالیں گے۔ میں نے بھی

میں نے برا سامنہ بنا�ا اور کما تھا کہ شاید میں کبھی اس کے پاس نہ آؤں گر ضیاء! جب وہ چلا گیا تو میرے نیپالی دوست نے اس کے بارے میں مجھے ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ میں حیرت زده رہ گیا۔ خیر، میں نے اس کی باتوں کا لیقین تو نہیں کیا تھا مگر جب میرے دوست کے حالات اس شخص کے مطابق صرف تین دن میں حیرت انگیز طور پر بدلتے تو وہ میرے ذہن میں چپک گیا۔ میرے دوست کو مالی پریشانیاں تھیں۔ اگلے ہی روز اس کی لازمی نکل آئی۔ اس کی چھوٹی بیٹی مذدور تھی غالبًا پولو ٹھا۔ وہ ایک ہفتے میں بالکل ٹھیک ہو گئی۔ ایک چھوٹی سے کمپنی میں وہ پرو ائزر تھا۔ اسی کمپنی نے اسے سینجھ بنا کر کینڈا بیچ دیا۔ یہ سب کچھ صرف ایک ہفتے کے اندر اندر ہو گیا تھا۔

وہ ہواں میں اڑ رہا تھا۔ یہ سب ہو جانے کی خوش خبری سنانے اور آکا بگایا کا شکریہ ادا کرنے کے لئے وہ جگہ جگہ مجھے لئے انسیں تلاش کرتا پھر اگر وہ نہیں ملے۔ وہ کینڈا چلا گیا۔ مجھے تمہارے گیا کہ جب بھی آکا بگایا میں تو ان کا شکریہ ادا کر دوں۔ اس کے جانے کے اگلے دن ہی آکا بگایا مجھے مل گیا۔ وہ میں اسی جگہ ملا تھا جہاں ہم پہلی بار ملے تھے اور جہاں میرا دوست اور میں انسیں دونوں ڈھونڈتے پھرے تھے۔ میں نے اسے دوست کا پیغام پہنچتا تو اس نے کمال تعافل سے مجھے دیکھا تھا اور بولا تھا۔

”ضورت نہیں ہے، میں پٹ کر نہیں دیکھتا اور سنو! جب تم مجھے تلاش کرو گے تو میں اسی جگہ ملوں گا۔“

میں نے جواب دیا تھا کہ مجھے ایسے تماشوں سے دلچسپی نہیں ہے۔ ضیاء! حالانکہ تین کرو، اس کے ان شعبدوں نے اگر وہ شعبدے ہی تھے تو میرے دوست کی زندگی کی کلائپٹ دی تھی۔ اگر تم اس کا گھر بار دیکھ لو تو لیقین نہ کرو کہ یہ شخص صرف سال بھر پہلے کچھ لگاں تھا۔ اس کے گھر پر بیماریوں اور مفکلی کی خوست برستی تھی پھر میں جلد ہی اسے بھول گیا۔ آج، ابھی بھی مجھے اس کا خیال آگیا۔ ضیاء! مجھے لیقین ہے کہ ہم کامیاب ”جائیں گے۔“

وہ اسی جوش و خروش سے بول رہا تھا۔ میں نے اس کی پوری بات سنی تو تھی مگر ضیاء کے مجھے اس کی طرح کسی قسم کا لیقین نہیں ہوا تھا۔

ضیاء! وہ علاقہ اشیش سے اتنا دور بھی نہیں ہے۔“

”ہوں.....!“ میں نے سرسری طور پر سرہلا یا۔

”کون ہے وہ؟“ میں نے بے دلی سے پوچھا۔

”وہ آکا بگایا ہے۔“

”کیا؟“

”آکا بگایا۔ یہ نام ہے اس کا۔“ طیب کے چہرے پر اب جوش سے سرفہی پھیل چکی تھی۔

”یہ کیا نام ہے؟ کماں کا باشندہ ہے؟“

”یہ مجھے نہیں پتا۔ بس ہم اشیش سے سیدھا اس کے پاس چلے جائیں گے۔“

”یہ اچانک کماں سے پیدا ہو گیا؟“ میں نے اس کا جوش و اضطراب دیکھ کر پوچھا۔

”یہ اچانک پیدا نہیں ہوا بلکہ میں بھول چکا تھا۔ اس سے میری ملاقات ایک مندر اور مسجد کے درمیان ہوئی تھی۔“

”کیا تم نہیں میں ہو یا بغیر نہیں کے بک رہے ہو؟“

”ہاں.....! نہیں.....! وہ بھندی بازار میں جو مسجد ہے، اس کے درمیان کنارے پر میں روڑ پر ایک چھوٹا سا مندر بنتا ہوا ہے۔ میں ایک روز مسجد سے نکل رہا تھا کہ میرا ایک دوست مل گیا جو نیپال سے آیا ہوا تھا۔ ہندو ہے۔ اسے مندر میں ناریل چھوڑتا تھا۔ میں اس کے ساتھ مندر میں جانے لگا تبھی ایک محبوب المحسوس آدمی مجھے سے نکل گیا۔ اسے میرا یہ دوست جانتا تھا۔ غالبًا اسے کوئی کام تھا تھا اس شخص کے ہاتھ چومنے لگا اور مفہیں کرنے لگا کہ کچھ دیر رک جائیں۔ میں ان کے ساتھ وہاں ٹھہر گیا۔ میرا دوست چند منٹ بعد لوٹ آیا اور پھر انیس لے کر ہم ایک ہوٹل میں بیٹھ گئے۔ وہ عجیب غلیظاً آدمی تھا۔ اس کے شانے چوڑے، کردن مضبوط اور جبڑا بھاری تھا۔ اس کی آنکھیں چھوڑ بھر بالکل سرخ تھیں۔ وہ عجیب سے لمحے میں بات کر رہا تھا۔ مجھے اس کی شخصیت بتتی محسوس ہوئی تھیں۔ وہ عجیب سے بات کر رہا تھا۔ مجھے اس کی وجہ سے بات کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک میں نے اسے محض اپنے دوست کی وجہ سے برداشت کیا۔ وہ بار بار دیکھتا اور مسکرا ترا تھا پھر جب وہ جانے لگا تو مجھ سے بولا۔

”تم..... تم ظاہر کو دیکھتے ہو، باطن کو دیکھا کرو۔“ پھر کچھ دیر بعد جاتے جاتے میری طرف مڑ کر بولا۔ ”اس دنیا میں کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں ان لوگوں ساتھ دیتا ہوں جو مجھ سے الجھ جاتے ہیں۔ تم چلے آتا۔“

نہیں سے اتر گیا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس دکان کے عین سامنے کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ایک دکان تھی جو بند تھی اور اس کے چپو ترے پر ایک انتہائی غایلٹ شخص سکرا ہوا لیٹا ٹھا۔ اس کے پڑے چیخڑوں کی شکل میں اس کے جسم پر لٹک رہے تھے۔ بالوں کی لشیں بنی ہوئی تھیں۔ وہ غالباً سویا ہوا تھا۔ طیب اس شخص کے نزدیک پہنچا

اور اسے چھوا۔ وہ شخص اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں ان لوگوں سے کافی فاصلے پر تھا۔ میں نے نیکی مڑوا کے اسی جانب کھڑی کروالی..... اب میں ان کے بالکل قریب تھا۔ میں نے دیکھا، وہ شخص مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بلاکی وحشت اور چہرے پر تمباہٹ تھی۔ مجھے جانے کیوں اس کے نقوش مانوس لگے مجھے یاد نہیں آسکا کہ میں نے اسے پسلے کب اور کہاں دیکھا ہے۔ وہ پاگلن تھا، فقیر تھا، جانے کہاں کہاں پھرتا ہو گا اور کب میری نظر اس پر پڑی ہوگی۔ یہ سوچ کر میں سیدھا ہو گیا۔ اب میرے کان طیب کی آواز پر لگے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔

“آکا باگیا! آپ نے کہا تھا کہ تمہیں ضرورت بری تو میں پیمان مل چاؤں گا۔”

”مجھے پتا تھا، میں یہاں اسی لئے آگیا..... کل تو اسے لے کر اندر چلے آ جاؤ..... ریل کی پڑی کے نیچے، ندی کی طرف..... کالے مندر میں چلے آئا..... اور اسے بتا دیا زندگی دان مانگتی ہے۔ اچھا اچھا، برسے کے بعد آتا ہے..... مرکز سے ہٹ کر جینا محال ہوتا ہے۔ انسان کا مرکزہ اس کے کردار کا ستون ہوتا ہے۔ طرم خلیل دھری رہ جاتی ہے۔ دیوی دیوی طاقت استعمال کرنا جانتے ہیں۔ انسان تو بس ہاتھ پاؤں پلاٹا کے..... بازمیں، طلامیں سے.....“

اس کی باتیں بے ربط تھیں مگر مجھے پراسرار محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے کن ایکھوں سے دیکھا وہ میری ہی طرف دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”حسن طبیعت میں غور پیدا کرتا ہے اور غور کردار میں خلا بنا دیتا ہے۔“

طیب کی سمجھ تو دیے بھی مولیٰ تھی وہ بولا۔ ”مگر میں اسے لے کر کمال آؤں۔ وہ نظر نہیں ہے۔ پریشان ہے۔ اس کا اعتماد انھوں گے.....“

"وہ اعتماد کرنا جانتا ہی نہیں..... خود کو عقل کل سمجھتا ہے۔ یہاں کوئی عقل کل نہیں۔ زمینوں کے نیچے بھی اسرار ہے اور آسمانوں کے اوپر بھی..... باقی سب خلا ہے..... صدیوں کا حساب رکھنا اور حساب پے لئے لگانا اور تجویں سے پل نکل کر ہتھیلی

وہ اٹھ کر میرے پاس آبیٹھا۔ ”ضیاء! ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرتا ہی ہو گا نا! ہم اس معاملے کو نہ تو یونہی چھوڑ سکتے ہیں نہ کوئی حل ہے ہمارے پاس۔ تم و تسلما سے ملتا نہیں جاتے۔ شالی بیا سے تمہارا اعتماد اٹھ گیا ہے۔ اب اسے آزمائنے میں کیا حرج ہے؟“

”ہاں، ہرج تو کوئی نہیں ہے۔ تم جا کر مل لیتا۔“  
 ”ٹھیک ہے، میں پسلے ان سے پتا کر لوں گا پھر تمہیں لے چلوں گا۔“ وہ واپس اپنی سیٹ پر جا بیٹھا گر کراب اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اگر اس وقت اس شخص سے مروعہ نہیں ہوا تھا تو اب سال بھر بعد بڑی طرح اس سے متاثر تھا۔ میں اب بھی کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ میں یوں لگ کر رہا تھا کہ میں نے لاشعوری طور پر خود کو حالات کے حوالے کر دیا ہے۔ شاید میں حوصلہ ہار گیا تھا۔ مجھے اپنی زندگی بالکل بے مقصد اور فضول لگ رہی تھی بلکہ ایک ایسا تماشا جیسا مداری سڑکوں پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ لوگ تاسف کرتے ہیں یا تماشیاں بجا کر چلے جاتے ہیں اور کچھ ہی دنوں میں ان تمام تماشوں اور شومنا کو ہٹا جاتے ہیں۔ میں، نئے ٹھال، تھا۔

شعدروں کو بھول جاتے ہیں۔ میں نڈھال تھا۔

”ایک منٹ.....! ٹیکسی روکو!“

میں نے چونک کر دیکھا۔ یہ طیب کے گھر کا علاقہ نہیں تھا بلکہ ہم بھندی بازار میں مشہور بھیل پوری کی دکان کے سامنے گھرے تھے۔  
”کمال آگئے تم؟“ میں نے طیب سے پوچھا گھروہ ”ایک منٹ!“ کہ کرتیزی سے

”صلب! آپ لوگ کو دیر ہے تو اتر جاؤ۔“

اب میں نے طیب کو آواز دی۔ وہ بڑی راتا ہوا چلا آیا۔ نیکی میں بیٹھتے ہی بولا۔  
”بار! بڑا بیچیدہ آدمی ہے۔ پتا نہیں، کیا کیا کہہ رہا تھا۔“

”مجھے پتا ہے کہ کیا کہہ رہا تھا۔“ میں نے اس کی جانب دیکھ کر کمل۔ نیکی والے نے ٹرن لیا اور ہم گھر کی طرف چل پڑے۔ راستے میں طیب نے بتایا کہ کل ہم اس سے لئے اندر ہیری جائیں گے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ شخص اب میرے لئے بھی دلچسپ ہو گیا تھا۔ اس کی باتیں بڑی پڑا سرار تھیں، پرمخت تھیں۔ میں اس سے ملنا چاہتا تھا پھر اس کے نقوش جو شہ معلوم کیوں مجھے جانے پچانے لگ رہے تھے اب کسی کائنے کی طرح میرے ذہن میں چھپ رہے تھے۔ یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ میں اسے جانتا ہوں، کیسے، یہ یاد نہیں تھا۔

ہم کچھ دیر بعد گھر پہنچ گئے۔ زہرہ آپا مجھے دیکھ کر حسب سابق ہوا گئیں۔ پندرہ تک صرف یہ پوچھتی رہیں کہ گھر میں سب خیریت ہے۔ میں کیوں آیا ہوں؟ عصمت آپا کیسی ہیں، فرحت اور بی جان خیریت سے ہیں کہ نہیں۔ منے دادا، منی دادی کی صحت کیسی ہے، غیرہ وغیرہ۔ طیب نے اتنی دیر میں کئی فون گھماڑا لے تھے۔ وہ غالباً رہائش کا بذوق سست کر رہا تھا۔ میں اسے صاف طور پر کہہ چکا تھا کہ میں کسی بھی حال میں ناصر چاہا اور زہرہ آپا کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ زہرہ آپا سے میں کہہ چکا تھا کہ میں دفتری کام کی وجہ سے آیا ہوں اور یہاں نہیں بلکہ دفتر کی جانب سے انتظام کئے گئے گھر یا ہوٹل میں رہوں گا۔ ناصر چاہنے لائقی سے سب کچھ سن لیا۔ طیب کو لمبا چوڑا لیکھ دیا اور چلے گئے۔ ہم نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلتے۔ طیب کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ قیام کا کوئی معقول انعام کر چکا ہے۔

میں نے فراغت پاتے ہی طیب سے پوچھا۔ ”کیا رہا؟“

”میرا ایک دوست خوالدار ہے۔ باندرے میں رہتا ہے۔ وہیں اس کی ڈیوٹی ہے۔“  
”تمانے کے احاطے میں رہتا ہے، کیونکہ اکیلا ہے اس کا ایک بغلہ باندرے ہی میں ہے،“  
”ہم انتظام ہو گیا ہے۔ اس کے نچلے حصے میں کوئی پروفیسر قیام پذیر ہیں۔ شام کو ہمیں وہاں نشانہ جانا ہے۔ میرا دوست گوبال بھی وہیں مل جائے گا۔“

میں مطمئن ہو گیا۔ کچھ دیر آرام کرنے کے دوران میں، میں زہرہ آپا کی تسلی کر رہا

پر رکھنا آسان نہیں ہے مورکھ! یہ تماشا بھی نہیں ہے۔ یہ سب اعداد ہیں اور اعداد کا کمل ہے..... اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تک سب ایک ہے..... ایک دوسرے سے مل کر طاقت نہتا ہے..... اندر ہر ابدات خود اسرار ہے، روشنی بھی..... رنگ بھی اور ہوا بھی..... سب مربوط ہیں..... مندرجہوں کے اندر اور مسجدوں کے اندر، چچ میں اور گردوارے میں کوئی چیز مختلف نہیں..... صدیوں کا انسان ذرا سی تبدیلی پر نازار ہے، بے حیثیت کو حیثیت دے دینا بھلا انسان کا کام ہے؟“

وہ عجیب سے انداز میں بول رہا تھا۔ اس کا کہا ہوا حرف حرف میں اپنے ذہن میں اتار رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ مجھے سنانے کو اونچے لجھے میں بول رہا ہے اور وہ جو کچھ بھی کہہ رہا سب باعثی ہے۔ وہ ایک ایسی زبان بول رہا تھا جو اس طرح کے لوگ عام طور پر نہیں بولتے۔ وہ حلے سے کسی خاص مذہب کا پیر و کار لگتا تھا، نہ چہرے سے..... اس نے جتنی زبانوں کے الفاظ ان جملوں میں بولے تھے، وہ سب بڑی صفائی سے بولے تھے۔ لگتا تھا جیسے وہ صحیح ادا۔ گلی سے واقف ہے۔ اب بھی طیب کی کچھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ پھر پوچھ رہا تھا۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، ہم..... ہمارا خاندان ان ایک مصیبت میں جاتا ہیں..... میں آپ کی مدد چاہتا ہوں..... کیا آپ کچھ دری میرے ساتھ گزار سکتے ہیں؟ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں۔“

”لیمب؟“  
میں نے آواز دے دی۔ وہ انتہائی بے وقوفی کی حرکت کر رہا تھا۔ ہم اسے، اس حلے کے شخص کو لے کر گھر نہیں جاسکتے تھے۔ ناصر چاہا ہمارے کان کھا جاتے، زہرہ آپا پورے گھر کو سرپر اٹھا لیتیں۔ گھر کے لوگ الگ ہم سے الجھ جاتے۔ طیب نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا اور پھر ان سے بولا۔

”آکا باگیا! مجھے بتائیے۔“

اس شخص نے سر گھما کر اسے دیکھا پھر مسکرا یا اور بولا۔ ”تیری کچھ میں کچھ نہیں آتا؟ اندر ہری آ جاتا کمل۔ ریل کی پڑی کے نیچے، ندی کے پاس۔“ اور اتنا کہ کہ اس نے سر کو کندھوں پر لٹکی چادر سے ڈھانپ لیا اور سیدھا بیٹھ گیا۔ اکڑ کے پھر طیب بولتا رہا مگر اسے کوئی جواب نہیں ملا اب نیکی والا بھی الجھ گیا اور بولا۔

شاید آج میں آپ کو یہ داستان سنانے کے لئے زندہ نہ ہوتا بلکہ گپال ہی کے ہاتھوں  
گرفتار ہو کر پھانی کے تختے تک پہنچ چکا ہوتا۔

یہ وہاں قیام کے چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ رات کا وقت تھا۔ گپال شراب کی بوتل  
شام ہی کو لے آیا تھا۔ میں نے طب کو اس کے جانے کے بعد سختی سے کہ دیا تھا کہ وہ  
اپنے آپے میں رہے، میری دوستی اور بے تکلفی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ یہ نہ بھولے کہ  
میں اس سے عمر میں بڑا ہوں اور میں دادا سے لے کر ناصر پچا اور طاہر بھائی تک کو دھوکے  
میں نہیں رکھ سکتا۔ نہ ان کے اعتناد کو خاک میں ملانا چاہتا ہوں۔ اس نے میری بات سن کر  
کئی قسم کے بے بے منہ بنائے تھے بلکہ یہ سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ ایک  
آدھا پیگ کپینے سے کچھ نہیں ہوتا، بس وقت اچھا گزر جاتا ہے مگر پھر میرا مودہ کیجئے کہ اس  
نے گفتگو کا موضوع ہی بدلتا تھا۔

گپال رات کو آئے کو وعدہ کر گیا تھا۔ شاید طب کی وجہ سے وہ مجھے بھی کوئی  
عیاش آدمی سمجھا تھا۔ رات سازھے نوبے کے وہ لوٹا تو میں اس کے ساتھ ایک خوب صورت  
اور اسماڑت لڑکی کو دیکھ کر کافی خجل ہوا تھا۔ گپال غالباً کمیں اور سے بھی ڈرکٹ کر کے آیا  
تھا۔ وہ لڑکی بھی نئے میں محسوس ہو رہی تھی۔ گپال نے ہمارا تعارف کرایا تو اس نے بڑی  
بے تکلفی سے ہاتھ پڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ میں نے مجھتے ہوئے ہاتھ ملایا تھا مگر طب  
پلے ہی اپنے ہاتھ پتلوں سے رگڑ کر صاف کر پکا تھا مگر وہ لڑکی جس کا نام انتی تھا، میرا ہاتھ  
تھا کہی تھی۔ مجھ سے باتیں کرتی رہی اور میری تعریف بھی اس نے بر ملا کر دی۔ اُس  
نے کہا تھا۔

”گپال! تمہاری کمپنی میں اب اتنے لوگ بھی آگے ہیں۔ مسٹر ضیاء پر کشش اور  
ہندس میں۔ میں بھی کسی سے پہلی ملاقات میں متاثر نہیں ہوتی مگر..... مسٹر ضیاء نے  
مجھے متاثر کیا ہے۔“

”جی، مجھے طب کہتے ہیں۔ میں ضیاء کا کزدن ہوں اور ہم کیونکہ ایک ہی خاندان  
سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے یہ وجہت موروثی ہے.....“ طب نے فوراً مسکرا کر اس  
کی طرف ہاتھ پڑھایا۔ وہ نہ پڑی۔ جان گئی کہ طب اپنی بھی تعریف کا خواہش مند ہے۔  
”جی! جی!.....! لگ رہا ہے.....“ اسماڑت تو آپ بھی ہیں لیکن جو عجیب اور  
ہمار کشش ضیاء میں ہے وہ شاید ابھی پوری طرح آپ میں پیدا نہیں ہو پائی ہے شاید

رہا۔ اُسیں اماں بہت یاد آرہی تھیں پھر انہوں نے جو خواب سنایا تھا اس نے مجھے حیران  
کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ خود بہت پریشان تھیں۔ خواب میں انہوں نے عصمت آپا کو  
پیختے چلاتے اور تڑپتے دیکھا تھا اور ان کے جسم پر مکڑیوں کو رینگتے بھی دیکھا تھا۔ خواب سے  
فیصلہ سچا تھا مگر میں نے ہنس کر بیٹا دیا۔ ان سے کیا کہتا، وہ تو غم سے ہی پاگل ہو جاتی۔

طاہر بھائی بھی دورے سے واپس نہیں آئے تھے اس لئے ان کا وہاں جانا بھی مشکل  
تھا۔ میرے اطمینان دلانے سے وہ کچھ مطمئن ہو گئی تھیں مگر وہ رہ کر اماں اور عصمت ایسا  
کا ذکر کر رہی تھیں۔ انہی باتوں سے مجھے الجھن ہوتی تھی۔ سو شام تک کا وقت جیسے تیسے  
گزار لیا پھر سر شام ہی ہم لوگ نکل گئے۔

طب نے ناصر پچا کو بتا دیا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ رہے گا۔ انہوں نے بادل  
خواستہ مان لیا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے طب کی وجہ سے زیادہ خوش نہیں  
ہیں۔ میں نے طب سے کہ دیا تھا کہ وہ واپس آجائے مگر یہ بات سن کر اس نے مجھے کوئی  
جواب نہیں دیا تھا۔ ہم باندرے پہنچے تو وہاں ایک لمبا چڑا، مضبوط جسم کا خوبصورت اور  
صحبت مند نوجوان موجود تھا۔ یہی گپال غالباً کمیں اور سے بھی ڈرکٹ کر کے آیا  
میزبانی کا حق ادا کر دیا۔ مگر کی صفائی سترہائی کر کے ایک بارہ تیرہ برس کے پنجے کو ہماری  
خدمت پر بھی مانور کر دیا۔ وہ پینے پلانے کا شو قین تھا۔ سو اس کا انتظام بھی کیا ہوا تھا مگر  
میں نے مغذرات کی۔ طب بہت بے چین تھا۔ غالباً اس کے لئے یہ سہری موقع تھا جو  
میری وجہ سے اس کے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔

گپال سے بڑی سیر حاصل گئی ہوئی۔ باتیں کرتے کرتے رات ہو گئی۔ جانے کیے  
بات پر اسرار و اتفاقات تک پہنچی اور اس نے کئی ناقابل تیزین قسم کے واقعات سناؤالے۔“  
ان باتوں پر تیزین کرتا تھا، اس بات کی تقدیم ہو گئی تھی اور میں مطمئن بھی ہو گیا تھا کہ  
میری باتوں کو دیوانے کی بڑی نہیں سمجھے گا۔ طب نے بڑے محتاط انداز میں ہمارے ساتھ  
ہونے والے واقعات کا بھی کچھ ذکر کر دیا تھا جسے اس نے بڑی توجہ سے سنائی اور قطعی ہے  
ثبت کرنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ خرافات ہے بلکہ اس نے تشویش کا اظہار کیا۔ ایسا  
کا لے علم کے ماہر جو گی بیبا کا ذکر کیا اور اصرار کیا کہ ہم اس سے پہلی فرصت میں مل لیں۔  
بہر حال اس گفتگو سے مجھے اس لئے اطمینان ہو گیا کہ اب اگر یہاں کوئی انہوں نی ہوئی جی  
ہے تو اسے قائل کرنا یا ساتھ دینے پر مائل کرنا مشکل نہیں ہو گا اور یہ اچھا ہی ہوا درج

اس کی بات سن کر میں اور گوپال بے ساختہ نہ پرے۔ طیب بھنا گیا پھر اس نے سیدھے منہ اینٹا سے بات نہیں کی اور اینٹا بھی بات بات پر اس کا مذاق اڑاتی رہی۔ گوپال نے طیب کا بہت ریکارڈ لگایا۔

انٹا سے باٹنی کرنے کے بعد جو کچھ اس کے بارے میں معلومات ہوئیں، وہ یہ تھیں کہ وہ کرچکن ہے۔ بھئی میں رہتی ہے جبکہ اس کے والدین کا تعلق گواسے ہے اور وہ اب بھی گوا میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے چھ بھن بھائی ہیں۔ اینٹا ایک پرا یویٹ کمپنی میں ملازمت کر کے ان سب کی کفالت کرتی تھی۔ اس کا باپ گوا میں ایک میڈیکل اسٹور چلاتا تھا مگر اس کی آمدنی زیادہ نہیں تھی کیونکہ وہ لوگ ایک چھوٹے سے قبیلے میں رہتے ہیں۔ اینٹا نہیں لکھ، پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ اپنے پر کشش جسم اور خوبصورتی کا اسے پورا اور اک تحفہ۔ ملازمت سے اس کا خرچ پورا نہیں ہوتا تھا سو وہ اپنے چند مالدار دوستوں کو بھی وقت فرما خوش کر کے اپنی ضروریات پوری کیا کرتی تھی۔ کمال یہ کہ اس نے یہ باٹنی خود بیٹائی تھیں اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اسے قطعی کوئی جبکہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جب میں نے اس کی بات سن کر اپنی بغلیں جھانکیں تو اس نے اندازہ لگایا کہ میں نے اس کی صاف گوئی کو مانتہ کیا ہے جس پر اس نے مجھے جو کچھ کہا اسے سن کر میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس نے کہا تھا۔

"مسٹر ضیاء! آدمی کو اپنی ضرورتیں ہر حال میں پوری کرنا پڑتی ہیں۔ اسے وہ اپنی صلاحیت سے ہی پوری کر سکتا ہے۔ میں جس قدر محنت کر سکتی ہوں، کرتی ہوں۔ مجھے ہمہ حرای کی عادت نہیں ہے مگر دنیا کے ہر خلیے میں عوت سے زیادہ کام لے کر کم معافہ دیا جاتا ہے۔ اب میری جو ضرورتیں تنخواہ سے پوری نہیں ہوتیں، ان کا میں کیا کروں۔ میرا حق کھاتے ہیں۔ میں مردوں سے اپنا حق پھینکن لیتی ہوں۔ طریقہ کار و ہی استعمال کرتی ہوں جسے کرنا میرے لئے آسان ہے۔ میں بندوق دکھا کر حق نہیں چھین سکتی۔ میں جھگڑا کر کے نہیں چھین سکتی۔ میرا وہی بس جو میری تنخواہ کم کر کے دیتا ہے، رات کو مجھے تنخواہ سے زیادہ رقم خوش ہو کر دیتا ہے۔ جس صلاحیت سے میں رات کو کام لیتی ہوں، اس صلاحیت سے زیادہ میں دن بھر کام کر کے بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ ..... رہا برائی کا کانسپٹ تو ہر شخص کی نظر میں مختلف ہے۔ جب میرے بس کو اپنی کینگی کا احساس نہیں

ہو گا تو مجھے کیوں ہو گا؟ میں تو پھر محنت کر کے پیسا حاصل کرتی ہوں جبکہ وہ مجھے جیسی عورتوں کی محنت چڑاتا ہے۔ اسی سے اپنی تجویزیاں بھرتا ہے..... وہ بڑا معزز ہے، بڑا معتبر ہے۔ اس کا معاشرے میں مقام ہے جبکہ میرے بارے میں لوگ غلظت باشیں کرتے ہیں..... بھر حال میں اپنی ضروریات کسی کی مجبوری خرید کر پوری نہیں کرتی بلکہ اپنی ہی مجبوری کا سودا کرتی ہوں۔"

طیب تو ان باتوں سے شاید اس لئے خوش تھا کہ وہ اسے آسان لگ رہی تھی مگر مجھے اس بات کا لیکن ہو گیا کہ وہ سمجھدار بالاخلاق اور اعلیٰ طبیعت کی عورت ہے۔ آپ سوچن گے کہ میں غلط تعریف کر رہا ہوں مگر سوچنے تو اس نے مجھے دھوکا دیئے، خود کو شریف ظاہر کرنے یا اعلیٰ کردار کا حامل بتانے کے لئے جھوٹ نہیں بولا اور اس کی سچائی میرے دل میں اس کا احترام پیدا کر گئی۔ اس نے گوپال کے ساتھ پھر پیک پیک لئے ہانے شروع کر دیئے۔ صرف ایک مرتبہ مجھے ساتھ دینے کو کہا۔ جب میں نے مذمت کر لی تو وہ کچھ نہیں بولی بلکہ گوپال کے اصرار کرنے پر ٹوک دیا اور کہا۔

"یار! کیوں ضد کرتے ہو، ..... پینا برآ ہے، سو ہے، ایک برسے کام میں شامل ہونے کے لئے اصرار کرنا اس سے بھی بڑی برائی ہے۔"

"ہاں.....! وہ تو نہیک ہے مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پینے سے ایسا کون سا بھونچال آجائے گا۔ میرا خیال ہے، ضیاء نے کبھی چکھی نہیں ہے اس لئے اس کے لطف سے واقف نہیں ہے۔"

یہ طیب تھا، میں نے اسے گھورا۔ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"اچھا ہی ہے۔ ہر برائی میں لطف ہوتا ہے مگر وقتی..... ضیاء آئیڈیل قسم کا آدمی ہے۔ اگر یہ بلا کلف پی لیتا تو میرے ذہن میں اس کا ایسی شاید احترام کرنا کھلانکہ میں خود رنک کرتی ہوں۔ ہر آدمی کو اپنی سوچ، اپنی رائے، اپنے اصول کا احترام کرنا چاہئے۔ ہم وہ اچھے ہوں یا برے، اس سے اپنی ذات کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ آدمی کا علیحدہ کچھ ہونا بابت ہوتا ہے اور یہ ایک بہت اچھی بات ہے۔" اینٹا نے مجھے غور سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ یہ ابھی جوان نہیں ہوا۔" طیب نے منہ بنا کر کہا۔  
وہ نہیں پڑی۔ درستک بنتی رہی۔ گوپال اب مکمل طور پر نئے میں تھا۔ وہ بار بار

انیتا کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے وہ بڑی نری اور غیر محسوس انداز میں ہٹادیتی۔  
”ویسے کیا واقعی آپ نے کبھی نہیں پی؟“ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔

”نہیں.....! ایسا نہیں ہے کہ میں نہیں جانتا کہ شراب ہوتی کیا ہے، بلکہ میں سمجھتا کہ اسے پی کر آدمی کو کچھ حاصل ہوتا ہے۔ محض فرار، ایک ایسا کیف جو اسے کچھ دیر کے لئے اس جیتنی جاتگی دنیا سے عیحدہ کر دیتا ہے پھر لوٹ کر، ہوش آنے پر اسے میں پہنچ جانا ہوتا ہے جن چیزوں سے وہ فرار حاصل کرتا ہے۔ وہ اب پھر یہاں موجود ہوتی ہیں۔ تب اس کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔ وقت کے زیان کا پچھتاوا اور بس۔“

”کریکٹ.....! ایگزیکٹ لی یکی ہوتا ہے۔“ اس نے مضبوط انداز میں کہا۔

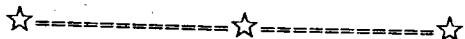
طیب للچائی ہوئی نگاہوں سے میز پر بھی شراب کی بوتل کو دیکھ رہا تھا۔ اب گولہ جھوم رہا تھا۔ بار بار انیتا کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ میں نے آرام کے لئے اجازت طلب کی۔ طیب نے فوراً اجازت دے دی مگر انیتا نے بیٹھنے پر اصرار کیا۔ گوپاں تو صرف انیتا کی برقبت کا خواہاں تھا۔ اسے دنیا و ما فیما کا ہوش نہیں تھا البتہ۔ اس کی خاموشی سے مجھے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ عام حالت میں بست بولنے والا گوپاں پی کر خاموش ہو جاتا ہے۔ میں نے انیتا سے مغفرت کر لی۔ اٹھتے ہوئے طیب کو بھی آرام کا مشورہ دیا اور آنکھوں ہی اور بولی۔

”میں تو آپ سے مل کر بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ یہ واحد خوشی ہے جو مجھے محنت کے بغیر مل رہی ہے۔“

”خاتون! میں آپ کی ضروریات کا نیال کر کے اٹھ رہا ہوں۔ غالباً خوشی سے نیا دنیا میں ضرورت اہم ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی جملے میں اور انداز میں طنز شامل ہو گیا جو مجھے بھی اچھا نہیں لگا۔ شدت سے احساس ہوا کہ وہ حساس لڑکی ہے، اسے ضرور دکھو! سو میں اس کی جانب دیکھے بنا کرے سے باہر نکل گیا۔ مجھے اپنے پیچھے کسی تعاقب کا اصرار نہیں ہوا حالانکہ لاششور میں کمیں یہ موقع تھی اس لئے میں نے اپنے کرے کے دروازے پر پہنچ کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ میری طرف ہی متوجہ تھی۔ چرے اور آنکھوں میں سنائے کا احساس ہوا۔ میں کرے کے اندر داخل ہو گیا۔

یہ صاف تھرا کمرہ تھا مگر ہوا دوار اور روشن نہیں تھا۔ ایک ڈبل بیڈ، دو کرسیاں

ایک چوکور اونچی سی ٹیبل اس کرے کا کل سامان تھا۔ میری خواہش پر بیڈ کو رسید کچھا لیا تھا۔ جس کی وجہ سے کچھ تروتازگی کا احساس ہوا تھا۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ میں بیال کی قسم کی پُرا اسراریت محسوس نہیں کر سکتا تھا اس لئے ذہن پُر سکون تھا۔ میں نے پڑھے بد لے اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا حالانکہ طیب کے لئے دوسرا کمرہ سیٹ کیا گیا تھا پھر بھی خیال تھا کہ شاید حالات کی وجہ سے طیب کو اسی کرے میں آتا پڑے۔



”آئی ایم سوری! میرا مطلب آپ کو تکلیف پنچھا نہیں تھا۔“  
وہ اٹھنی اور میرے قریب بیٹھ پ آئی۔ میں ذرا سا ہٹک گیا مگر دوسرا سے ہی لمحے یوں لگا چیسے میں نے جانے کتنے پیسگ چڑھا لئے ہیں۔ وہ میرے قریب سرک آئی اور میرا بدن آنچ دے اٹھا۔ وہی کیفیت طاری ہوتی چلی گئی جو میری ٹھہ میں چھست پر جو کر ہوئی تھی۔ میرے حواس ختم ہوتے چلے گئے اور میں جو طبیب کو تنبیہ کر کے آیا تھا، خود بہک اکھل۔ کھکشان جیسے کمرے میں اتر آئی تھی۔ رنگ و بو کا طوفان تھا۔ کیف و سرور تھا اور سب سے میں اکھلا تھا۔

ہوش آیا تو وہ بستر پر نکھری پڑی تھی۔ مجھے تو ہوش بھی اتنا ہی آیا تھا کہ احساس ہوا، پھر سرور کا سمندر عبور کرچکا ہوں، نہ پچھتاوے کا احساس بیدار ہوا تھا، نہ کسی قسم کی نکت محسوس ہوئی تھی۔ بس ذمگھاتی سی کیفیت تھی اور یہ احساس کہ اب سو جانا چاہئے۔ اس کی موجودگی میں سونا دشوار تھا، پھر طبیب اور گوپال کے سامنے بات نکلنے کا ذر اس لئے اسے ایسے کہیں اور پہنچانے کی خواہش تھی۔ میں نے اسے جگانے کی کوشش کی مگر وہ تو باقی نہیں میں تھی، سو ہوں ہاں کے سوا اس کے منہ سے کچھ نہ لکھا، نہ اس کی آنکھ کھلی۔ خر میں نے ہی اس کا پھولوں سانازک بدن اٹھایا اور اس کے جسم سے نکلتی خوبیوں اس طوفان میں ڈمگھاتا کر رہے سے باہر نکل آیا۔ میرے کمرے کے برابر میں بھی ایک کمرہ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ طبیب شاید کسی بڑے کمرے میں تھا اور گوپال یا تو جا چکا تھا یا ذرا لٹک روم میں تھا۔ میں اس لئے اس بڑے میں داخل ہو گیا۔ وہ کمرہ بے حد نفاست سے سنوارا گیا تھا۔ صاف تھرا بستر اور ذل چکر میں پڑی سفید براق چھرداری جس نے پورے بیڈ کو گھیرا ہوا تھا۔ اس کمرے میں دینک نیبل بھی تھی اور پکھ ایسی چیزیں بھی تھیں جو عام طور پر خاتمن کے استعمال میں آتی ہیں۔ بہرحال ان چیزوں پر میں نے غور نہیں کیا بس ایک احساس تھا کہ یہ کسی خاتون اُڑھو ہو گایا رہا ہو گا۔ میں نے اسے بستر پر لٹا دیا۔ اس کے خوبصورت چہرے پر بلا کی خوبیت تھی۔ وہ بلاشبہ بے حد حسین لڑکی تھی۔ اس کے سیاہ بال جانے کب کھل گئے شنجو بے حد خوبصورت لگ رہے تھے۔ میرا دل پھر ڈولنے لگا مگر اب میں خود پر کافی تک حاصل کرچکا تھا اس لئے فوراً لوٹ آیا۔ اینے کمرے میں آتے ہی میں سو گیا۔

میں جانے کب سو گیا۔ شاید رات آدمی سے زیادہ گزر پچکی تھی جب مجھے کسی نے جنجنوڑ کر جگا دیا۔ مجھے جگانے والا طیب تھا اور اس کے چہرے پر ہوا یاں اثر رہتی تھیں۔ ”کیا بات ہے؟“ میں اچھل کر انھے بینھا۔

”وہ ..... وہ رو رہی ہے۔“  
”کون؟“

”انیتا!“ طیب سخت مضطرب تھا۔

”کیوں؟ تم نے کوئی گڑ بڑا تو نہیں کر دی۔“  
”نہیں، نہیں یار! میں تو سو گیا تھا۔ وہی.....

بے سدھ رہا ہے۔

”پھر وہ کیوں رو رہی ہے؟“ میں اچھے گیا۔  
”تم خود پوچھ لو۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

میں نے اٹھ کر چپل پیروں میں ڈالے ہی تھے کہ وہ دروازے تک پہنچ گئی۔<sup>۱۰</sup>

اب بھی رو رہی تھی۔ اسے دیکھے ہی طیب کرے سے باہر چلا گیا۔

”آئے، بیٹھے!“ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔ وہ بہت

زیادہ نہ میں تھی۔ کرسی پر بیٹھنے سے پسلے وہ کئی جگہ لاکھڑائی تھی۔ میں نے چاہا کہ اس سکارا دوں مگر پھر جھک گیا۔

”کلامات سے؟“ میر نے اسے انی جانب وکھتے پا کر یوچا۔ ”آپ کیوں رو رہیں؟

”آب کی بات سے۔“ اس نے لگی لٹی رکھے بغیر انی اسی خاص صاف گوئی سے کہا۔

☆ ===== ☆ ===== ☆

اذا و تفری کے اثرات جوں کے توں موجود تھے۔ میز پر موگ پھلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ دال موت گرے ہوئے تھے۔ شراب کی غالی بوتل قلین پر پڑی تھی۔ گلاس رکھے تھے۔ میں وہیں ایک طرف صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر میں طیب نے آگر بتایا کہ لڑکا نہیں آیا ہے اور وہ میں دروازہ بند کر کے آیا ہے۔ نیچے جو پروفیسر رہتے تھے، وہ اکیلے تھے اور روز مجھ سوپرے یونیورسٹی پلے جیا کرتے تھے اس لئے نیچے بھی سناتا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا۔ میں گیٹ بند تھا۔

”نیس! نیا! گوپال ایسا کیوں کرتا اور پھر میں نے صبح اسے خود اٹھایا ہے۔ اس نے اٹھنے ہی سامنے صوفے پر دیکھ کر انتا کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“

”کیوں یہ خیال کیوں ہے تم سارا؟ تم بھول رہے ہو کہ وہ ایک حوالدار ہے۔ جانے کتنے قلق کئے ہوئے لوگ وہ دیکھ چکا ہے اور جانے کتنی ترکیبیں اسے آتی ہوں گی قتل کرنے کی۔ یہ بھی اس کے لئے ایسی خوفناک بات نہیں تھی کہ وہ قلق کر کے خوف زدہ اور آپ سے باہر ہو جاتا۔“

”مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ انتا اس کی پرانی دوست تھی۔ وہ اس لحاظ سے پسند کرتا تھا کہ وہ نہ صرف خوددار ہے، سچ بولتی ہے اور.....“

”میں نہیں جانتا کہ تم اس کی حمایت کیوں کر رہے ہو؟“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”شاید جانے نہیں ہو کہ یہاں اکثر لوگ دوستوں کی پشت میں خبر گھونپتے ہیں۔ اگر یہ گوپال کی پلانگ تھی تو یقین کرو، وہ بہت ذہین آدمی ہے اور خوش قسمت بھی کر وہ قلق کے الزام۔ صاف نجٹ لکلے گا۔ قدرت نے اسے بترن موقع فراہم کیا ہے۔ فی الحال یہ سوچو کہ اس لاش کا کیا کیا جائے۔“

”میں..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ضیاء! میں کچھ نہیں سوچ سکتا۔ یہ ایسا کی کوئی نہیں ہے کہ ہم اسے کہیں دفن کر دیں۔ یہاں نہ تو اتنی جگہ ہے اور نہ یہاں پر ہم اکیلے ہیں۔ وہ پروفیسر زیادہ سے زیادہ دو بجے تک گھر آ جاتا ہے، پھر وہ لڑکا..... میں گوپال کو فون کروں؟“

”نہیں!“ میں نے کہنے کو تو کہہ دیا۔ مگر میں بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ یہاں مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ یہ زیو سا کی کارستانی بھی ہو سکتی ہے۔ خاص طور

صح مجھے طیب نے جگایا۔ وہ سخت ہر اساح تھا۔ بوکھلایا ہوا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے کچھ کہنا چاہا۔ وہ باہر کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ بار بار تھوک نگل رہا تھا۔ مگر اس سے کہو بولا نہیں جا رہا تھا۔ میں اٹھ کر باہر کی طرف لپکا۔ طیب میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں باہر آئے تو طیب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس کرے میں لے گیا جہاں رات میں نے انتا کو لے لیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ انتا کا گلاؤ کا ہوا تھا۔ بستر خون میں تر تھا۔ اس کی وہ خوبصورتی جس نے رات مجھے بے خود کر دیا تھا، اب بد صورتی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ طیب کی حالت بہتر تھی۔ میں نے انتا تیزی سے طیب کا ہاتھ تھما اور اسے کرے سے باہر لے آیا۔

”ی..... یہ کیا ہوا ہے؟“ میں نے طیب سے پوچھا۔

”مجھے..... مجھے نہیں پتا۔“ اس نے بمشکل تمام کہا۔

”گوپال کہا ہے؟“ میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

”وہ تو صبح ہی چلا گیا تھا۔“ طیب نے فریغ سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے کہا، بوتل منہ سے لے گا کر خالی کر دیا۔

”اے انتا کے بارے میں.....“

”نہیں!“ طیب نے میری بات کاٹ دی۔ ”وہ سمجھا تھا کہ انتا جا چکی ہے۔ میں بھی یہی سمجھا تھا۔ وہ توجہ دیر ہو گئی اور تم نہیں اٹھنے تو میں تمہیں اٹھانے کے لئے آیا تب میں نے یہ دروازہ کھلا دیکھا۔ اندر جھانکا تو.....“ اس نے سر دنوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

”طیب.....! آؤ۔ میرا دماغ بھی سن ہو چکا ہے۔ ہم ڈرائیکٹ روم میں بیٹھے ہیں۔ وہ ملازم لڑکا کہا ہے؟“ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر ڈرائیکٹ روم کی طرف بڑھا دیا۔

”وہ رات کو چلا گیا تھا۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر پڑی جھونپڑیوں میں ایک اس کا گھر بھی ہے۔ گوپال نے کہا تھا کہ وہ صبح آجائے گا۔ ہو سکتا ہے، آگیا ہو؟“ پانی پی کر طیب نا حالت کچھ سنبھل گئی تھی۔

”دیکھو اسے..... اگر آگیا ہو تو بھیج دو۔ کہہ دو کہ ہم لوگ جا رہے ہیں۔“ میں سخت پریشان تھا۔ طیب چلا گیا۔ میں ڈرائیکٹ روم میں چلا آیا۔ یہاں رات کا

پر مردنی نہیں، زندگی تھی۔

پھر میں اچھل پڑا۔ طیب کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی تھی۔ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سر اٹھا کے چھٹ کو سٹک رہا تھا۔ بے اختیار میں نے بھی اسی جانب دیکھا۔ پوری چھٹ پر مکڑی کا جلا بنا تھا۔ ایک سیاہ اور بہت بڑی مکڑی اس جالے کے پیچوں بیٹھی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ہمیں ہی دیکھ رہی ہو۔ اس صاف تھرے کمرے کی چھٹ پر یہ جلا اتنا بھیانک لگ رہا تھا کہ طیب اچھل کر باہر بھاگ لیا۔

”زویں! کیا یہ تم ہو؟“ میں نے دانت پکچا کر یوں کہا جیسے وہ مکڑی ابھی بول پڑے گی مگر کمرے میں چھالیا سنا تا گرا ہو گیا پھر مجھے یوں لگا جیسے اس ننانے میں کسی کے سانس لینے کی آواز دھیرے دھیرے ابھر رہی ہو۔ میں بے اختیار پڑتا۔ یہ آواز انتیا کی لاش کی باب سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر میرا اندازہ غلط نکلا۔ اب مجھے ہاں رکنا محال لگ رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر آگیا۔ اس دروازے کے لاک میں چالی لکی ہوئی تھی۔ میں نے دروازے کو لاک کیا۔ چالی نکال کر اپنی جیب میں ڈالی اور ادھر ادھر دیکھا۔ طیب نظر نہیں آیا۔ میں نے آواز دی۔ وہ ڈرانگ روم میں تھا۔ میں وہیں چلا آیا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ سارا جال زیور سا کا پھیلا ہوا ہے۔

”طیب چلو! میرا خیال ہے کہ تمہارے اس آکا بگیا کے پاس جانا ہی پڑے گا۔“

میری بات سن کر طیب نے چونک کر گھڑی دیکھی اور بولا۔ ”ہاں ضیاء! یہ معالہ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہنے سے حل نہیں ہو گا۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کر دیں گے۔“

میں سینپینگ سوت میں تھا جب کہ طیب کپڑے بدلتا چکا تھا۔ میں نے کپڑے بدلتے۔ طیب نے پوچھا کہ لاش کا کیا ہو گا، میں نے یہی کہہ دیا کہ رات کو دیکھیں گے۔ اس وقت یوں بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ علاقہ گنجان تھا۔ ایسا کی کوئی تھی کی طرح سنان علاقہ نہیں تھا۔ لیکن ایک بات میں سوچ چکا تھا کہ اگر لاش کو ٹھکانے لگتا بھی پڑا تو ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ ہمارے پاس اب بھی ایسا کی کوئی تھی۔ طیب کار لے آتا اور ہم رات کے اندر ہیرے میں انتیا کی لاش ہاں لے جاتے۔ بہر حال یہ سب سوچا تو حاگر ابھی صورت حال واضح نہیں تھی۔ پچھی بات ہے کہ ذہن تاک تو یہاں مار رہا تھا۔ مگر اس آکا بگیا سے مل کر ہی کچھ طے کرنا چاہتا تھا۔

ہم گھر سے نکلتے ہوئے کافی کشفیز تھے۔ نکلنے سے پہلے بھی ہم نے انتیا کے کمرے

پر ان حالات میں کہ وہ غم و غصے میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس کی مشاہی کی تھی کہ میں کبھی عورت کے قریب نہ جاؤں۔ زیوں سا کا خیال تو جب آیا، جب میں کافی دیر مغفرہ کھپانے کے بعد پھر اینیا والے کمرے میں گیا کہ آخر ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ میں یہ بھی جانا چاہتا تھا کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا ہے۔ گزرتے وقت نے طیب کو بھی کچھ سکون بخش دیا تھا۔ گوہگراہٹ نے اسے بھی ہلکاں کر دیا تھا مگر اب وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ میں اتنے نگاہو وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

ہم دونوں انتیا کے کمرے میں پہنچے۔ پورے کمرے میں سکون تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تھی مگر اینیا کی گردن الگ تھی اور خوب صورت جنم الگ۔ یہ برا بھیانک منتظر تھا مگر میں نے خود پر قابو رکھا۔ یہ بات کم پریشان کن نہیں تھی کہ دن چڑھ چکا تھا۔ ہمارے گھر میں ایک کمرے کے اندر ایک لڑکی کی لاش پڑی تھی۔ ہم بے بس تھے، نہ لاش کو ٹھکانے والا سکتے تھے اور نہ ہی اسے یوں چھوڑ سکتے تھے۔ میں یہ معاملہ گوپال کے حوالے کرنے کو بھی تیار نہیں تھا کہ مجھے اب بھی اسی پر شک تھا۔ میں نے جھک کر غور سے انتیا کی لاش کو دیکھا اور یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کی لاش پر پہلی نگاہ ڈالتے ہی مجھے جس بد صورتی کا احساس ہوا تھا، وہ احساس اب نہیں تھا۔ اس کے چہرے کی سرفہ تک دیکی ہی تھی جب صورت کی لڑکی تھی۔

”طیب!“ میں نے دور کھڑے طیب کو پکارا۔ ”ادھر آؤ۔ دیکھو، تمہیں کچھ محسوس نہیں ہو رہا۔“

طیب جھکتا ہوا آگے بڑھا اور پھر میں نے اس کے چہرے پر بھی تعجب محسوس کیا۔ ”ہاں.....! یہ اس وقت.....!“

پھر طیب نے مجھے چونک کر دیکھا۔ ”مختلف لگ رہی تھی؟“ میں نے اس کا جملہ پورا کر کے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں!“ اس نے تھوک نکل کر سر پہلا یا۔ ”مگر یہ ضیاء!“ وہ اچانک ٹھٹکا۔ ”یہ زیوں سا..... تو.....!“

”ہاں! مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔“ میں نے پُر سوچ انداز میں لاش کو دیکھا۔ اگر خون نہ پھیلا ہوتا تو یقین تکچھے میں دھوکا کھا جاتا کہ وہ زندہ ہے۔ مگر بھی اس کے چہرے

اس جھونپڑے میں داخل ہو گیا۔ ہم اب بھی اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی زمین پر پڑھ گیا۔ اب اس نے سراخا کر رہیں دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ان میں ایسی چمک تھی کہ میری ریڑھ کی پڑی میں سردی لہر دوڑ گئی۔ یہ سرد لہر اس کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر نہیں بلکہ اس احساس کی وجہ سے دوڑی تھی کہ عین اسی لمحے میری نگاہوں کے سامنے دو چمکدار آنکھیں گھوم گئی تھیں جو میں نے خواب میں دیکھی تھیں۔ اس پنڈت کی آنکھیں جو مجھے ایک بست پرانے ہنذر میں یہ کہ کر لے گیا تھا کہ آج پوری ایک صدی کے بعد تم نے اس مندر میں قدم رکھا ہے، اب میں آزاد ہو جاؤں گہ وہی پنڈت جس نے میری کلائی تھا تو اس کی لمبی انگلیاں سنپولیوں کی طرح میری کلائی سے لپٹ گئی تھیں اور مجھے لگتا ہے میں گھٹائی میں گر رہا ہوں اور..... بب میری آنکھ کھلی تھی تو زیوں سافرحت کے روپ میں میرے سامنے موجود تھی۔ میں نے سر کو جھنک کر خود کو سنبھالا۔ اس کی آنکھوں میں غور سے دیکھا۔ پچان کا نہموں رنگ اس کی آنکھوں میں بھی تھا لیکن میں تذبذب کا شکار تھا۔

”آکا بایا! ہم آگئے ہیں۔ آپ نے بلا یا تھا۔ ہم بست پریشان ہیں۔ کیا آپ جانتے میں کہ ہم کس.....؟“

”لاش چھوڑ آئے ہو؟؟“

وہ طیب کی بات کاٹ کر بولا تو میرے روٹنے کھڑے ہو گئے۔

”جی آکا بایا! آپ تو جانتے ہیں کہ ہم نے اسے قتل نہیں کیا۔“ طیب سکھیا نے لگا۔

”اس نے کیا ہے اس کا قتل۔“ اس نے اپنی پتی سی، لمبی سی انگلی کو میری جانب ٹھاٹے ہوئے انتہائی سفافی سے کہا۔

”اگ کیا کہ رہے ہیں آپ؟ ہوش میں تو ہیں۔“ میں بوکھلا کر بولا۔ میری ٹھہرے پر پڑی۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کے تاثرات بھی تھے۔ ”نمیں طیب.....؟! یہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ خدا کی قسم!“ میں نے قتل نہیں کیا۔ ”میرے پتے چھوٹ گئے۔

”تم موت کھل دت کھا قسم۔ اس کا قاتل تو ہے۔ تو..... تو جانتا تھا کہ اگر کسی اور سے تعلق قائم کرے گا تو وہ زیوں سا کے انعام کی بھینٹ چڑھ جائے گی۔“

کالاک چیک کیا تھا۔ یہ طیب نے بتایا تھا کہ گھر کی دوسری چالی گوبال کے پاس ہے، مجھے دھڑکا ہو گیا۔ اگر وہ پچھے آگیا تو جانے کیا ہو گا اسی لئے میں نے اس کمرے کی چالی جیب میں ڈال لی تھی۔ دن کے سارے سارے گیارہ نجح چکے تھے۔ وہ سوپ کی تمیزی نے سڑکوں پر پھلی سی چادری تھی۔ ہر شخص بھاگنے کے سے انداز میں چل رہا تھا۔ ہم نے باہر آتے ہی نیکی کرنی۔ اندھیری تک کا راستہ خاصاً طویل تھا۔ ہم نے ریل کی پڑی کے برابر والی سڑک پکڑی اور پندرہ میں منٹ میں اندھیری پہنچ گئے۔ ہمارے دائیں جانب ریل کی پڑی چل رہی تھی۔ اندھیری کے اسٹیشن سے چند فرلانگ آگے وہ حصہ دور ہی سے نظر آگیا جو کھلا آتے تھے۔ طیب نے نیکی کنارے پر ہی رکوائی۔ میں چاروں طرف دیکھ کر اندازہ لگا رہا تھا کہ یہاں ایسی کوں سی جگہ ہے جمال وہ شخص مل سکتا ہے لیکن نزدیک و دور کوئی ایسا گھر نظر آیا۔ جھونپڑی جہاں اس کی موجودگی کا سوچ پاتا۔ طیب نے نیکی والے کو کرایہ دے کر بھیج دیا۔

اب میں اور طیب ندی کی طرف چل دیئے۔ طیب بھی جیران تھا کہ یہاں آکا بایا کمال ملے گا۔ ندی کی ڈھلان میں اتر کر ہم بالکل اس کے کنارے پہنچ گئے مگر وہاں در درور تک کوئی نہیں تھا۔

”واپس چلو۔ وہ کوئی ڈراما باز تھا۔“ میں نے الجھ کر کہا۔ گرمی سے میری حالت بری ہو رہی تھی۔

”یار! ایسا ہو نہیں سکتا۔“ طیب نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھو۔“ اچانک وہ چینا۔ میں نے دیکھا۔ وہ ایک جانب اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے اس کے اشارے پر اس طرف دیکھا۔ وہی غلیظ اور لا غریب شخص ایک شد منڈ درخت کی کھوہ میں سر نیہوڑا سے بیٹھا تھا۔ ہم دونوں اس کی طرف بڑھے۔

”آکا بایا!“ طیب نے قریب پہنچ کر اسے پکارا۔ اس نے سراخا کر رہیں نہیں دیکھا بلکہ وہ اسی انداز سے سر جھکائے جھکائے کھڑا ہو گیا اور پات کر ایک طرف چل پڑا۔ ہم اس کے پیچے تھے۔ وہ ایک چھوٹی سی چڑھائی پر چڑھ گیا۔ یہاں ایک ٹوٹی ہوئی دیوار سی تھی جو غالباً ندی کا پانی چڑھنے کی وجہ سے ان حالوں کو پہنچی تھی۔ اس دیوار کے پار ایک جھونپڑا تھا۔“

وہ چینا مگر اب جو کچھ اس نے کہا تھا، اس نے تو میرے چھکے ہی چھڑا دیئے۔ میں اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھا۔ وہ تو بت پہنچا ہوا آدمی تھا۔ اسے شاید اب کوئی بھی بتانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس بار میں لٹکھیا گیا۔ اس کے قدموں میں بہرے گیا۔

”آکا باگیا! میں زیوسا کی بات کو صرف دھمکی سمجھا تھا۔ اس نے فرحت کو نقصان تو نہیں پہنچایا تھا مگر پھر.....“

”اس کی بات اور تھی۔ وقت گزر جاتا ہے تو پچھے اور سب کچھ چھوڑ جاتا ہے۔ اس وقت وہ تیری محبت میں دوپی تھی اور اب..... بے وقوف ہے تو۔ زنجیر اس کے حوالے کرنے سے بہتر تھا کہ دشلا کو دے دیتا۔“

میں اور طیب آنکھیں چھاڑے اس کی بات سن رہے تھے۔ وہ چپ ہو کر، سر جھاکر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ اکیلا ہو۔

”آکا باگیا! ایک بے وقوفی نہیں ہوئی۔ ہزار غلطیاں ہوئی ہیں مگر میں..... میں قطعی بے قصور ہوں۔ اس چکر سے نکلتا چاہتا ہوں۔ خدا کے واسطے، میری مدد کریں۔ اب میرے اندر سکت نہیں ہے کہ.....“

تیری کوئی حیثیت نہیں ہے مورکہ! پھر بھی تو اب تک زعم میں ہے۔ سکت ہوتی تو کیا کر لیتا؟ ان طاقتتوں سے نکر لینا کھلی سمجھا ہے تو نے؟ پتا نہیں، کتنے آئے اور مٹی ہو گئے۔ کتنے اٹھے اور راکھ بن گئے۔ کتنے ابھرے اور ڈوب گئے۔ تو سمجھتا ہے، تھجھے میں سکت ہوتی تو سب کچھ تیرے چکلی بجا تھے ہو جاتا ہے۔ نیکی اور بدی کی جنگ میں تو کیا کر لیتا۔ ہیں تبا!

وہ بے طرح چیخ رہا تھا۔ اس کا انداز توہین آمیز تھا مگر اس بار میرے اندر سناٹا چلا رہا۔ شاید کوئی اور ہوتا، کبھی بھی کوئی اس طرح مجھ سے بات کرتا تو میرے اندر اٹھے والے بگولے مجھے واقعی قاتل بنا دیتے مگر آکا باگیا کی حیرت انگیز قوت نے مجھے پتھر کا بنا دھکا۔ میں اسی طرح اس کا لرزتا کانپتا گھٹنا پکڑے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میں نے طیب کے طرف بھی نہیں دیکھا کہ اس کی کیا حالت ہے۔

وہ خاموش ہو گیا۔ بالکل چپ..... میں نے اسے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کئے زور سے سر ہلا رہا تھا پھر اچانک وہ بول انھلے۔

”ایک صدی کے بعد..... پوری ایک صدی کے بعد آدمی آزاد ہو جاتا ہے۔ انسان کی ہست تبدیل ہو جاتی ہے۔“ وہ بڑیا رہا تھا۔ ”اے نہیں لگتا مگر بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ طاقتیں کمزور نہیں پڑتیں، ابھر آتی ہیں، یہاں نہیں تو وہاں..... وہاں نہیں تو کہیں اور..... کسی اور شکل میں، کسی اور جذبے میں۔“

میں نے طیب کی طرف دیکھا۔ وہ بھی الجھن میں تھا۔ ابھی تک آکا باگیا نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی جو مجھے نجات کی راہ بھاتی۔

”آکا باگیا! ہمیں ان بھملیوں سے بچالیں۔“ طیب ان کے قریب بیٹھ گیا۔ میں آکا باگیا کے ان جلوں پر غور کر رہا تھا جو انسوں نے ادا کئے تھے۔ ان میں پوری ایک صدی گزر جانے والے جملے نے مجھے ٹھٹکا دیا تھا۔ یہ جملہ بھی خواب میں وہ پنڈت بول ڈکا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے آکا باگیا کو ہی خواب میں بکھا تھا۔

”آکا باگیا.....!“ میں نے سرگوشی کی۔ ”میں آپ سے پسلے بھی مل چکا ہوں۔“ آکا باگیا نے اس جملے پر کوئی دھیان نہیں دیا حالانکہ مجھے توقع تھی کہ وہ چونک اٹھے گا۔ وہ اب پھر گھری خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں پھر اس نے چوک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔

”سن! جلدی جا.....! شادی کر لے..... جلدی جا..... شادی کر لے.....“

میں اور طیب دونوں ہی اچھل پرے۔ ”گک..... کیا.....؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”ہاں.....! انتا سے شادی کر لے۔“

اب میں بڑی طرح اچھل پڑا۔ طیب تو جم کر رہا گیا تھا۔ ”لیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

وہ مرچکلی ہے اور اگر زندہ بھی ہوتی تو میں ہرگز ایسا نہ کرتا۔ میں تو.....“ ”ہاں.....! تو..... پاگل ہے۔ تیری جان پر بنے گی تو تجھے زندگی کی قدر کا احساس بھی ہو گا۔ یوں..... یوں تو سنبھلنے والا نہیں ہے۔“ انسوں نے اتنا کہہ کر میرا دہ باٹھ جھٹک دیا جو میں اب بھی ان کے گھٹنے پر رکھے بیٹھا تھا۔

”مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔“

”پھر تو کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“ وہ غصے میں بھنا کر اٹھ گئے۔

”صیاع.....!“ طیب نے مجھے چونا دیا۔ ”یہ کہ رہے ہیں تو..... تو اس کا مطلب ہے کہ اینتا.....“ میں بھی چونک اٹھا۔ یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں تھا کہ میں ایک بست بڑی مشکل سے نکل آیا ہوں۔ آکا بگایا کھڑے ہو چکے تھے۔ ”تیری نجات اسی میں ہے مورکھ.....! ورنہ تو اپنی ساری زندگی ملاخوں کے پیچے کاٹے گا۔“ انہوں نے مجھے ٹھوکر ماری اور جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔

میں اور طیب جو ایک لمحے کو یہ سن کر ساکت رہ گئے تھے، اچانک باہر لپکے گریا ہر پھیل دھوپ میں نشانا تھا۔ دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔ جانے وہ آکا بگایا کہاں چلا گیا تھا۔ ہم دونوں نے اسے ہر جگہ تلاش کیا۔ ندی کے کنارے، درختوں کے نیچے، اپر، سڑک پر گروہ کمیں بھی نہیں تھا۔ ”فیا.....! ہمیں گھر جانا چاہئے۔ میرا خیال ہے کہ تم ان کی ہدایت پر عمل کرو ورنہ جانے کیا ہو جائے۔“

”ہوں.....!“ میں پریشان تھا۔ ”مگر اینتا سے شادی..... یہ کیسے ممکن ہے؟“ ”پلیز ضایا! کیا اب بھی نہیں آکا بگایا پر بٹک ہے؟“ ”پلے گھر چلو پھر سوچیں گے۔“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ہم نے ٹیکسی پکڑی اور سیدھے گھر پہنچ گئے۔ پہنچھے میں رہائش پذیر پروفیسر بھی شاید ابھی ابھی آئے تھے۔ وہ گیٹ پر ہی تھے کہ ہم پہنچ گئے۔ طیب نے میرا ان سے تعارف کرایا۔ وہ رسکی سی گفتگو کر کے اور دوبارہ طلاقات کی خواہش کا انظہار کر کے چلے گئے۔ مجھے اور طیب کو یوں بھی اوپر جانے کی جلدی تھی۔ ہم اوپر پہنچ گئے۔ گوپاں غالباً بھی نہیں آیا تھا۔ میں سیدھا اس کمرے کی طرف لپکا جہاں ہم اینتا کی لاش کو چھوڑ کر گئے تھے۔ میں نے جیب سے چابی نکالی کر اسے لاک میں گھماٹا چلا گر محسوس کیا کہ دروازہ لاک نہیں ہے۔ میرے ہلکا سا دباؤ ڈالنے پر دروازہ بے آواز ٹھک گیا۔ دروازہ کھلتے ہی میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ہاں اینتا اکیلی نہیں تھی۔

آکا بگایا اس کے قریب بیٹھا تھا۔ اینتا بے سده لیٹی تھی۔ دوسرا جھٹکا مجھے اس وقت لگا جب میں نے دیکھا کہ اس کی گردن ثابت ہے۔ خون کا کمیں ایک قطرہ بھی دکھلنا نہیں۔ بلکہ یوں لگا جیسے اینتا بے خبر سورہی ہے۔ یہ سب دیکھ کر میری جان آئی۔ آکا بگایا

ہماری آمد سے بے جرا نیتا کے قریب آتی پاتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہو تھمارہ تھا۔ دونوں ہاتھ اینتا کے چہرے پر پھسل رہے تھے۔ جیسے کچھ ٹھول رہے ہوں۔ میں اسی جگہ ساکت کھڑا تھا جب طیب نے دھیرے سے میری کمر کو چھوٹا۔ میں نے پٹ کر ریکھا۔ وہ چھٹت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے چونک کر چھٹت پر دیکھا۔ وہاں نہ وہ کرہے بکھری تھی نہ اس کا جالا۔ سب کچھ ٹھیک تھا جیسے جو کچھ ہم نے اب سے پہلے دیکھا۔ کوئی بھی انک خواب تھا۔

اچانک آکا بگایا نے آنکھیں کھول دیں۔ سرخ انگارہ سی آنکھوں میں عجیب پُرا سرار ی چک تھی۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ”ادھر آ!“ اس نے کرخت آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

میں قریب پلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے بدن سے ہلکی سی آنچ آری تھی۔ جیسے میں دیکھتے کوئوں کے قریب آگیا ہوں۔

”اس سے شادی کرنا تیری مجبوری ہے ورنہ تو عذابوں میں ایسا چھپنے گا کہ نکلنے کو راستہ نہیں مل سکے گا۔ موت نہیں آئے گی، اذیت آتی رہے گی۔ موت تو اس لے سفر کی نسل ہے۔ ایک اور سرائے ہے، ایک اور لمبا سفر، پھر وہاں سے بھی آگے جانا ہے۔ سب کو موت آجائے گی تو کس بات سے گھبراتا ہے کیا فرحت ہیشہ زندہ رہے گی؟ کیا تیرے رشتے دار حیات کے آخوندگانے تک جیتے رہیں گے نہیں، حیات تو اربوں سال سے سفر میں ہے، اسے زوال نہیں آتا، ہر ماوی شے کو زوال آ جاتا ہے۔ حیات ایک سایہ دار رشتہ ہے جو اس کی چھاؤں میں ستا کر آگے بڑھ جاتا ہے اس کی جگہ دوسرا لے لیتا ہے۔ زندگی کا فلسفہ بہت آسان ہے اور موت کا بھی۔ اسرار ہر جگہ ہے، طاقت سب میں ہے۔ بشری طیکہ آدمی جان لے۔ جو جان لیتا ہے، وہ فلاخ پاتا ہے۔ بے ترتیبی کو درست کر لیتا ہے مگر حیات پر حاوی نہیں ہو سکتا، یہ نظام ہے، اس سے آگے پیچے کچھ نہیں ہے۔“

اس کی آواز نہ صرف یہ کہ زرم تھی بلکہ انداز میں شفقت تھی۔ وہ سمجھانے والے انداز میں بول رہا تھا، پچی بات تو یہ ہے کہ اس نے حیات و موت کا جو فلسفہ مجھے سمجھایا تھا وہ بتتے چشمے کی طرح میرے دل و دماغ میں اترتا چلا گیا تھا۔ یہی سب کچھ تو اس نہ ہب نے بھی ہمیں سمجھایا تھا۔ مگر لوگوں نے اسے کتنا یچیدہ بناؤ لا تھا۔ گناہ ثواب

جبڑا، وہ درست بھی ہو سکتا ہے۔ یہی راز پالیا تھا اس نے۔ تم راز پالو گے تو اسرار عیاں ہو کر بنے جیشیت ہو جائیں گے۔ انھو.....! زیوسا، طاقت ہے، اذیت نہیں۔ فرحت، ترپت کو جذبہ سمجھتی ہے تم بھی۔ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ نہ ہوتا تو ہر آدمی دوسرے کے پھر جانے پر مر جالا کرتے۔ ایک چکر ہے چلتا ہے گا قبرستانوں کا سناٹا آدمی کے لاشور میں تاریکی میں خوفناک ہو جاتا ہے اور بس۔ روشنی ہو تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ انھو! بے زندگی کو درست کرو۔ کوئی کسی دوسرے کی چیز لے کر سکھ نہیں پاتا، کھو دیتا ہے۔ ہر ہی مدی میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔ ایک صدی پوری ہوئی۔ بس ہونے والی ہے۔“

وہ یوں بول رہا تھا جیسے اکیلا ہو اور حساب کتاب کر رہا ہو۔ ہم سامنے نہ ہوں۔ اینتا اسی طرح بے سده پڑی تھی۔ میں بت بنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اچانک وہ اٹھا اور تقریباً دوڑتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس سے پسلے کہ میں اور طیب باہر لپکتے، اینتا کی کراہ نے ہم دونوں کے قدم تھام لئے۔

”اوہ.....!“

وہ لیٹے لیٹے ہی دونوں ہاتھوں میں سر تھامے تھی۔ میں نے تو ایک نگاہ اس پر ڈالی اور باہر بھاگ لیا مگر طیب باہر نہیں آیا۔ باہر اسی گھرے سنائے نے میرا استقبال کیا۔ وہاں دور تک کچھ نہیں تھا۔ میرا باہر جا کر دیکھنا بے کار تھا۔ میں جانتا تھا کہ اب آکا بگایا ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں لوٹ آیا۔ طیب اینتا کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر طیب ذرا بوکھلا یا۔

”یہ.....! انہیں چکر آ رہے ہیں۔“ طیب کچھ پیچھے سرک گیا۔

”کیسی ہیں آپ؟“ میں نے جھک کر پوچھا۔

”ہوں.....!“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”آئی ایم سوری!“ میں شاید بہت زیادہ پی گئی تھی۔ ”وہ نداشت سے بولی۔

”میں اسی لئے پسند نہیں کرتا۔“ میں نے سامنے بیٹھتے ہوئے کمل۔

”اے.....!“ طیب نے مجھے کہنی ماری۔ ”یہ آکا بگایا فرحت کے بارے میں کیا کہ رہا تھا؟“

”ہوں!“ میں چونک گیا۔ واقعی آکا بگایا نے فرحت کا ذکر کیا تھا گو اس کی باتیں اسی تھیں کہ طیب سمجھ سکتا مگر برعکس اس نے جو جملہ کہا تھا، اس پر اگر طیب ذرا سا

کی الکی تفریق کی تھی کہ سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ خدا اصل میں کیا تباہ رہا ہے۔ ایسے نظریات لوگوں نے بنا دیے تھے کہ آدمی اصل تک پہنچنے سے پسلے ہی گور کھ دھنے میں پھنس جاتا تھا۔ اگر اسے یقین ہو جائے کہ اسے یہاں بیٹھ نہیں رہنا۔ ہرمادی شے کر زوال ہے ارتقاء کی منزلیں بہت آگے ہیں، دنیا پر حادی ہونا، حیات پر قادر ہونا اس کے بس کی بات نہیں تو..... تو شاید ہر شخص موت کا انتظار کرتا اور اچھے برے کی تمیزاب اسکی بھی مشکل نہ تھی کہ وہ ثواب کے بکھیزوں میں پڑ کر اصل باث فراموش کر دیتا۔ وہی اچھا ہوتا ہے جو اس کے اپنے اور ہر دوسرے کے لئے اچھا ہو۔ بس یہی ثواب ہے۔ اور ہر وہ جو اس کے اپنے اور دوسرے کے لئے برا ہو، وہ گناہ..... اس کی باتیں مجھ پر رقت طاری کر رہی تھیں۔

”یہ..... یہ زندہ ہے آکا بگایا؟“ طیب نے مجھے سوچوں کے بھنور سے نکال لیا۔ ”زندہ ہے مگر وہ زندگی کس کام کی جو جذبوں، رشتتوں اور احساسات سے غاری ہو۔“ وہ اسی نری سے بولا۔

”جدبے رشتے اور احساسات ہیں تو آدمی کو گناہ پر اکساتے ہیں۔“ میں سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔

”ہاں! مگر سلطی سوچ کے آدمیوں کو یوں بھی جذبوں، رشتتوں اور احساسات کا رخ دینے والا آدمی ہی کے اندر بیٹھا انسان ہوتا ہے۔ کبھی باہر کا آدمی طاقت ور ہو جاتا ہے اور کبھی اندر کا انسان اور سنو! انسان کی طاقت کو مان لینا آدمی کی بستری ہوتی ہے۔“

طیب اسے بوریت اور میں جیرت سے دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے متاثر ہو چکا تھا۔ ”کوئی پیر فقیر، عامل یا جا دو گر نہیں تھا۔ وہ عالم تھا،“ کائنات کے ہر علم سے واقف۔ ”کسی بھی دوسرے کی قربت اس سے واقفیت پیدا کرتی ہے، پھر انسیت،“ تب جذبے ابھرتے ہیں، احساسات بنتے ہیں اور رشتے تشکیل پاتے ہیں۔ یہ ہے انسان اور انسانوں سے رشتتوں کا لفڑ۔ اینتا عورت ہے، لڑکی بھی تھی، اور بچی بھی، یہ ایسی ایکلی، اور اکیلا آدمی سدھ بدھ کھو دیتا ہے۔ اسے اپنالو۔ کردار مضبوط ہو تو انسان طاقت ور ہو جاتا ہے۔ موت ڈرے والی چیز نہیں، اپنالیے والی چیز ہے مگر اسے مارنا نہیں گیا۔ تمہیں اذیت دی گئی ہے۔ ایں،“ بھی مارا نہیں گیا تھا، اذیت دی گئی تھی۔ و تسلماً مرے گی نہیں اذیت اٹھاتی رہے گی مگر عطا مرگیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ رکے گا نہیں، آگے جائے گا۔ جو گناہ سرزد ہوا، جو معاملہ

”کیا تم شجھ گھری نکال رہے ہو؟“ طیب نے میرا کندھا ہلایا۔

”میں نے تم سے کھانے پینے کی بندوبست کا کما تھا۔“ میں جھنجلا گیا۔

”اور میں وعدہ یاد دلا رہا تھا۔“ وہ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔

میں نے دیکھا اینیتا بھی تک بکھری بکھری کی حالت میں بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر خجالت، کرب، تھکن سمجھی کچھ تھا۔ وہ نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر معمومیت تھی حالانکہ ایسی سب عورتیں ایکی تھیں جو مجبوری کی بناء پر حدیں پھاندلتی تھیں اور پھر غالباً حالات کی وجہ سے بے باکی ان کی طبیعت کا غصر بن کر ان میں کر خنگی پیدا کر دیتی تھی۔ بعض عورتوں کے چہرے پر تو کراہیت بھی پیدا ہو جاتی ہے مگر اینیتا اور فردت کے چہرے میں مجھے کچھ فرق محسوس نہیں ہوا۔ باقی سب باتیں تو دور کی بات ہے ہمارے ہاں تو عورت کا نشہ کرنا ہی اسے اپنی دنیا سے خارج کر دینے کو کافی تھا اور آکا بگایا کہ گیا تھا کہ میں اینیتا سے شادی کروں۔ وہ کرچکن تھی، آزاد اور بے باک تھی۔ میں تو اس کے بارے میں سوچنا تک نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے کردار کی مضبوط، نیک اور بچکی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس میں معمومیت محسوس کر رہا تھا۔ بہر حال میں ابھی چکا تھا۔ بات صرف اینیتا کی نہیں تھی۔ میرے معاملے میں تو فرحت کے علاوہ منے دادا، منی دادی، املاں اور بالخصوص بی جان بھی مجھ سے توقعات لگائے بیٹھکی تھی۔ فرحت کو میں کیا جواب دیتا؟ بی جان کو کیا منہ دکھاتا۔ منے دادا کا مسئلہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ پسلے ہی مجھ سے میرے خلاف فیصلے پر بات کر چکے تھے مگر پھر طیب..... کچھ بھی تھا، طیب کو میں فرحت کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

”مسٹر ضیاء!“ اینیتا کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”جی.....! جی!“

”کیا آپ میری باتوں پر یقین کریں گے؟“

”جی.....! کیا مطلب؟“

”جو کچھ میں کرنے والی ہوں، وہ مجھے خود کو بھی اپنی محسوس ہو رہا ہے۔ میں نہیں بانٹتی تھی کہ آدمی جب اچانک اپنے اندر کی تبدیلی کا کسی کو یقین دلاتا چاہئے تو کون سے ثبوت فراہم کر سکتا ہے، کیسے یقین دلا سکتا ہے؟ کوئی ایسا پیانہ نہیں جو اسے سچا مابت کر سکے۔“

بھی غور کر لیتا تو سب کچھ جان جاتا۔

”کچھ پوچھا ہے میں نے تم سے۔“ طیب نے مجھے چونکا دیا۔

”ہاں پا چکا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کیا کہ رہا تھا اور ہاں!“ میں ذرا بوجھلا گیا تھا۔

”یہ سب باتیں اسے بتائیں کس نے؟“

”میں نے تم سے کما تھا ناکہ وہ عامل ہے۔ بہت بڑا عامل،“ ہو سکتا ہے، اس کے پاس سامنی جادوگر والا شیشے کا گولا ہو۔ وہ سب دیکھ لیتا ہے۔“

طیب توقع کے میں مطابق بہک گیا تھا۔

”پلیز! آپ لوگ کچھ عجیب سی باتیں نہیں کر رہے..... یا میرا نشہ نہیں ٹوٹا؟“

یہ اینیتا تھی۔

”نشہ نہیں ٹوٹا تو بھی بڑا نیمت ہے محترم! ورنہ آپ کی تو گردن.....!“

”طیب.....!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو۔ میں سخت بھوکا ہوں اور یہ بھی یقیناً بھوکی ہوں گی۔“

”یہ بھی.....!“ طیب نے دانت نکال دیئے۔

”چپ رہو!“ میں جھینپ گیا۔

”ٹھیک ہے ابھی تو میں کھانے پینے ہی کا نہیں پوری تقریب کا بندوبست کرنے کو تیار ہوں مگر ضیاء.....! تم اپنا وعدہ نہیں بھولنا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”کیسا وعدہ؟“

”وہی فرحت والا۔ میں بھول گیا یا، آکا بگایا سے شجھ گھری تو نکلاویتا۔“

میرا دل بیٹھنے لگا۔ فرحت سے دشہدار ہوتا، اینیتا سے شادی کرنا، فرحت کو طیب سے منسوب کرنا مجھے اپنے بس میں نہیں لگ رہا تھا۔ آکا بگایا نے قطعی نہیں بتایا تھا کہ ایسا کیسے اور کیوں کر کروں۔ اس پر اعتبار نہ کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں اس کی بات سے انحراف کرنے کی جرات بھی کھوچکا تھا کہ جو کچھ اس نے کہتا، اس کی گہرائی میں ڈوپ کر سب کچھ پا جکا تھا اور یہ کوئی تک نہیں تھی کہ اینیتا کا ہاتھ کپڑ کر گھنٹوں کے بل بیٹھ کر اس سے درخواست کرتا کہ میں اس سے شادی کا خواہش مند ہوں یا اس سے عشق کر بیٹھا ہوں۔ جب کہ نہ شادی کی خواہش تھی نہ ہی اس سے عشق کر کا تھا۔

کرنے کی کوشش ہی کر سکتا تھا۔

”میں سچائی کو روشنی سے تعمیر کرتا ہوں مس انتیا؟ میرا بیمان ہے کہ آدمی بچ بول رہا ہو تو اس کے چہرے پر روشنی پھیل جاتی ہے، اس کے انداز، اس کی حرکات اور اس کا لبجھ اس کی سچائی پر دلالت کرتا ہے پھر..... آنکھیں..... ایک ایسی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں جسے جھلانا ضمیر کی عدالت میں ممکن نہیں ہوگا۔“

”اوہ ٹیکنس گاؤ!“

اس نے لمحہ بھر کو آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر دھیمی سی روشن مسکراہے پھیل گئی جیسے اس نے سچائی کے ٹھنڈے شفاف چٹے سے بنتے پانی میں پاؤں ڈال دیئے ہوں۔

”سچائی کو جھلانا انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے مس انتیا!“

”ہاں! مگر میں تو آدمیوں کے جنگل میں رہتی ہوں۔ یہاں تو اتنی تاریکی ہے کہ میں اپنے اندر کے انسان کو بھی صاف دیکھ نہیں پاتی۔“

”اگر دیکھنا چاہو تو کچھ بھی پوشیدہ نہ رہے مس انتیا۔ آپ بتائیے، کیا کتنا چاہتی ہیں۔“

اس نے پہلے مجھے غور سے دیکھا پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میرا جی چاہا کہ میں آنکھیں جھکا لوں مگر سوچا، شاید وہ ان میں بھی سچائی تلاش کر رہی ہو۔ سواں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا۔

”میں..... میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں۔“

”میں اچھل پڑا۔“ جی! ہاں.....! مگر کیوں؟“

”عجیب سوال ہے۔“ اس نے اوہ رادھر دیکھ کر مضطرب انداز میں کہا۔ ”یا مجھے لگ رہا ہے شاید اس لئے کہ..... میرے پاس اس سوال کا جواب اتنا واسع نہیں ہے اگر میں یہ کہوں کہ میں آپ سے متاثر ہو کر ایسا کر رہی ہوں تو کیا آپ یقین کریں گے؟“

اب کی بار اس نے پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ میں جن سا ہو گا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ میں مسلمان کے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ وہ مسلمان جن سے متاثر ہو کر کوئی اپنا نہ سب چھوڑ دیتا ہے، وہ تو اور ہی لوگ ہوتے ہیں۔ بہر حال مجھے ذوق ہوئی۔ آپ نے ایک اچھا فیصلہ کیا ہے گر بہتر ہو گا کہ یہ فیصلہ اسلام کے بارے میں پڑھنے کے بعد کرتیں۔ اس طرح آپ کے عقائد مضبوط ہوتے۔ آپ جان پاتیں کہ اسلام والی

نباہلہ جیات ہے۔ کسی مسلمان کے اچھے یا بے ہونے سے آپ کے عقائد پر زدنہ پڑتی اور میں تو بڑا گناہ گار بندہ ہوں۔ میرے لئے تو یہ بڑی سعادت ہوئی کہ آپ نے مجھ سے ناٹھ ہو کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ اب شاید یہی بات، اسی سعادت کا احساس مجھے گناہوں سے بچا لے۔ میں کوشش کروں گا کہ میرا یا میرے نہ سب کا انتیج آپ کی نگاہ میں متاثر نہ ہو۔“

”میں..... میں نے اسلام کا کافی مطالعہ کیا ہے۔“ اس نے مجھے چونکا دیا۔

”جی!“

”میں ہاں! اسے میری بد قسمتی کہہ لیں کہ بیویشہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ہو گئی کہ میں بیٹا کے ہر نہ سب سے چلنے لگی تھی۔ میں سوچتی تھی جب آدمی کے قول و فعل میں اتنا

ذن ہے تو پھر آدمی یہ یقین کیسے کر لے کہ اس آدمی کا نہ سب سچا ہو گا۔“

”میں نے عرض کیا تھا کہ آدمی کا برا یا اچھا ہونے سے نہ سب کا کوئی تعلق نہیں ہوتا بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ بات کو سمجھ نہیں پاتا۔ بھی قول و فعل میں تضاد رکھتا ہے اگر بات اس کی سمجھ میں آگئی ہوتی تو.....!“

”سوری مسٹر فیاء.....! میرا دماغ بہت بو جھل ہے۔ ہم اس موضوع پر پھر گفتگو کریں گے۔ میری خواہش ہے کہ میں ان سوالوں کے جواب حاصل کر لوں جو مجھے سننی ہوں۔“

”اوہ.....! ہاں.....! میں آپ کے لئے چائے اور کچھ کھانے کا بڑو است کرتا ہوں یہ طیب.....! اپنا نہیں، کہاں گیا؟“ میں انہ کر بہر نکل گیا۔

بہر طیب اکیلا نہیں تھا۔ گوپال بھی آپکا تھا۔ میں دور ہی سے ان دونوں کو دیکھ کر مجھ گیا تھا کہ طیب برداشت نہیں کر سکا ہے اور وہ ساری کہانی گوپال کو سنا پکا ہے۔ گوپال کے چہرے پر تختخہ تھا۔ بے یقین تھی۔ مجھے خیال نہیں رہا کہ میں طیب کو منع کر دیتا۔ جب بہر جیت اگلی طور پر ٹھیک ہو چکا تھا تو اسے بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، یہ ضرورت انی وقت پڑتی جب، میں اپنی گرفتاری کا خطرہ ہوتا۔ امیتا اتفاقی قبل ہو چکی ہوتی۔ قتل تو ہوئی تھی مگر یہ سب جو کچھ اس مختصر سے عرصے میں ہو چکا تھا اس پر سوچنے کا موقع ہی میں لیا ہیا تھا۔ جی پوچھیں تو میری ذہنی حالت قطعی درست نہیں تھی۔ جو واقعات اب لگ ہوئے تھے، یہ واقعہ ان سب سے قطعی جدا تھا۔ صرف میں نے ہی اس کی گردن کئی اُل دیکھی تھی اور اب اسے ٹھیک حالت میں دیکھا تو اسے زیوسا کی ایسی حرکت سمجھ کر

بھول چکا ہوتا جس کا مقصد صرف مجھے ہر سال کرنا ہو مگر اس کے قتل ہو جانے کی اطاعت طیب نے دی تھی۔ اب اینتا نہ صرف یہ کہ بالکل ٹھیک تھی بلکہ اب تو مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی بھی انک خواب سے جاؤ اٹھا ہوں۔

”فیاء تمہارے منع کرنے کے باوجود شاید طیب نے تمہارے سو جانے کے بعد بہت چڑھا۔ اس کا نشہ اب تک نہیں اترا۔“ گوپال مجھے دیکھ کر مصافعے کے لئے میرے طرف پڑھا۔

”دیکھو ضیاء! یہ..... یہ یقین ہی نہیں کرو رہا کہ.....“ طیب نے کہا۔

میں نے گوپال کی نظر پا کر اسے گھورا۔ وہ پٹا گیا۔ ”اسے نئے میں بھکنے کے لئے کچھ کھانے پینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ پر بلم اسے بچپن سے ہے۔“ میں نے مکراز اس سے ہاتھ لایا۔

”ویسے اینتا ہے کماں؟ میں تو سمجھا تھا، وہ چلی گئی ہوگی۔ اس کی ماں سورج کی پبل کرن کے ساتھ ہی اس کا انتظار شروع کر دیتی ہے۔ یہ بات مجھے اسی نے بتائی تھی۔“

”کیا وہ..... جانتی ہیں کہ.....“ میں ایسی بات پوچھنے والا تھا جو شاید مجھے نہیں پوچھنا چاہئے تھی مگر جلد ہی احساس ہو گیا کہ غلط ہے۔ ”آئیے.....! میرا خیال ہے کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے نہیں گئیں۔“ پھر میں طیب کی طرف پلا۔ ”تم نے چائے کا بندوبست کروایا؟“

”کیوں لڑکا نہیں آیا کیا؟“ گوپال چلتے چلتے رک گیا۔ ”آگیا ہے۔ بنا رہا ہے۔ میں نے اسے پرانے ہنانے کو کہا ہے۔“ طیب نے جواب دیا۔

میں گوپال کو لئے اس کمرے میں داخل ہوا جمال اینتا تھی۔ وہ کمرے میں نہیں تھی لیکن باتح روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔ طیب ہمارے ساتھ نہیں آیا تھا۔ گوپال نے اور ادھر کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ”مکمل ہے! یہ میرے ہی گھر کا کمرہ ہے مگر میں نے یہاں شاید دوسری بار قدم رکھے ہے۔“

”غالبا یہ کمرہ آپ کی بیوی نے سیٹ کروایا ہوگا، اپنے لئے۔“ میں نے بھی کمرے پھر پور جائزہ لیا۔

”میں تو جی اس نعمت سے ہی محروم ہوں۔“ وہ ہنس۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میری شادی نہیں ہوئی۔ مان کو بڑا ارمان تھا مگر اس بیچاری کے کوئی ارمان پورے نہیں ہوئے تو یہ کیسے ہوتا۔ میں تو تیار بھی ہو گیا تھا۔ اس نے کوئی لڑکی پسند کی تھی۔ میں نے دیکھے بغیر ہاں بھی کر دی تھی کہ وہ ذرا بھی دلکھ محسوس نہ کرے مگر..... یا را! کچھ لوگ بننے ہی دکھ اٹھانے اور صرف دوستوں کے ارمان پورے کرنے کے لئے ہیں۔ انہوں نے ساری زندگی محنت کر کے میرے باپ کے ارمان پورے کئے۔ باپ نے منزل پائی تو دوسری شادی کر کے ہم دونوں کو چھوڑ گیا۔ پھر وہ میرے ارمانوں کو پورا کرنے میں لگ گئیں۔ میں نے کوشش کی کہ اب اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہوں تو امام کے بھی ارمان پورے کر دوں۔ انہیں سکھ دیا۔ فرمائے بردار رہا۔ گھر بنا کر دیا۔ جو کچھ کہا پورا کیا مگر بقول ان کے آخری ارمان مجھے آباد دیکھنے کا تھا، ان کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا مگر سارا موت آڑے آگئی اور..... اب..... اب کیا کروں گا شادی کر کے۔“

اس سے پسلے کہ میں اس سے افسوس کا انہصار کرتا، وہ چونکا پھر بول اٹھا۔ ”یہ طیب کیا کہ رہا تھا میری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آئیں۔“

”کیسی باتیں؟“ میں نے صرف یہ سوچنے کے لئے سوال کیا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں گا حالانکہ میں جانتا تھا کہ اس نے کیا بتایا ہو گا۔

”وہ کہ رہا تھا کہ اینتا قفل کر دی گئی تھی۔ کوئی آکا بگایا نام کا آدمی آیا تھا۔ وہ ٹھیک ہو گئی اور..... اور کوئی پُرسار چیز تمہارے پیچھے پڑی ہے۔ ویسے یہ نام آکا بگایا۔ میں نے کہیں اور کہیں سننا ہوا ہے۔ ہوا کیا تھا؟“

”نہیں، ہوا تو کچھ بھی نہیں..... دراصل یہ تو درست ہے کہ ایک پُرسار طاقت میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ میں اس کے بارے میں ٹھیک سے جانتا ہی نہیں، آپ کو کیا بتاؤں؟ اینتا ولا معا靡ہ بھی..... میرا خیال ہے کہ اسی طاقت نے ہماری نظر بندی کر دی ہو گی۔ وہ بے خبر سورہی تھی اور ہمیں لگا جیسے مرچکی ہے۔“ یہ بھی اسے نہ کچھ بھاپا تھا۔ نہ میری سمجھ میں آرہا تھا کہ کیا بتاؤں۔

”ویسے طیب کو میں جانتا ہوں۔“ وہ ہنس۔ ”ہے بہت چھوڑو۔“ عین اسی لمحے اینتا سر پر قویہ لپٹیے باہر آگئی۔ اس نے گوپال کو دیکھ کر خوشی کا انہصار

نقول قسم کے مذاق کرتے رہے۔ انتبا بھی ان کے ساتھ شریک تھی۔ وہ کبھی کبھی اپنی لمبی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھ لیتی۔ اس کی آنکھوں میں چاہتا کی گمراہی تھی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ یہ سوچنا بھی میرے لئے اجنبی ساتھا کر مجھے اسی سے شادی کرنا ہے پھر ذرا دیر پسلے کا خیال آ جاتا تو میں اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنتاہٹ محوس کرتا کہ یہی لوکی جو ابھی قتل ہو گئی تھی (جس کے قتل ہو جانے میں مجھے کوئی شبہ نہیں تھا) وہ اب بیٹھی چائے کا کپ تھا مے طیب اور گوپال سے نہ کرباتیں کر رہی ہے۔

بس ایک احساس تھا کہ کوئی بڑا طوفان آنے والا ہے۔ بت خوفناک قسم کا۔ جس میں شاید سب کچھ بہس جائے اور میں..... میں قطعی بے بس ہوں۔

”بھائی میاں!“  
طیب نے میری آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرا�ا۔ میں چونک اٹھا۔ ”ہوں.....!  
کیا؟“

”کہاں ہو؟“  
”میں..... میں تھک گیا ہوں۔“ میں خالی کپ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آرام کروں گ۔“ میری نگاہ انتبا پر پڑی جو مجھے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے نگاہ چڑا۔ ”طیب! گھٹنا بھر کے بعد مجھے اٹھا دینا۔ شاید میں سو جاؤ۔“

پھر میں وہاں رکا نہیں۔ گوپال سے ہاتھ ملا کر، انتبا سے اجازت لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ میرا ارادہ سونے کا تھا مگر بستر پر لیٹتے ہی میری نیند اور تھکن غائب ہو گئی۔ ہزاروں باتیں دماغ میں گونجتے لگیں۔ بے چینی بڑھنے لگی۔ گزرا ہوا پل پل جیسے پورے دودو میں زہر بن کر دوڑنے لگا۔ فرستت کی بیجی لگا ہیں، زیوسا کے عذاب، ’شال بیا کی باتیں‘، جیزو کی درد بھری پکار، رابرت کی ٹھکنیاہٹ، سورن سگھ کا جالے میں جکڑا بدن اور اب..... انتبا کی زندگی کے وہ پل جو موت کی گود میں گزرے تھے پھر وہ پُر اسرار آکا پا گیا..... ان سب باقیوں نے میرا دماغ پھوڑے کی طرح پکا دیا۔ کبھی میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ آنے والے لمحات اپنے جلو میں عذابوں کو ساتھ لائیں گے یا سکون کو..... میں اس آکا بگایا سے اپنے خدشات کا اظہار کرنا چاہتا تھا گرروہ غائب ہو چکا تھا۔ ایک ایسا حکم صادر کر کے نہ بجا لانا میرے بس میں نہیں لگ رہا تھا۔

میں پتا نہیں، کب تک سویا اور کیسے سویا۔ شام کو طیب نے مجھے اٹھا دیا۔ اس سے

”تم گئی نہیں؟“

”ہاں! مجھے خود بھی حرمت ہے ورنہ تمہیں تو پتا ہے، میں دن نکلنے سے پہلے گھر پہنچ کی عادی ہوں۔ پتا نہیں گوپال.....!“ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے اب مجھے کہیں بھی نہیں جانا ہے۔ جیسے میں..... اپنی منزل پر پہنچ گئی ہوں۔ ”وہ بالکل سامنے بیٹھ گئی۔ خوشی سے اس کے چہرے پر روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔

”اے..... خاتون!“ گوپال نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرا�ا۔

”یہ آپ کی منزل نہیں، میرا گھر ہے اور یہاں سے آپ کو ہر حال میں جانا ہے۔ ناشتا کر لیں، سامان کمیں اور نو دو گیارہ ہو جائیں۔ آپ کو پتا ہے، دن کے گیارہ بج رہے ہیں اور آپ کی ماما کا بلڈ پریشر اب آسمان سے باشیں کر رہا ہو گا۔“

”ہوں.....!“

وہ پُر سوچ انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں خاموش بیٹھا تھا۔ طیب ابھی تک نہیں آیا تھا۔

”چجھے تو جانا پڑے گا۔ مگر تھوڑی دیر کے لئے۔ میں ماما کو.....“

”او بھائی..... او محترم!“ گوپال نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ یہ تمہاری منزل نہیں ہے۔ بڑے خون پینے کی کمائی سے گھر بنوایا ہے میں نے۔ ماں جیتی رہتی تو یہاں میرے آٹھ دس بچے گھوم رہے ہوتے۔“

میں اسی لمحے طیب کرے میں داخل ہوا۔ وہ غالباً گوپال کا جملہ سن چکا تھا۔ اس کے پیچھے وہ بچہ بھی تھا جو کام کرتا تھا۔ وہ ٹرالی لئے اندر داخل ہو رہا تھا۔

”یا! یہ شادی کرتے ہی آٹھ دس بچے کیسے ہو جاتے ہیں؟“ طیب یوں پوچھ رہا تھا جیسے ریاضی کا کوئی سوال حل کرو رہا ہو۔

”شادی کرتے ہی بناوں گا۔“ گوپال نے میز پر سے گلدان وغیرہ ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے، لیکن بھولنا نہیں۔“ طیب نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا اور ٹرالی سے چیزیں نکال کر میز پر سمجھانے لگا۔

میرا ذہن بالکل خاموش تھا۔ کسی سوچ کی آہٹ تھی نہ کسی تصور کی موجودی کی احساس، یوں جیسے گرا سناٹا پھیلا ہوا ہو۔ میں نے خاموشی سے چائے پی۔ طیب اور گوپال

کیا۔

بدر پڑے گا ورنہ آکا بائیا پاگل نہیں ہے جو.....  
”میں انتا سے.....“

ابھی اس نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ اچانک وہ لڑکا جس کا نام ریاض تھا، دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ ہم دونوں چونک اٹھے۔ اس نے دستک دیئے بغیر دھڑکے دروازہ کھولا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے اس کے چہرے پر سراسیکی محسوس کر کے فوراً پوچھا۔  
”وہ..... بی بی آئی ہیں۔ باہر گاڑی میں..... ان کے ساتھ..... وہ  
ل..... وہ مرد ہی ہے۔“

اس نے عجیب بے ربط جملے کئے۔ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا اور کس کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ یہ جانے بغیر ہم دونوں ایک ساتھ ہی باہر بھاگے۔ گیٹ کے پاس ٹیکی کھڑی تھی۔ ٹیکی میں انتا تھی اور اس کی گود میں ایک اویڑی عمر کی عورت زخمی حالت میں پڑی تھی۔ ایک چودہ پندرہ برس کی لڑکی بیٹھی تھی جو صورت شکل سے ہی انتا کی بین لگ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ میں نے اور طیب نے ساتھ ہی پوچھا۔  
”ماما کا ایکیڈنٹ ہو گیا ہے۔ بلیز.....!“ انتا نے کہا، جس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، پھر وہ روپڑی۔

میں کچھ بھی کے بغیر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ریاض دروازے پر کھڑا تھا۔ طیب نے سے دروازہ لاک کر کے گھر چلے جانے کا کہا اور ٹیکی آگے بڑھ گئی۔ ہم ہسپتال جا رہے تھے۔ اب میں نے جائزہ لیا۔ وہ عورت بے ہوش تھی اور کافی زخمی تھی۔ راستے میں انتا نے بتایا کہ اس کے گھر پہنچنے کے بعد اس کی ماں بازار جانے کو نکلی ہی تھی کہ اس کا بیکیڈنٹ ہو گیا۔ وہ تفصیل بتاتی رہی مگر میرا ذہن عجیب سی جکڑن کا شکار تھا۔ بے پناہ اس ساتھ مگر پتا نہیں، لگ رہا تھا کہ ایسا کیوں ہے؟

ہم ہسپتال پہنچے۔ ہسپتال کا عملہ انتا کی ماں کو اسٹریچر پر ڈال کر لے گیا۔ انتا کی بین، اس کے ساتھ چلی گئی۔ میں اور طیب پیچھے پیچھے تھے۔ ڈاکٹر نے فوری توجہ دی مگر جو خبر اس نے سنائی، وہ بہت منحوس تھی۔ انتا کی ماں مر چکی تھی۔ انتا اور اس کی بین دھاڑیں دار مار کر رونے لگیں۔ میں اور طیب حواس باختہ ہو گئے۔ ڈاکٹر تسلیاں دینے لگے مگر

پتا چلا کہ گوپال اور انتا جاچکے ہیں۔ میں صح سے بھوکا تھا۔ کام کرنے والا لڑکا کم عمر تھا مگر بہت تیز تھا۔ اس نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ وہ کھانا لایا۔ میں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ کھانا کھا کر میں کھڑی میں آکھڑا ہوا۔ یہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ سامنے مصروف سڑک تھی۔ لوگ آجاتے ہے تھے مجھے احساس ہوا کہ میں یہاں یوں کیوں کھڑا ہوں۔ تو کری تقریباً چھوٹ گئی تھی اس لئے کہ میں نے پھر چھٹی کی درخواست بھج دی تھی۔ اس بارے بغیر تزوہ کے کچھ چھٹیاں مل رہی تھیں لیکن یہ ختم ہونے کے بعد یقیناً میری نوکری کو خطرہ لاقع ہو جاتا۔ ڈیوٹی جوان کرنے کے لئے مجھے دہلی جانا پڑتا جبکہ میں یہ سوچ کر یہاں چلا آیا تھا کہ شاید اس طرح زیوسا میرے گھر والوں کا یچھا چھوڑ دے۔ آخری بار وہ گئی تو خاصہ غصے میں تھی۔ بھر حال مجھے اپنا وجود بالکل بیکار، بے مقصد لگا۔ میں ایک ہٹاکٹا نوجوان تھا۔ مجھے تو زندگی کی رفوار کے ساتھ چلناتھا جا جبکہ اب ٹھہر جانے کا احساس بڑھ رہا تھا۔ آدمی کھڑا ہو اور پل گزر رہے ہوں تو بڑا ٹھہردا دینے والا احساس بیدار ہوتا ہے۔ وہی احساس مجھے میں مایوسی پھیلا رہا تھا۔ طیب خاموش لیٹا میری کیفیت کو بھانپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں کیا کروں یا را!“ میں ایک دم پلٹ کر بولا۔

”وہی جو آکا بآگیا نے بتایا ہے۔“ اس نے بالکل اطمینان سے جواب دیا۔ ”بلکہ پہلا کام تو یہ کرو کہ منے دادا کو خط لکھ کر خیریت پتا کرو۔ خط روانہ کرنے کے بعد سنبھالی گئے انتا کے بارے میں سوچو۔ شادی تو تمہیں کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں کرتا ہی تھی۔ میرے خیال میں میرٹھ یا دہلی میں تو کوئی ایسی لڑکی ہے نہیں جو تمہارے ساتھ زندگی گزارنے پر رضامند ہو جائے۔ تمہاری اماں کو بھی تمہاری شادی کی کوئی فکر نہیں ہے۔ ادھر میرے اماں، ابا کو بھی میری چلتا نہیں۔ تمہاری شادی ہو جائے تو میں بھی ہاتھ پاؤں ماروں گر تھارا معرکہ سر کرنے کے بعد..... بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اسی ہنگامے میں، میں منے دادا سے فرحت کی بات بھی کرلوں گا۔“

”بکواس مت کرو۔“ میں ایک دم ہی الجھ کر چیخ پڑا۔

”کیا مطلب؟ اس میں بکواس کیا ہے؟“ وہ سچ پا ہو کر بولا۔  
”لگ..... کچھ نہیں..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“ میں نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔  
”ویکھو ضیاء! تمہیں جلد از جلد فیصلہ کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سے فرق

دیکھتے ہی دیکھتے اینتا کی چھوٹی بن بے ہوش ہو گئی۔ سب اس کی مان کو بھول کر اے سنبھالنے لگے۔ ڈاکٹر نے بھی اس پر فوری توجہ دی پھر میں نے محسوس کیا کہ ڈاکٹر پریشان ہو گئے ہیں۔ طیب اینتا کو سنبھالے تھا۔ وہ بڑی طرح چکل رہی تھی۔ میں نے طیب سے کہا کہ وہ اینتا کو ایسر جنسی وارڈ سے باہر لے جائے۔ ڈاکٹر سملگ نے بھی میری آئندہ کی۔ طیب اسے باہر لے گیا جبکہ وہ جانے کو تیار نہ تھی۔ ان دونوں کے باہر جاتے ہی ڈاکٹر سملگ نے اینتا کی بن کو آئی سی یو میں پہنچانے کا حکم دیا۔ ذرا سی دیر میں افراد غیری بچ گئی۔ میں پریشان ہو گیا۔

”مشتری.....!“

”ضیاء!“ میں نے جوابا کمال۔ ”کیا بات ہے؟“

”ابھی کہہ نہیں سکتے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ صدمے سے ..... بہر حال، میں بعد میں بتاؤں گا۔“ اتنا کہہ کروہ تیزی سے اندر چلے گئے۔ باہر سننا چھا گیا۔ میرے سامنے نیبل پر اینتا کی مان کی لاش پری تھی۔ اندر ڈاکٹر اور عملے کے دوسرا لوگ اینتا کی بن کو چیک کر رہے تھے۔ میں نجف پر اکیلا بیٹھا رہ گیا۔ میری نگاہیں اینتا کی مان کے چہرے پر جو ہوئی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ تو گواہیں تھیں۔ رات ہی تو مجھے اینتا نے بتایا تھا کہ اس کی مان اس کے جھٹے بمن بھائیوں اور بپاپ کے ساتھ گواہیں ہے پھر یہاں کب آئی؟ جو تفصیل وہ ٹیکسی میں طیب کو بتا رہی تھی، وہ میں نے الجھن میں سنی نہیں تھی۔ میں اسی سوچ میں تھا کہ اچاک ایسر جنسی وارڈ میں اندر کی طرف بنے آئی سی یو کا دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر سملگ باہر آئے تو ان کے چہرے پر سنجیدگی میں چھپا درد اور کچھ حیرت سی مجھے فوراً محسوس ہو گئی۔ میں ان کی طرف لپاک۔

”مشتری ضیاء.....! مجھے افسوس ہے .....!“

”کیا مطلب.....؟“ ”میرا دل دھڑک اٹھا۔“

”ہم اس لڑکا کو نہیں پھاٹکے بلکہ ..... ہمیں ایسا موقع ملا ہی نہیں۔“ ”میں ..... گرتے ہی مر چکی تھی۔“

”کیا.....؟“ میں نجف اٹھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کیا ہارت ائیک .....؟“

”شاید۔“ انہیں نے پڑ مردہ انداز میں جواب دیا۔ ”ایسا اس ہپتال میں پہلی بار ہو رہا ہے کہ مان کی بستی تصدیق سے پہلے ہی اس کی بیٹی مر گئی ہو۔“

”میں ..... یہ لڑکی کون تھی ..... یہ دونوں .....!“  
 ”جبی .....! یہ ..... میری ساس اور سالی .....!“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں خود ہی چپ ہو کر رہ گیا۔  
 ”مجھے افسوس ہے۔ آپ کی بیوی کا صدمہ بہت بڑا ہو گا۔ انہیں سنبھالنے گا پلیزا۔“  
 میں دیتھ سرٹیفیکٹ بنا دیتا ہوں۔ ویسے یہ .....!“ اس نے اینتا کی مان کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ پولیس کیس ہے۔ میں نے علاقے کے تھانے فون کر کے اس ایکسٹریٹ کی اطلاع دے دی تھی۔ وہ لوگ پہنچنے والے ہوں گے۔“  
 ”پولیس کیس؟“ پچھے سے طیب کی آواز سنائی دی۔ وہ جانے کب اندر آگئا تھا۔

”یہ کیا مصیبت ہے یا را!“

”اینتا کیا ہے؟“ میں نے اس کی جھنجلاہٹ کو نظر انداز کر دیا۔

”باہر .....!“ ڈاکٹر نے اسے بن کے بارے میں بھی بتا دیا ہے۔ ضیاء! حیرت ہے کہ وہ اب بالکل خاموش ہے جیسے اس کا ان دونوں سے کوئی رشتہ ہی نہ ہو۔“ طیب بتا رہا تھا۔

”اکیلے رہ جانے کا احساس بھی کبھی کبھی آدمی کو پھردا دیا کرتا ہے طیب!“ میں نے دکھ سے کہا۔ یہ میرے اپنے احساسات تھے۔ گو میں نے اینتا سے شادی کا ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ یہ فیصلہ اسی آکا بگیا کا تھا مگر جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں سارے خاندان سے پچھر کر، فرحت سے پچھر کر اکیلا ہو گیا ہوں۔ میرا دنیا میں کوئی بھی نہیں رہا۔ خود اینتا بھی اپنی مجسم حیثیت میں میرے تصور میں نہیں تھی۔ صرف اکیلے پن کیلیا احساس تھا۔

زور دی بعد ہی پولیس آفیسرز بھی آگئے۔ انہوں نے اینتا سے کچھ پوچھ گچھ کی۔ میں بلد ہی وہاں سے فارغ ہو گیا۔ ہپتال کی ایسویں نس نے دونوں میتین گھر پہنچا دیں۔ اینتا ایسویں میں تھی۔ میں اور طیب نیکسی لے کر پچھے چل پڑے تھے۔ میں نے پہلی بار اینتا کے گھر میں قدم رکھا تو پتا نہیں، کیوں یہ احساس ہوا کہ میں یہاں پہلے بھی آچکا ہوں۔ ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود کچھ یاد نہیں آیا۔ یہ تمام علاقہ کرچکن لو کیلئی کا تھا اور مجھے یاد نہیں تھا کہ میں کبھی اس طرف آیا ہوں۔ طیب کفن دفن میں لگ گیا۔ اینتا کا چہرہ بالکل ساپت تھا۔ اس نے مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا تھا جہاں علاقے کے کچھ اور اگر بھی

احساس کے ساتھ جیسے انتیا سے ابھی نکلا پڑھوا کر ہر مسئلے سے آزاد ہو جاؤں گا۔ نیں نہیں جانتا کہ یہ میری چھٹی حس تھی کہ باہر سے ریک آنے والا کوئی خیال..... مگر میں بالکل طیب کے سے انداز میں سوچنے لگا۔ میں نے انتیا کو اب اس کمرے میں نہیں نہ صورا یا جمال وہ رات ٹھہری تھی بلکہ ہم نے طیب والا کمرہ اسے دے دیا۔ میں اور طیب ڈرائیور روم میں آبیٹھے۔ میرا خیال تھا کہ انتیا یقیناً تمکھ گئی ہو گی اور اب آرام کرے گی مگر جلد ہی وہ کپڑے بدلتے ہوئے اتھر دھو کر ڈرائیور روم میں چلی آئی۔

”آپ سوئیں نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں! چائے پیوں گی۔ آپ پیسے کے؟“

”ہا! اگر زحمت نہ ہوتی.....“ میں نے جھجک کر کہا۔

”مجھے زحمت نہیں، خوشی ہو گی۔“ وہ انتیاً مشرق قسم کی عورت تھی۔ کل میں نے اسی انتیا کو جس انداز میں باتیں کرتے، شراب پیتے اور قصتے لگاتے دیکھا تھا، وہ آج اس سے بالکل مختلف لگ رہی تھی۔

وہ چلی گئی۔ میں سن بیٹھا دیکھتا اور سوچتا رہا۔ آپ میری کیفیت کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھے اس تمام صورت حال سے کس قدر کوفت ہو رہی تھی۔ میں ایک نہایت شریف قسم کا آدمی تھا۔ میں باپ اور گھر کے بیوں کا احترام کرنے والا۔ خدا پر مکمل ایمان رکھنے والا۔ نظر اوپھی کرنا یا آواز اوپھی کرنا میرے نزدیک غلط تھا۔ گناہ سے خوف اور نیکی سے لگاؤ تھا مگر حالات مجھے کمال سے کمال لے آئے تھے۔ میں کیا کیا کر کچا تھا۔ فرحت کے بارے میں پاکیزہ جذبے رکھنے کے باوجود زیوسانے فرحت کا روپ دھار کر مجھے میری ہی ٹھہروں میں ذلیل کر دیا تھا اور کل رات میں انتیا پر بھی وہی ظلم کرچکا تھا، جس کے احساس نے شاید آکا بگیا کے کچھ گئے فضیل کی ٹکنی بتتھ کر دی تھی۔ فرحت کے بارے میں تو مجھے پاچھل چکا تھا کہ وہ جس کے ساتھ وقت گزارا تھا، فرحت نہیں تھی، زیوسانی مگر انت..... انتیا کے ساتھ گزرے پل میرے ضمیر میں بھالے بن کر اتر گئے تھے۔ اور اب نورت نے ایک ہی دن میں اسے بالکل اکیلا کر کے پھر میرے پاس بیجھ دیا تھا۔ میں آج لوگوں کا ناہ کرنے کو تیار نہیں تھا مگر..... میں کل بھی کب تیار تھا؟ وہ تو ایک طوفانی بیغت تھی جو باہر کیس سے مجھ میں در آتی تھی اور بے قابو کر دیا کرتی تھی۔

مگر آج میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے طیب کو تمام رات اپنے ساتھ

اگئے تھے۔ یہ بھی میرے لئے اجنبی ہی تھے۔ بس اس ایک احساس کے سوا اور کوئی احساس نہیں تھا۔ گوپال آیا تب ذرا میں اس احساس کے ٹکنے سے باہر آیا۔

ہمیں وہاں رات ہو گئی۔ علاقے کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اب گھر میں صرف میں، طیب اور گوپال رہ گئے۔ انتیا بالکل خاموش ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ آکا بگیا کا قیصلہ زیادہ تکمین محسوس نہیں ہوا۔ طیب پریشان تھا کہ انتیا کو اکیلا کیسے چھوڑا جائے۔ میں نے کچھ نہیں کہا تھا۔ گوپال نے ہمت کی اور اسے گھر پہنچنے کو کہا۔ وہ پرمادید نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میرے منہ سے کچھ سنتا چاہتی ہو۔ میں نے پسلے نگاہ چالی پھر دھیرے سے افسوس کیا۔ اس کے اکیلے پن کو اذیت کہا۔ اسے ساتھ چلنے کو کہا۔ وہ فوراً تیار ہو گئی۔ اب اس کی آنکھوں میں جھللا ہٹ تھی، آنسوؤں کی بھی اور..... غالباً خوشی کی بھی جسے اور کسی نے محسوس کیا ہوا یا نہیں، میں نے محسوس کر لیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آگیا اور میں نے پوچھ لیا۔

”تمہاری والدہ تو گواہیں تھیں؟“ پھر..... یہ.....“

”میں گھر پہنچی ہوں تو یہ آچکی تھیں۔ باپ انہیں گھر چھوڑ کر کمیں چلا گیا تھا۔ بالکل بچوں کو بھی لے گیا۔ ایک بن باپ کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ شاید موت راہ بنا رہی تھی۔ وہ بازار کے لئے نکل تھیں کہ..... میں اس وقت گھر میں تھی۔ چیخ کی آواز سنی تو باہر بھاگی۔ کار والا کچل کر فرار ہو رہا تھا۔ میں دیکھنے نہیں سکی کہ.....“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”چھوڑو ضیاء.....!“ طیب نے ٹوک دیا۔ ”چلو!“

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ گوپال جیپ میں تھا۔ اس نے ہمیں گھر پر چھوڑ دیا۔ رات پھر آگئی تھی۔ میں خوفزدہ ہوا۔ آج بھی کچھ ہو سکتا تھا۔ زیوساکی دشمنی مول لی تھی۔ جو نہ ہوتا، کم ہوتا۔ میں نے موقع ملنے پر طیب سے کہہ دیا کہ آج رات جانانا ہے۔ کوئی نیا گل نہ کھل جائے۔ طیب کو یاد آگیا۔ وہ سفید پڑ گیا۔

”ضیاء.....! نہ..... اس سے آج..... اسی وقت شادی نہیں کر سکتے؟“

”کیا؟ پاگل ہوئے ہو۔“ میں جھلایا۔ ”اس بات سے شادی کا کیا تعلق؟“

”..... تھے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ آکا بگیا نے کہا ہے تو ٹھیک ہی تو ہو گا۔“

پتا نہیں، کیوں میرے دل میں بھی یہ خواہش بڑی شدت سے ابھری اور اس

”کیا ہوا؟“  
”کیا ہوا؟“

دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔ ”یہ..... یہ طیب!“ مجھ سے کچھ بولا نہیں گیا۔  
انیتا بستر سے اتر کر میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی جب کہ طیب  
پر سکون تھا بلکہ اس کے چہرے پر دھمکی کی مسکراہٹ پہلی ہوئی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں بھائی۔“  
یہ طیب تھا جو انیتا سے مخاطب تھا۔

”بھائی؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میں پچھے صوفی پر بیٹھتا چلا گیا۔  
”بھائی! آپ چائے بنا کر لائیں۔ شاید ضیاء کی طبیعت کچھ خراب ہے۔“

اب طیب میرے اور انیتا کے درمیان میں آگیا تھا۔ میں انیتا کے چہرے پر اس جملے  
کا رد عمل نہیں دیکھ سکا۔ وہ کمرے سے باہر چل گئی۔ طیب میری جانب پڑا۔

”طیب..... یہ یہاں..... اور.....“  
”مبارک ہو ضیاء۔ تمہاری شادی ہو گئی۔“

”مگر..... کیا؟ تم پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ میں چیخ اٹھا۔

”پلیز ضیاء! نیک اٹ ایزی۔ میں ابھی سب کچھ بتاتا ہوں مگر یوں واڈیلانہ چاؤ۔“ ہم  
انیتا پر کسی قسم کی کوئی خوفناک بات ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔ اگر رات میں نے تمہارا نکاح نہ  
پڑھا دیا ہوتا تو..... تو شاید ہم دونوں..... بلکہ یوں یہاں نہ ہوتے اور میں وہاں  
نہم میں اکیلا..... تم دونوں کے بغیر بہت اوہس ہو گئے۔“

”بکواس مت کرو۔ سیدھی طرح جواب دو۔“ غصے اور صدمے سے میرا بدن  
لکپ رہا تھا۔

”ضیاء!“ اب طیب واقعی سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے میرے بالکل سامنے بیٹھ کر کہا  
شروع کیا۔ ”کل رات شاید بہت خوفناک طوفان آنے والا تھا۔ تمہیں یاد ہے، ہم لوگ  
اڑانگک روم میں بیٹھے باقی کر رہے تھے؟“

”ہاں.....! پھر؟“

”پھر اچانک تمہاری کیفیت بدلنے لگی۔ انیتا تمہاری طرف متوجہ نہیں تھی مگر میں  
لے تمہارا چڑھ دیکھا تو..... تو جانتے ہو مجھے کیا لگا؟“ وہ مجھے غور سے دیکھنے لگا۔ پھر

رکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زرادیر بعد انیتا چائے کی ٹرے اور ہٹیٹیز لے آئی۔ مجھے ہٹیٹیز دیکھ  
کر ہی بھوک کا احساس ہوا۔ ہم نے چائے کے ساتھ ہی اپنی بھوک بھی مٹائی۔ اسی دوران  
میں کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ کبھی کبھی میری نگاہ اٹھتی تو انیتا کی نرم نگاہوں سے نکرا  
کر پلت آتی۔ طیب کا سارا دھیان صرف کھانا اور پینے میں تھا۔

رات کافی گزر پہلی تھی۔ طیب کپڑے بدلتے کے لئے گیا تو تنہائی میں خوف مجھے  
جگڑنے کو لکا۔ انیتا میرے سامنے تھی۔ میں نے اٹھنا چاہا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے دیکھا اور  
مجھے لگا جیسے کہیں دور سے تیز آندھی آکر پوری شدت سے میرے وجود میں چکر کھانے لگی  
ہے۔ میں طوفانی ہواں کی زد میں تھا۔ دماغ چکرا رہا تھا۔ ہاتھ پیروں کی جان نکلی جا رہی  
تھی۔ میں پوری قوت سے خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے مجھے کپڑا  
لیا۔

میں نے دھنڈ لائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ وہ طیب تھا۔ اس کے چہرے کے قریب  
ہی مجھے آکا باگیا کا چڑھ بھی دکھائی دے گیا۔ دھول میں اٹا، آنکھوں میں وحشت سیئی۔ وہ  
سر اسکہ ساتھا۔ وہ زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی مگر  
الفاظ سمجھے میں نہیں آرہے تھے۔ وہ طیب سے کچھ کہہ رہا تھا۔ انیتا میرے سامنے بیٹھی  
تھی۔ مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کے وجود میں ساتوں رنگ کھلتے محوس  
ہو رہے تھے۔ کوئی میرے اندر بیٹھا اسے دبوچ لینے کی ترغیب دے رہا تھا۔ اعصاب شیخ  
رہے تھے۔ طیب اور آکا باگیا کچھ کہہ رہے تھے۔

اچانک طیب میرے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ وہ بار بار مجھے سے کچھ کہہ رہا تھا پھر وہ انیتا  
سے کچھ کہتا۔ میں نے دیکھا کہ انیتا کے سر پر اس نے کوئی کپڑا ڈال دیا تھا۔ انیتا سر جھکا کر  
بیٹھ گئی تھی۔

پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ بس اتنا یاد رہا کہ کمرے میں اندر ہمراں پھیل گیا تھا اور  
وہاں میں اکیلا نہیں تھا۔ کوئی میرے ساتھ تھا۔ کوئی نرم اور گرم وجود۔ پھر شاید میں سوگہ  
یا بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں اپنے بیٹھ روم میں تھا اور اکیلا نہیں تھا۔ میرے بستیری  
میرے پہلو میں انیتا موجود تھی۔ وہ کروٹ لئے تھی۔ میں گھبرا گیا۔ شاید کل کی طرح ”  
آج پھر قتل ہو پہلی ہو۔“ میں نے بے ساختہ طیب کو پکارا اور اچھل کر بستر سے اتر گیا۔  
میری چیخ سن کر انیتا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ ساتھ ہی طیب نے دروازہ ٹھوک دیا۔

بولا۔ ”مجھے لگا جیسے رابرٹ میرے سامنے آیا ہو۔“  
”کہ..... کیا؟“ میں نے بے ساختہ پسلے اپنے بدن کو دیکھا پھر چڑے پر ہاتھ  
چھپرا۔

”نہیں.....! اب سب ٹھیک ہے۔“ طیب نے جلدی سے کہا۔ ”میں تو شاید  
کچھ بھی نہ کرپائے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا دروازے پر کوئی ہے جو زور زور سے دروازہ  
پیٹ رہا تھا۔ میری نگاہ انتبا پر پڑی، وہ ایسے آنکھیں بند کئے جھوم رہی تھی جیسے نشے میں ہو  
یا کوئی منظر پڑھ رہی ہو۔ پھر میری نگاہ تم پر گئی تو تم اپنی بیت تبدیل کر رہے تھے۔ تمara  
چڑھا اور بدن سکر رہا تھا۔ میں تمہیں سنبھالنے میں لگ گیا اور جمیں تو میرا بھی چڑھا کر  
تمہیں اسی حالت میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں..... تم..... بت خوفناک ہو گئے  
تھے۔ ضیاء..... بت خوفناک اور تمہی انتبا جھلکا کہا کر صوف پر گر گئی تھی۔ عجیب  
کراہوں کی سی آواز تھی جو اس کے لبوں سے نکل کر مجھے اور خوف زدہ کر رہی تھی۔  
دروازے پر جو بھی تھا، اب پوری شدت سے دروازے پر نکریں مار رہا تھا۔

اس سے پسلے کہ میں دروازے کی طرف بڑھتا۔ دروازہ ایک جھلکے سے گرا  
اور..... اور آکا بگیا بھاگتا ہوا تمہارے قریب آیا۔ اس نے اپنا ہاتھ تمہاری پیشانی پر  
رکھ دیا اور تم جو مضطرب تھے، ڈول رہے تھے۔ اچانک پُرسکون ہو گئے۔ ساکت ہو گئے۔  
پھر آکا بگیا نے یہی عمل انتبا کے ساتھ بھی کیا۔ وہ بھی ساکت ہو گئی۔ میں نے غور سے  
تمہیں دیکھا، اب تم تاری نظر آرہے تھے۔ بس تم اپنے آپ میں نہیں تھے۔ آکا بگیا نے  
سب سے پسلے مجھ سے پوچھا کہ تم نکاح پڑھا سکتے ہو؟ میں جانتا تو نہیں تھا مگر اتنا پتا تھا کہ  
ایجاد و قبول کرنے اور اللہ، رسول کی سنت کے مطابق مرمرقر کر کے ایک دوسرے  
سے اقرار کروانے کو نکاح کہتے ہیں۔ میں نے آکا بگیا کو بتایا۔ اس نے فوراً نکاح پڑھانے کو  
کہا۔ اس وقت تک انتبا ہوش میں آپکی تھی اور خاموش میٹھی تھی۔ میں نے اس سے  
پوچھا کہ وہ تم سے نکاح پر تیار ہے۔ اس نے اقرار کر لیا۔ تب میں نے یہ تشریف ”نکاح  
پڑھا دیا۔ نکاح پڑھاتے ہی مجھے لگا جیسے سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔“ تم نے نہ صرف انتبا کو  
قبول کر لیا بلکہ وہ جو عجیب و غریب ہی آوازیں پورے گھر میں گونج رہی تھیں، معدوم  
ہو گئیں۔ میں نہیں جانتا کہ وہ سب کیا تھا مگر ایک احساس تھا جو مجھے اندر سے مطمئن کر رہا  
تھا کہ اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ کوئی تباہی آتے آتے پلٹ گئی ہے۔ ضیاء! اب تم دونوں

کورٹ جا کر کافیات بنوں گو..... اب تمہاری یہوی ہے اس لئے تمہارے بیٹھ روم  
میں تھی۔“

طیب خاموش ہو گیا اور میرے اندر ہزاروں طوفان سے اٹھ گئے۔ اب میری یہوی  
تھی۔ ہمارا نکاح ہو گیا تھا۔ میں اس کا شوہر تھا اور فرحت.....!! اس سے میرا ہر تعلق  
ختم ہو چکا تھا۔ میں اسے کیا جواب دوں گا۔ منے دادا سے کیا کہوں گا؟ اماں، بی جان، خالہ بی  
اور دوسرے گھروں والوں کا سامنا کیسے کروں گا؟ یہ وہ سوال تھے جو شور مچاتی لہروں کی طرح  
میرے دماغ سے نکلا رہے تھے۔ میں نے طیب سے بھی کہہ دیا کہ میں اتنا برا قدم اٹھا کر  
گھروں والوں کا سامنا کیسے کروں گا!

”میرا خیال ہے کہ منے دادا بات کو سمجھ لیں گے۔ اور ہاں..... آکا بگیا آج  
تمہیں آشیرواد دینے آئے گا۔ ضیاء، وہ تمہارے نکاح کے بعد حیرت انگیز طور پر خوش تھا۔  
تم نی کھالی بیان کی سوچو۔ گھر کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ میں سب کو مطمئن کروں گا۔  
میرا تو ارادہ ہے کہ میں کل ہی روانہ ہو جاؤں مگر پہلے تم کورٹ سے ہو آؤ۔ نکاح کی قانونی  
حیثیت بھی تو ضروری ہے۔“

میں مزید کچھ کہنے والا تھا کہ اچانک انتبا کرے میں داخل ہوئی۔ میری نگاہ اس کے  
پیڑے پر پڑی۔ وہ بے حد پیاری، شرمیلی مکراہٹ چہرے پر سجائے چائے لئے اندر آری  
تھی۔ مجھے وہ قطعی اجنبی نہیں لگی۔ بلکہ عجیب سا احساس ہوا جیسے میں اسے برسوں سے  
بانتا ہوں۔ بچپن سے۔ میرے ذہن کے پردے پر اس کا چھوٹا سا معمول سا چہرہ نظر آئے  
لگ۔ یوں لگا جیسے ہم نے بچپن ساتھ ہی گزارا ہے۔ جلتی دوپرتوں میں درختوں کے سائے  
میں ہم دونوں گھنٹوں بیٹھے ہیں۔ ہم نے گزیا کھیلی ہیں۔ لمبی لمبی گھنٹوں میں چکر لگائے ہیں۔  
یہ سب کچھ مجھے اتنا صاف نظر آرہا تھا جیسے کوئی فلم سی نگاہوں کے سامنے چل رہی ہو۔  
”چائے۔“ اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”تھیںک یو۔“ بے اختیار میں کہہ اٹھا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر مجھے یوں دیکھا جیسے میں  
اس کی سب سے بڑی خواہش تھا اور آج وہ مجھے حاصل کر کے بت خوش، مطمئن اور  
آسودہ ہے۔

وہ واقعی خوش تھی۔ یہ بات اس نے مجھے اسی شام بتا دی تھی۔ جب طیب گوپاں کو  
فن کر رہا تھا اور میں اور انتبا باہر بنے چھوٹے سے لان میں کریاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ایک

ئے۔ اس وقت تک ہم والپس آچکے ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ میں اور طیب اسے دیکھتے رہ گئے۔ مجھے عجیب سالاگا کہ وہ اتنے وثوق سے کیے کہ یہ ہے۔ طیب پا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے استفہامیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو سن کی پُر سوچ آنکھوں میں کچھ ارتقاش پیدا ہوا پھر وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ ہم نے چائے پی۔ اس دوران میں طیب نے مجھے بتایا کہ اس نے اکیلے دہلی جانے والارہہ ترک کر دیا ہے اور مجھے انتبا کو ساتھ لے کر اس کے ساتھ دہلی چلنا چاہئے۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ میں نے دادا نے فرحت کی شادی مجھ سے نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ مجھے دبے دبے انداز میں کہہ بھی چکے تھے اور غالباً اماں وغیرہ سے بھی انہوں نے بات کر لی۔ ان کی طرف سے تو مجھے فکر نہیں تھی مگر میں جانتا تھا کہ یہ بات ان میں سے کسی نہیں تھی۔ وہ یقیناً میرے وعدے پورے ہونے کے انتظار میں ہو گی۔ پھر لی جان..... انہوں نے جو آس لگائی تھی، اس کا نوشان مجھ سے کب دیکھا جائے گا؟ لیکن یہ سب سوچنے کے باوجود جو کچھ ہو چکا تھا اسے سب کے سامنے تو آتا ہی تھا۔ انت کو یہ زہر پینا ہی تھا۔ لی جان کی آس کو ٹوٹا ہی تھا، چاہے میری پوزیشن کتنی ہی باب کیوں نہ ہو جائے۔ کیا پتا، میں نے دادا یا اماں نے لی جان سے ذکر کر دیا ہو کہ شالی بیا نہیں کیا ہے۔ میرا دماغ سوچتے سوچتے پکنے لگا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟" طیب نے مجھے چونکا دیا۔

"ہوں..... کچھ نہیں۔" میں نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر گمراہیں لیا۔ "مگر کی فکر نہ کرو۔" اس نے اتنا کہہ کر پیالی منہ سے لگا۔ "تم تیار ہو جاؤ۔ وہ آئے گا تو گاڑی سے اترے گا بھی نہیں۔" طیب یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ "میں نہ کر کپڑے بدلتا ہوں۔ تم بھی جلدی کرو۔ ویسے ضیاء!" وہ جاتے جاتے سکیلے۔ مجھے یوں اکیلے، چپ چاپ، سانوں میں اس شادی پر ذرا بھی خوشی نہیں ہے۔ نے اور گوبال نے پروگرام بنایا ہے کہ ہم دوستوں کو پارٹی بھی دیں گے اور..... گھر نہیں دعویٰ کا بھی کریں گے۔ ڈونٹ وری۔"

وہ بغیر جواب نے چلا گیا۔ میں کچھ دیر وہیں بیٹھا اپنے اندر کے سانے میں کہیں نا ارتقاش، کوئی آواز، کوئی حرکت کھو جتا رہا۔ مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ کوئی تلاطم محسوس نہ ہوا، حتیٰ کہ خوشی کا بھی کوئی احساس ایسا نہ تھا، جس نے میرے اندر رنگ بھیرے

روز پسلے اس کی اماں اور بہن کا انتقال ہوا تھا مگر یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا ان دونوں سے کوئی رشتہ کبھی تھا ہی نہیں۔ مجھے خیال آیا مگر میں اس لئے خاموش ہو گیا کہ بے وجہ اسے یاد دلا کر غمزہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ کوئی تاسف، کوئی صدمہ یا افسوس مجھے بھی نہیں تھا۔ چند گھنٹوں میں، میں فرحت کو بھول چکا تھا۔ گھر والوں کا سامنا کرنے کا خوف بھی نہیں تھا۔ ایک سکون تھا۔ ایک سکوت تھا جو میرے اندر اطمینان بن کر پھیلا ہوا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں..... ہمیشہ صرف آپ ہی کے ہمارے میں سوچا تھا۔" وہ کہہ رہی تھی۔ "یہ خوف میری راتوں کی نیندیں اڑا دیتا تھا کہ آپ مجھے پتا نہیں، کبھی مل پائیں گے یا نہیں۔ میں شاید آپ سے زیادہ آکا بآگیا کی ممنون رہوں گی۔"

مجھے اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ وہ مجھ سے صرف تین روز پسلے ملی تھی۔ پہلی رات وہ مرچکی تھی، اس کی نیند کب اڑی؟ دوسری رات ہمارا نکاح ہو گیا اور اس وقت وہ میرے سامنے میری بیوی کی حیثیت سے بیٹھی تھی۔ وہ کن راتوں کی بات کر رہی تھی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس سے پسلے کہ میں اس سے کچھ پوچھتا، طیب آگیا۔

"یا! تمہیں آج کو رث جانا چاہئے تھا۔"

"ہاں! کل صح وکیل کو بلوالو۔ ہمیں کو رث جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ سب کچھ کر دے گا۔"

"گوپال آرہا ہے۔ اس نے کہا ہے، دونوں سے کو تیار رہیں۔ ہم کھانا باہر کھائیں گے۔"

میں نے انتبا کی طرف دیکھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ "ٹھیک ہے، تم تیار ہو جاؤ۔ میں چائے پی کر تیار ہو جاؤ گا۔" پھر میں طیب سے مخاطب ہوا۔ "کب تک آئے گا گوپال؟"

"گھٹنا بھر میں۔"

"اور ہاں.....! وہ آکا بگیا۔ اس نے بھی تو آنے کو کہا تھا نا؟" مجھے یاد آیا، میں تو خود اس سے ملا چاہتا تھا۔

"ارے ہاں یا رہ! میں تو بھول ہی گیا۔" طیب نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ انتبا جو کرے کی طرف جا رہی تھی، رک گئی اور بولی۔ "وہ رات کو دیر سے آئیں

تھے۔ پہا نہیں، کیوں میں اس الجھن میں پڑ گیا۔ رہ رہ کر مجھے ایسے ہی خیالات آ رہے تھے۔ میں بار بار گوپال اور طیب کی باتوں کی طرف دھیان لگاتا گھر پھر میرا زد، میں بھلک لگاتا گھر پھر میرا زد، میں بھلک کر انہی سوالات کے گرداب میں پھنس جاتا۔

طیب اور گوپال مسلسل باقتوں میں مصروف تھے۔ اینتا خاموش تھی اور باہر دیکھ رہی تھی۔ ابھی تک میں نے اس سے کسی وار فنگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس وقت اس کی خاموشی نے مجھے احساس دلایا کہ مسائل میں، میں گرفتار ہوں۔ نکاح میرے لحاظ سے غلط ہوا ہے۔ میں اس شادی پر تیار نہیں تھا۔ خوف ناکیاں میری پشت پر ہیں، اسے کیا پتا، اس کے تو ہر انداز میں پسندیدگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ تو خوش تھی۔ ایک دم اکیلا رہ جانے کا دکھ تک بھول چکی تھی۔ اسے تو مجھ سے وار فنگی اور سپردگی کی توقع ہوگی۔ اس کا تو جی چاہ رہا ہو گا کہ میں اسے اپنی موجودگی کا احساس دلاؤں۔ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کروں۔ خوب صورت دنوں اور حسن جذبوں کی باتیں کروں۔ شاید وہ میرے رویے سے دل برداشت ہے۔ اس خیال نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے دھیرے سے ہاتھ بڑھا کر، اس کی گود میں رکھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور پھر چونک اٹھا۔ اس کا ہاتھ بالکل سرد تھا۔ اس کے چہرے پر غم کا تاثر پھیلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں اداسی بھی تھی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“ میں نے چپکے سے پوچھا۔

اس نے لفی سے سرہلایا۔ اس کے غزدہ چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ ایک دم نہیں ہو گئی۔ اس نے میری طرف بڑی وار فنگی سے دیکھا۔ میں نے مسکرا کر اسی وار فنگی سے جواب دیا۔ اس کے ہاتھ کو چپکا اور طیب کی طرف متوجہ ہو گیا جو گوپال کو کسی حسین نورت کی داستان سارہا تھا جو بقول اس کے، پیدا ہی اسی کے لئے کی گئی تھی مگر وہ حقارت سے اسے ٹھکرا کر چلا آیا تھا۔

”یار بڑے کٹھور ہو۔ تمہیں عورتوں کے ساتھ اپنے رویے کو بد لانا چاہئے۔“ گوپال ناراض ہو رہا تھا۔

”یار میں اکیلی جان..... آخر کس کس کے بارے میں سوچوں گا۔ پھر سب سے اہم بات یہ کہ میری ملتی ہے۔ ہماری ملتی بچپن میں ہی ہو گئی تھی۔ وہ میری منتظر ہے، میری خاطر جان دینے کو بھی تیار ہے۔ اگر اسے پتا چل جائے کہ میں اس سے بے وفائی کر رہا ہوں تو کیا ہو گا۔ میں بھی اسے چاہتا ہوں۔ میں نے اس سے ہزاروں وعدے کے ہیں۔“

ہوں۔ ارتعاش پیدا کیا ہو یا مجھے کسی قسم کی چل پل کا احساس ہوا ہو۔ بس خاموش تھی، پر مسکون خاموشی۔ میں اٹھ گیا۔ میرا سامان میرے کمرے ہی میں تھا اور اس کام والے پر ریاض نے طیب کی ہدایت پر کپڑے الماریوں میں ٹانگ دیے تھے۔ اینتا بھی وہیں تھی۔ میں اندر داخل ہوا۔ باقتوں روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اینتا ناچکی بے گھروہ کمرے میں نہیں تھی۔ شاید کسی کام سے باہر گئی ہو۔ کہاں؟ یہ میں نے نہیں سوچا۔ میرے کپڑے استری کے الماری کے ہنڈل میں پینگر میں لکھے ہوئے تھے۔ میں تو یہ لے کر باقتوں روم میں چلا گیا۔ نہا کر طبیعت کافی فریش ہو گئی۔ میں نے کپڑے بدلتے۔ اینتا بھی تک دکھائی نہیں دی تھی۔ میں کنگھی کر رہا تھا کہ باہر سے ہارن کی آواز سنائی دی، ساتھ ہی طیب کے پکارنے کی بھی۔ میں جلدی سے کمرے سے باہر آگیا۔ گاڑی گیٹ سے اندر ہی کھڑی تھی۔ طیب اور اینتا گاڑی میں بیٹھے تھے۔ باہر لگے بلب میں مجھے اینتا کا چہرہ کی مانند کھلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ہلکے میک اپ میں وہ غصب ڈھاری تھی۔ طیب ڈرائیور نگ سیٹ کے برابر والی سیٹ پر براہمیان تھا۔ مجھے اپنی طرف آتا دیکھے کہ گوپال گازی سے اتر کر میرے استقبال کو آگے بڑھا۔ میرے سینے سے لگ کر اس نے مجھے مبارک بادی۔ بہترن ڈریکا دعہ لیا مگر یہ بھی بتا دیا کہ آج کا ذرا سی کی طرف سے ہے۔

میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اینتا نے کالے رنگ کی سائزی بانڈ ہمی ہوئی تھی جو کے باڑو پر سحری نازک سی بیل بنی تھی۔ مجھے جرأت ہوئی کہ وہ سائزی بانڈ ہے۔ پھر جس قدر اہتمام کیا ہوا تھا اس سے تو یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سائزی اسے بری یا جیزیر میں ڈھانے ہے۔ جب کہ ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ سحری بیل کی مناسبت سے اس نے شرے رنگ کا بندیا بھی لگائی ہوئی تھی۔ میرا جی چاہا کہ اسے بندیا ہٹانے کا کہہ دوں مگر یہ سوچ کر چکا گیا کہ اس نے کتنی چاہت سے لگائی ہو گی اور میں پسلے ہی روز اس پر اپنی مرضی مساکن کا تو یہ اچھا نہیں ہو گا۔ گاڑی چل پڑی۔ میں یہ سوچتا رہ گیا کہ اینتا نے یہ ساکن اہتمام کیا؟ طیب جس بیڈ روم میں تھا وہاں آئئیہ نام کی کوئی چیز اگر تھی تو صرف بادی روم میں۔ میرے بیڈ روم میں الماری کے ایک پٹ پر آئئیہ لگا تھا مگر اینتا وہاں نہیں۔ اور وہ کمرا جہاں اس نے پہلی رات گزاری تھی البتہ کسی خاتون کے کمرے کی طرح؟ گیا تھا۔ وہاں قدر آدم آئئیے والی ڈریونگ نیبل تھی مگر وہ کمرا تو ہم نے اسی دن لاک کر تھا اور اس کی چالی ابھی تک میرے ان کپڑوں کی جیب میں تھی جو میں نے ابھی اٹھا۔

اُن کا کیا ہو گا؟"

یہ طیب تھا جو بڑی رعونت سے بتا رہا تھا۔

"متنقی؟" گوپال نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "مگر اس دن تو تم کہہ رہے تھے کہ کم از کم متنقی ہی ہو چکی ہوتی تو میں یوں اپنے اندر خلاء محسوس نہیں کرتا۔"

"وہ تو دوسری متنقی کی بات کر رہا تھا۔" طیب نے بر جھکن سے جواب دیا۔

"میرے بھائی! پہلی متنقی سے پہلے دوسری متنقی کیسے کر سکتے ہو تم؟" میں نے نہیں کر پوچھا۔

"پہلی تو ہو چکی ہے یا! ایک تو تمہارا حافظہ بست خراب ہے۔" طیب نے پٹکر مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہاں۔" میں نے زور سے سر ہلایا۔ "میں تو تمہاری ساری متنقیاں بھولے بیٹھا ہوں۔ ویسے بائی داوے۔ پہلی متنقی کب اور کس کے ساتھ ہوئی تھی، ذرا یاد دلائیں گے مجھے؟"

میرے انداز پر اینتا نہیں پڑی۔ وہ غالباً جان گئی تھی کہ طیب گپ مار رہا ہے۔ "کیسی باتیں کرتے ہو تم ضیاء..... بھائی۔" طیب نے اینتا کو مخاطب کیا۔ "آپ کی ڈیوٹی ہے یہ کہ آپ نہار منہ ضیاء کو بادام کی گری کھلایا کریں گی، اور چاروں مغرب بھی۔ اس سے حافظہ تیز ہوتا ہے۔"

"مگر حافظہ تیز ہونے کی صورت میں مجھے تمہاری متنقیاں، ہزاروں کی صورت میں یاد آجائیں گی۔"

"نہیں۔ اس سے حافظہ درست بھی ہوتا ہے۔" وہ جھلا گیا۔ "پہلی ہی یاد آجائے تو بڑی بات سمجھو۔ تم نے خود تو کرائی تھی۔"

"میں نے؟"

"ہاں اور کیا..... فرحت سے۔ ارے! پہلی بار جو ہم دہلی گئے تھے۔ تب ارے ہاں..... میں تو بھول گیا۔ اس دن تو تم پھسل کر گر پڑے تھے۔ تمہارے سر پر چوٹ آئی تھی اور تمہاری یادداشت بھی متاثر ہوئی تھی۔ خیر تم چھوڑو۔"

طیب گھبرا گھبرا کر کہہ رہا تھا اور گوپال نہ رہا تھا مگر میں ساکت رہ گیا تھا۔ مجھے فرحت کے ذکر پر جانے کیا ہو گیا تھا۔ دکھ کا گمرا احساس ہوا تھا۔ یہ یاد آگیا تھا کہ طیب

فرحت کو پسند کرتا ہے اور اب..... اب اس کی طرف جانے والے تمام راستے کھلے ہوئے تھے۔ اب مجھے کوئی حق بھی نہیں پہنچتا تھا کہ میں اسے فرحت کے بارے میں سوچنے سے منع کر دوں۔

میں خاموش ہو گیا تھا۔ میری خاموشی کو اینتا نے محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا پھر نہ کہنہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس نے میری سوچ کا نہاد اڑایا ہو۔ مجھے احساس دلایا ہو کہ میں جو کچھ چاہتا تھا، حاصل نہیں کر سکا اور وہ جو کچھ چاہتی تھی، اسے حاصل ہو گیا ہے اور اب میری یہ سوچیں اس کا کچھ نہیں بگاؤ سکتیں۔ میرا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ جو ذرا موڑ بھال ہوا تھا، چوپٹ ہو گیا۔ جن سوالوں کے گرداب سے مشکل سے نکلا تھا، اس میں پھر جا پھنسا۔

فرحت کا چڑھ رہ رہ کر نگاہوں میں گھومنے لگا اور اس لئے میں نے فصلہ کر لیا کہ اینتا کو لے کر دہلی نہیں جاؤں گا۔ طیب جا کر بتا دے گا۔ اس سے سب کا رد عمل معلوم ہونے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔ بی جان کا رد عمل جیسے مجھے معلوم تھا۔ وہ فرحت کو لے کر میری چھپلی جاتیں پھر گھر کے دوسرے افراد کا سامنا کرنا تھا۔ مشکل نہ رہتا اور کوئی ضروری بھی نہیں تھا کہ میں فرحت کا سامنا ضرور ہی کرتا۔ کتنے ہی لوگ بے وفائی کرتے ہیں۔ جان بوجھ کر دل توڑتے ہیں۔ میں نے اس سے براہ راست کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔ مہم سی بات تھی اور بس۔ کبھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے اپنانے کا دعویٰ نہیں کیا تھا پھر..... میں کیوں اس قدر پریشان ہوں۔ میری مجبوری سے تو منے دادا بھی واقف ہیں اور بی جان بھی۔ شالی بابا بھی اور اماں بھی اور پھر طیب۔ جو جانتا ہے کہ میں نے شادی کس طرح کی۔ یہ بڑو لا دہاں جا کر ایک ایک تفصیل بتائے گا۔ سب سنیں گے، فرحت کو بھی پتا چلے گا پھر.....؟

اچانک گاڑی جھکلے سے رکی۔ یہ ایک بڑا ہوٹل تھا جو روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

"چلو اترو۔ میں گاڑی پار کر کے آتا ہوں" گوپال نے کہا۔

ہم سب اتر گئے۔ روشنیوں کے اس طوفان میں میری نگاہ اینتا کے چہرے سے ہوتی ہوئی اس کی سیاہ خوبصورت سائز ہی پر پڑی۔ وہ بت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ادھر ادھر کھڑے لوگوں کے ساتھ کھڑی عورتیں چونک چونک کر اینتا کو دیکھ رہی تھیں۔ مجھے اچھا لگا۔ اس کی سیاہ سائز ہی پر چھوٹے چھوٹے سے سمری دھیسے سے بننے ہوئے تھے جو

بہت کم تھے مگر بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ میں ابھی اس کے سرپاکا پورا جائزہ بھی نہیں لے پایا تھا کہ گوپال اور طیب بھی ہمارے قریب آگئے۔ ہم ڈائنگ ہال کی طرف مڑ گئے۔

انیتا کی چال میں بڑی تمکنت تھی۔ وہ مجھے اس وقت بالکل اجنبی سی لگ رہی تھی۔ انیتا ہونے کے باوجود انیتا نہیں لگ رہی تھی۔ پروقار چال، چرے پر سمجھی گئی، پتی لمبی گردن میں جھملاتی باریک سنہری چین۔ بھرے بھرے ہوئے بازوں میں بلاوز کی پھنسی ہوئی آتیں۔ اونچے ایری کے سیاہ سینٹل۔ کٹھے ہوئے بالوں کو جوڑے کی شکل میں بنایا ہوا تھا جو اس کے وقار میں اضافہ کر رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ اس وقت وہ اتنی ہی خوبصورت لگ رہی تھی کہ مجھے اس اچانک شادی، اور افراتفری میں کئے گئے بندھن پر خوشی ہوئی۔

”یار نظر نہ لگ۔ تم دونوں کی جوڑی پورے ہوٹل میں چک رہی ہے۔“ گوپال نے سرگوشی کی۔ ”ویے یار یہ مجھے وہ انیتا تو لگ ہی نہیں رہی جسے میں چھ برس سے جانتا ہوں۔“

”اچھا ہے۔ ضیاء اپنی یووی کے ساتھ کسی اور کی بے تکلفی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہے۔“ طیب نے منہ بنا کر کہا۔ ”عادی۔“ گوپال رک گیا۔ ”یعنی تمara مطلب ہے کہ وہ شادی کا، یعنی یووی کا عادی ہے۔ اور یووی سے بے تکلفی کا عادی نہیں۔ یعنی وہ پہلے بھی شادی شدہ ہے۔“ یعنی۔“

”بس کرو یار۔“ طیب جھنجلا گیا۔ ”تمارے اس یعنی نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ یعنی سمجھو۔ یہ وہ انیتا نہیں کوئی اور انیتا ہے۔“

میں اور انیتا ہستے رہے۔ ہم نے بڑے خوشنگوار موز میں کھانا کھلایا۔ ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ درمیان میں عجیب بات ہوئی۔ انیتا اش روم جانے کے لئے انھی، چلی گئی۔ جب وہ ابس آرہی تھی تو میری نگاہ اس کی طرف اٹھ گئی۔ وہ مجھے سے کوئی بیس قدم دور تھی مگر روشنیوں نے اس کے کردہ ال سبانا رکھا تھا۔ ان روشنیوں کے درمیان اچانک میری نگاہ نہ سترے دھبوں پر گئی۔ میں اچھل پڑا۔ چیخنا۔ ”انیتا۔۔۔۔۔۔!“

میری چیخ سن کر سب اچھل پڑے۔ انیتا جمال تھوڑی ہیں ساکت ہو گئی۔ گوپال اور

بیب کیا ہوا، کیا ہوا چیختنے لگے مگر میں تیر کی طرح انیتا کے قریب پہنچ گیا اور وہیں گھٹنوں کے مل زمین پر بیٹھ کر اس کی سازھی کو زور زور سے جھاڑنے لگا۔ ساتھ ہی چیخ رہا تھا۔ بہنا نہیں۔۔۔۔۔۔ انیتا بہنا نہیں۔۔۔۔۔۔

تمام لوگ جو لمحہ بھر کو ساکت رہ گئے تھے، میری طرف لپٹنے لگے۔ سب جیران خی، مجھ سے میرے چیختنے کی وجہ پوچھ رہے تھے۔ مگر میں پاگلوں کی طرح انیتا کی سازھی بھاڑ رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ انیتا نے بڑی مضبوطی سے اپنی سازھی کپڑا رکھی تھی اور مجھ سے ارباب کہہ رہی تھی۔

”ضیاء۔۔۔۔۔۔ پلیز۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو۔۔۔۔۔۔ مت کرو۔۔۔۔۔۔ کیا کر رہے ہے۔۔۔۔۔۔“

اچانک مجھے پیچے سے کچھ لوگوں نے کپڑا لیا۔ طیب میرے سامنے آگیا۔ ”کیا ہے یاء۔۔۔۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہو تم؟“

اس کی آواز سے مجھے ہوش آگیا۔ سب لوگ میرے گرد کھڑے تھے۔ انیتا کا چڑ رخ ہو رہا تھا۔ گوپال اور طیب کے چرے پر ہوا یاں اڑ رہی تھیں۔

”یہ۔۔۔۔۔۔ انیتا کے بدن پر۔۔۔۔۔۔ سازھی پر پڑے دھبوں پر نگاہ جمادی۔۔۔۔۔۔“

”کچھ نہیں گیا۔ میں نے پھر اس کی سازھی پر پڑے دھبوں پر نگاہ جمادی۔۔۔۔۔۔“

طیب نے چنکی سے ایک دجبہ کپڑا کر ملا۔ واقعی وہاں مکڑی نہیں تھی جبکہ میں نے باقاعدہ رینگتے دیکھا تھا ورنہ میری نگاہ تو انیتا کے چرے پر تھی۔ حرکت کے احساس نے ہی میری نگاہ کا زاویہ بدلا تھا۔ میں نے سازھی کو دیکھا تو وہاں چھوٹی چھوٹی سنہری لڑیاں رینگ رہی تھیں اور یہ بالکل بیج ہے۔ اور یہ بھی بیج تھا کہ طیب چنکی میں کپڑے ہے کو دکھا رہا تھا۔ وہ پینٹ ہی تھا۔ سہرا پینٹ۔۔۔۔۔۔ چاروں طرف کھڑے لوگوں کی بیوی میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ہوٹل کا مینپھر گوپال سے صورت حال کے بارے میں پوچھ رہا۔۔۔۔۔۔ انیتا بے حد شرمende، سر تھکائے کھڑی تھی۔ لیکن ایسا لگ جیسے اسے غصہ ہو۔۔۔۔۔۔ انی کی حرکت پر۔۔۔۔۔۔ طیب مجھے سارا دے کر کھڑا کر چکا تھا۔ لوگ جو جمع ہو گئے تھوڑے چلے آیا۔۔۔۔۔۔ گوپال مینپھر سے مغذرت کر رہا تھا۔ طیب نہیں کرتے اپنی اپنی نیلیں پر جا رہے تھے۔ گوپال مینپھر سے مغذرت کر رہا تھا۔ طیب نہیں کرتے اپنی نیلیں پر چلا آیا۔ پھر مجھے بیٹھنے کو کہ کر اس نے گاس میں پانی انڈیل کر مجھے

دیا اور خود گوپال کی طرف بڑھ گیا۔ اینتا اب میرے سامنے پیشے پچھی تھی اور مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک مجھے اس کی آنکھوں میں تمسخر دکھائی دیا پھر گمراہی سنجیدگی۔ اس نے ذرا سما آگے کو سرک کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کمل۔

”ضیاء..... اب تمہیں ایسی باتوں کا عادی ہو جانا چاہئے۔ تماشا بننے سے بترہے کہ آدمی خود پر جھیل لے۔“

میں چونک اٹھا۔ وہ کیا جانتی ہے؟ کیا کہہ رہی ہے؟ کیوں کہہ رہی ہے، میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس سے پسلے کہ میں کچھ پوچھتا گوپال اور طیب آگئے۔

”جلویار! کھانا تو کھاہی پکے ہیں۔ یہاں سب گھور گھور کر دیکھ رہے ہیں۔ کہیں اور چلتے ہیں۔“

گوپال نے کہا اور گاڑی کی چابی اٹھا۔ غالبا وہ ٹل پے کر آیا تھا۔ واقعی ہمیں سب عجیب سی لگاہوں سے گھور رہے تھے۔ خاص طور پر سب کی نگاہ مجھ پر اور انیتا پر تھی۔ ہم اٹھ گئے۔ گاڑی میں پیشے تو انیتا کا مودہ کافی خراب لگ رہا تھا اور میں ابھی تک اس ابھن میں تھا کہ انیتا نے مجھے کہن باتوں کا عادی ہو جانے کی تلقین کی ہے۔ طیب اور گوپال بھی خاموش تھے۔ ہوٹل میں ہونے والا واقع یقیناً تماشا بن گیا تھا مگر یہ اب بھی یقین تھا کہ مجھے دھوکا نہیں ہوا ہے۔ میں طیب کو بھی یہ یقین دلانا چاہتا تھا مگر یہ موقع نہیں تھا۔ اس طرح گوپال اور انیتا مجھے یقیناً پاگل سمجھنے لگتے۔ میں تو بار بار خود کو باور کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے دھوکا ہوا ہو گا۔ طیب ہی نمیں کہہ رہا ہے مگر نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے پھر انیتا پر نگاہ ڈالی جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی پھر میں نے اس کی سیاہ سائزی پر نگاہ کی۔ وہاں وہی دھبے سے پڑے تھے۔

میں نے اس کی نگاہ بچا کر ایک دھبے کو انگلی سے محسوس کیا اور پھر میرے بدن میں سشنی دوڑ گئی۔ میں اچھلا تو نہیں ساکت ہو گیا۔ میری انگلی کے نیچے کوئی بلیجی سی چیز تھی جو زندہ تھی اور سانس لے رہی تھی۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ میں اچھلا نہیں ورت پر تماشا بنتا۔ کم از کم انیتا اور گوپال کی نگاہ میں ضرور تماشا بن جاتا۔ مگر اب اکیلے اس بات کو ہضم کرنا بھی ایسا آسان نہیں تھا۔ میں نے دھبے پر انگلی جمادی اور پوری قوت سے اس چیز کو مسل دیا۔ انگلی پر گیلے گیلے کسی سیال کا احساس بھی ہوا۔ میں نے انگلی سیٹ سے رگڑ کر ذنک کرلی اور اپنی سرد ہوتی ریڑھ کی ہڈی کو سیٹ کی پشت سے نیک دیا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔

گاڑی سمندر سے چند گز دور، چوڑی سڑک پر پھسل رہی تھی۔ میرا جی چاہا میں گاڑی رکوا کر بھاگ جاؤ۔ اب میری بہت نہیں ہو رہی تھی کہ انیتا کی سائزی کی طرف دیکھوں۔

”یہاں روک دو۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

گوپال نے آئینے میں مجھے دیکھا اور پھر پلٹ کر بولا۔ ”کیا بات ہے ضیاء! تمہارا رنگ کیوں سفید ہو رہا ہے؟“

یہ کہتے کہتے اس نے گاڑی سائزی میں کر کے روک دی۔

”میری..... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ گاڑی رکتے ہی میں باہر آگیا۔ طیب بھی لپک کر اتر گیا اور میری طرف آیا۔

”کیا بات ہے ضیاء؟“ اس نے شاید محسوس کر لیا تھا کہ کوئی گزبر ہے۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”طبیب! کچھ ہے..... کسی طرح ان دونوں سے کچھ فاصلے پر چلو۔“ میں نے سرگوشی کی اور یوں ایک طرف کو بڑھ گیا جیسے مجھے ابکالی آرہی ہو۔

انیتا بھی گھبرا کر گاڑی سے اتر رہی تھی۔ طیب نے اسے دوبارہ بٹھادیا۔ ”لیا ہو گیا ہے ضیا کو؟“ وہ بڑی معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔ شاید وامیٹنگ ہو رہی ہے۔ کچھ ٹھنڈی ہوا لگے گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ بیٹھیں۔“

اس نے زبردستی انیتا کو گاڑی میں بٹھادیا۔ گوپال کو وہ انیتا کی وجہ سے بٹھا آیا۔ میں اب ان لوگوں سے تقریباً پندرہ میں قدم دور سمندر کی طرف منہ کئے کھڑا تھا۔ یہاں لگے پول سے کافی روشنی دور تک پھیل رہی تھی۔ طیب میرے قریب آگیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی۔ پسلے تو وہ سنجیدہ نہیں ہوا۔ میرے بتائے ہوئے واقعے کو دیکھ کا خلل ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب میں نے اصرار کیا اور اپنی انگلی اس کے سامنے کی اور بتایا کہ ابھی ابھی میں نے اسے اپنی انگلی سے ملا ہے۔ تب میری نگاہ طیب کے چرے پر پڑی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرے پر اچانک خوف پھیل گیا تھا۔ وہ میری انگلی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے چونک کر اپنی انگلی دیکھی اور پھر میرے منہ سے عجیب سی آداز انگلی۔ میری انگلی کی پسلی پور سنبھری ہو رہی تھی۔

”یہ..... یہ دیکھو..... وہ اگر پینٹ تھا تو گیلا تو نہیں تھا۔“ پھر.....

وہ ہم نے جو نہیں باہر والا دروازہ کھولا، میں اور طیب ہی نہیں، اینتا بھی جسے انھیں۔ دروازہ کھولتے ہی جو کچھ دکھائی دیا، وہ سب کو خوفزدہ کر دینے کو کافی تھا۔ اس لئے میں مدھم سابلپ جل رہا تھا جو طیب جلا چھوڑ کر گیا تھا۔ ہمارے سامنے گوشت کے لئے پڑے تھے۔ مجھے ایسا یاد آگئی۔ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ وہاں بھی پکا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اینتا کو پیچھے کیا تھا کہ وہ اس خوفناک منظر کو نہ دیکھ سکے گو۔ گوشت کے ٹکڑوں کو خون میں لات پت دیکھے چکی تھی اور اب دیوار تھامے، دوسری رف منہ کر کے گھرے سانس لے رہی تھی۔ طیب ایک لمحے کو تو وہیں ٹھنک گیا تھا پھر پ میں اینتا کو باہر رہنے کی تلقین کر کے اندر کی جانب بڑھا تو طیب نے بھی قدم بڑھا یے۔ مجھے ریاض کی فکر تھی اور تو کوئی یہاں نہ تھا۔ کسی کے آنے کا امکان تھا۔ میں رطیب تیزی سے آگے بڑھے۔ گوشت کے ٹکڑے زیادہ نہیں تھے پھر صوفے کے پیچھے ہے مرے ہوئے کتے کا سر نظر آیا جس نے میرے خداش کو مسترد کرایا۔

”او اینتا.....! فکر نہ کرو۔ کتاب ہے۔ شاید بھیڑا اٹھالا یا ہو گا اور اسے یہاں کھانے کو شش کر رہا ہو گا۔

پہاڑ نہیں، یہ بات میں نے اینتا کی تسلی کو کہی تھی یا اپنی تسلی کو۔ میرا دل اب بھی درزور سے دھڑک رہا تھا اور شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ یہ گھر جگل میں نہیں کہ ڈیا کسی مردہ کتے کو اٹھالائے اور پھر دروازہ بھی لاک تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں اور زمین، کافی اوچی بھی تھیں۔ سچھلی طرف سے ایسا کوئی راستہ بھی نہیں تھا جہاں سے کسی کے دراصل ہونے کا امکان ہو۔

اینتا بہر حال سنپھل گئی۔ طیب نے بھی اطمینان کا سانس یا مگر میں نے پورے گھر کا ڈولیا ضروری سمجھا۔ بالی سب خیریت تھی۔ طیب نے گوشت کے وہ ٹکڑے جھاؤ کی سے اٹھا کر ڈست بن میں ڈال دیئے پھر وہ ڈست بن بھی گھر سے باہر رکھ آیا۔ ذرا دیری کی کرا صاف ہو چکا تھا۔ میں نے ایسے فرشٹہ کا اپرے بھی کر دیا۔ اینتا اب بھی خوفزدہ اور بار بار چاروں طرف دیکھ کر پوچھ رہی تھی کہ آخر یہ مردہ کتنا آیا کہاں سے؟

یہ ماں میرے دماغ میں بھی بچھل مچائے ہوئے تھا۔ مجھے کوئی یقین دلا رہا تھا کہ یہ مانی ڈفت سے، حکمی ہے گر میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ہاں، اکا بگایا کا ضرور منتظر تھا کہ اسے انتہا اس شادی کے بعد سب کچھ ٹھنک ہو جانا تھا، تو میرے لحاظ سے تفعیل ٹھنک

یہ.....؟ ”ضیاء! ویسے یہ ہو تو سکتا ہے تاکہ تمہارے رگڑنے سے پینٹ ہی پھیلا ہو۔ وہ واقعی گیلا ہو یا..... بالکل سوکھا..... کہ رنگ تمہاری انگلی پر لگ گیا ہو۔“ طیب میرے ساتھ ساتھ غالباً خود کو بھی تسلی دے رہا تھا۔ لیکن دلارہا تھا۔

”پہاڑ نہیں..... لیکن طیب! وہ زندہ تھی۔ کوئی نرم سی چیز..... تم یقین کیوں نہیں کرتے ہو۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہیں کچھ پتا ہی نہیں۔ کچھ جانتے ہی نہیں ہو تم۔ آج پہلی بار یہ سب سن رہے ہو۔“ میں جھلائیا۔

”ضیاء! مجھے تو پچی بات ہے اب خوف آنے لگا ہے۔ یا را! اکا بگایا نے تو کما تھا کہ شادی کرلو، سب ٹھنک ہو جائے گا۔ اب یہ کیا چکر چل پڑا۔“

”فرماز تھا تمہارا وہ آکا بگایا..... مجھے تو یہ اس کی جاہل لگتی ہے۔“

”نہیں یا را! ایسا مت کہو۔ اس کا کیا تھا، ابھی سمندر سے نکل آئے۔ چلو، گھر چلو۔ اس نے آنے کو کما تھا۔ اس سے بات کریں گے۔“

مجھے بھی یاد آگیا کہ اسے آتا تھا۔ میں تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گوپال اور اینتا پریشان تھے مگر میں نے مسکرا کر انہیں تسلی دی اور ہم گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

”آپ..... آپ ٹھنک نہیں ہیں کیا؟“ اینتا نے بڑی دیر کے بعد پوچھا۔

”نہیں..... میں بالکل ٹھنک ہوں۔“ میں نے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کمال۔

”پھر وہ..... ہوٹل میں..... وہ سب کیا تھا؟“

”ہتاوں گا اینتا..... دراصل میرے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ تم نے تو وقت ہی نہیں دیا کہ کچھ بتا تا مگر ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تم مطمئن رہو۔“

مجھے وقت طور پر اسے مطمئن کرنا تھا، سو کر دیا۔ اب یہ سوچنے کو بڑا وقت پڑا تھا کہ اسے کیا بتاؤں گا۔ فی الحال تو ڈہن اکا بگایا، ان ستری ٹکڑیوں اور موجودہ حالات میں شادی ہے چکرایا ہوا تھا۔

گوپال نے گاڑی گیٹ پر روکی۔ ہم لوگ اترے۔ اینتا نے گوپال سے چائے پینے کو کما مگر اس نے انکار کر دیا۔ کما کہ اسے ایک ضروری کام ہے اور وہ کل ضرور شام کی چائے ہمارے ساتھ پئے گا اور اچھا ہی ہوا کہ وہ گیٹ سے ہی چلا گیا درست..... جانے کیا

”آکا بگیا! اینتا سے شادی اسی شرط پر کی گئی تھی کہ اب کسی قسم کا چکرنا چلے۔  
اپ نے یقین دلایا تھا۔“

”ہاں، ہم نے یقین دلایا تھا۔“ اس نے سراخا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”مگر تو جا کر اپنے بد کو روک۔ وہ بے وقوفیں کر رہا ہے۔“

”جد؟“ طیب حیران ہوا۔

”منے دادا؟“ میرے منہ سے سرگوشی نکلی۔ ”کیا کر رہے ہوں گے وہ؟“  
”وہ وتسلا کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے۔ فراڈ سے وہ عورت سب کچھ ہتھیا لیتا ہاہتی ہے۔ وہ زیوسا پر قابو پانا چاہتی ہے۔ ایلن کو بے بس کر دینا چاہتی ہے اور سن!“  
اس نے جھٹکے سے سراخا کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں انگارے کی طرح دبکری تھیں۔

”یہ شالی کے بیس کا کام بھی نہیں ہے۔ تجھ سے کہا ہے تاکہ اب سب کچھ بدل جائے گا تو بس..... بدل جائے گا۔ میں تجھے مبارک باد دینے آیا تھا۔ جا، جا کر اپنے گھر کے مردوں کو روک دے۔ کہ دے، راکھ میں ہاتھ ڈالنے سے پسلے ضرور سوچنا چاہئے کہ کیس چنگاری بھی ہو سکتی ہے۔ زیوسا خاموش ہے۔ وہ تیری پوچا کرتی ہے۔“

”مجھے زیوسا سے کوئی لوچپڑی نہیں آکا بگیا۔“ میں نے اس کی بات کر کمل۔ ”نہ چھے اس کی پرستش کی ضرورت ہے۔ میں اپنی سیدھی سادی زندگی میں لوٹ جانا چاہتا ہوں۔ اینتا سے شادی پر میں راضی نہیں تھا، یہ بات آپ جانتے ہوں گے۔ اس معاملے میں مجھ پر آپ نے اپنی مرضی مسلط کی ہے اس لئے آپ ہی اب کسی بھی پر اسرار واقعے کے ذمے دار ہوں گے۔ میں نے بہت بڑی قربانی دی ہے شاید آپ کو اس کا اندازہ نہیں۔“

اس نے میرے انداز اور میرے لمحے پر مجھے گھور کر دیکھا۔ ”اندازہ!“ کے کہتے ہیں  
”ندازہ!“

اتا کہہ کروہ زور زور سے ہٹنے لگا۔ اس کی نہیں ہدیانی تھی۔ میں اور طیب دونوں سمجھے کہ آکا بگیا پاگل ہے یا ہو گیا ہے۔ طیب تو فوراً ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر لایا جسے اس نے سر کے اشارے سے پینے سے انکار کر دیا اور ویسے ہی بنتا رہا۔ مجھے غصہ آگیا۔ جی چلایا اور پھر گھر آکر کتے والا واقعہ کہ سنایا جسے وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ طیب نے اس دوران میں قطعی مداخلت نہیں کی مگر اب میں خاموش ہوا تو طیب بول اٹھا۔

نسیں ہوا تھا۔ ہوٹل میں ہونے والے واقعے نے پسلے ہی ہم سب کا موذ چوپٹ کر دیا تھا۔ میں تو خوفزدہ ہی تھا، اس پر اس افادا نے اور فکر مند کر دیا تھا۔ میں نے اور طیب نے کسی طرح اینتا کو مطمئن کر دیا تھا۔ اب وہ قدرے نارمل تھی۔  
ہمیں آئے ابھی گھنٹہ بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک بے آواز دروازہ کھول کر آکا بگیا ہمارے سامنے آگیا۔

”اوہ، آکا بگیا! ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔“  
اسے دیکھ کر طیب کی باچھیں کھل اٹھیں۔ اینتا نے اسے حیرت سے دیکھا جیسے پسلے بار دیکھ کر ہر اس سے پسلے کہ وہ بیٹھتا، اینتا یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی کہ اسے شدید نیند آری ہے۔

آکا بگیا اس کی بات پر بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا یا تھا۔ شاید طیب نے اسے مسکراتے نہ دیکھا ہو مگر میری نگاہ اس کے چہرے پر نکلی ہوئی تھی۔ وہ فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”ارے کیا کر رہے ہیں آپ؟“ طیب بوکھلا گیا۔ ”یہاں اوپر صوفے پر بیٹھیں۔“  
”اوچی جگہ پر بیٹھنے سے آدمی کا کردار اونچا نہیں ہو جاتا احمد!“ اس نے بے نیازی سے کہا۔

طیب اور میں اس کے قریب قلین پر بیٹھ گئے۔  
”نیند سے پیار کرنے والے بے وقوف ہوتے ہیں، زندگی کے لاکھوں گھنٹے سونے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ زندگی ضائع کرنے کے لئے نہیں دی گئی، اس کا احسان نہیں ہے کسی کو۔“

اس نے صاف طور پر اینتا پر طنز کیا تھا۔ میں تو اس سے دوسری ہی باتیں، ”کرنا چاہتا تھا اور وہ باتیں ایسی نہیں تھیں کہ اینتا کے سامنے کی جاتیں، شاید اس لئے مجھے اس کی کام کی بات بھی فضول لگی۔ میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ بہت سی باتیں تھیں،“  
مجھے پریشان کر رہی تھیں اور بالخصوص میرے سلسلے میں اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے بعد میں ان سب باتوں کا حل چاہتا تھا اس لئے میں نے دوسری کوئی بات کے بغیر ہوٹل میں ہونے والے اور پھر گھر آکر کتے والا واقعہ کہ سنایا جسے وہ خاموشی سے سنتا رہا۔ طیب نے اس دوران میں قطعی مداخلت نہیں کی مگر اب میں خاموش ہوا تو طیب بول اٹھا۔

”میں صدیوں سے قید ہوں۔ ایک ایسی عمارت میں جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ جہاں نہ موت آتی ہے نہ زندگی بلاتی ہے۔ مجھے ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک چیز چاہئے۔ کوئی بھی..... مگر میں یوں معلق نہیں رہنا چاہتا۔ تم ہی مجھے آزادی دلائکتے ہو۔“

وہ پتا نہیں کیا کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرفی پھر دھیرے دھیرے بڑھ رہی تھی۔ وہ منت سماجت کر رہا تھا۔ میں اور طیب دونوں اسے حیرانی سے دیکھ رہے تھے، مجھے تو یقین ہو گیا تھا کہ وہ پاگل ہو چکا ہے۔ اس کی تمام حرکتیں پاگل پن کی تعبیریں تھیں۔ میں نے اسے تاسف سے دیکھا۔

”کہہ دو لڑکے.....! کہہ دو۔“

”خیاء! کہہ دو۔ کمنے میں کیا حرج ہے۔“ یہ طیب تھا جس کی آنکھوں میں نبی تیر رہی تھی۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ میں جھنجلا گیا۔ ”یہ تو شاید پاگل ہو چکا ہے مگر تم.....“ میں نے بے خیالی اور جھنگلا ہست میں زور سے کمل۔

”ہاں! اگر میری جگہ تم ہوتے تو تم بھی پاگل ہو چکے ہوتے۔ جا کر پوچھو رابرٹ سے، جیسو سے، سورن سنگھ سے اور..... پہاڑ سے۔ وہ یہ بن باس کاٹ رہے ہیں۔ انہیں بھی آزاد کرو۔ مجھے بھی۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو۔ سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے لڑکے۔“

وہ اب میرے اور قریب سر ک آیا۔ اس کے بدن سے اٹھنے والے بدبو کے بھکے میرے دماغ میں میں چڑھنے لگے۔ میں گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا مگر یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ رابرٹ وغیرہ کے بارے میں کیسے جانتا ہے۔ میں نے اسے کچھ اتنا زیادہ تو بتایا ہی نہیں تھا۔ ”تمہارے منہ سے نکلا ہوا ایک لفظ میرے لئے نوید ہو گا۔ کہہ دو، تمہیں آزاد کیا۔ سب کو آزاد کیا۔ یقین کرو، سب تمہیں دعائیں دیں گے۔“

”میں اس کی حرکتیں دیکھ کر مزید پریشان ہو رہا تھا۔“

”دیکھو، میرے تکوے دیکھو۔“

اتنا کہہ کر اس نے اپنے دونوں پیر اٹھا کر میرے سامنے کر دیئے اور میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ اس کے تکوے زخموں سے بھرے ہوئے تھے اور ان زخموں میں ہزاروں

جائے۔

عجیب سی فضا ہو گئی تھی۔ طیب سخت پریشان تھا۔ وہ شاید سمجھ رہا تھا کہ میری کھوپڑی پلٹ چکی ہے۔ بہت کسفیوز تھا۔ میں نے اسے ایسے گھور کر دیکھا جیسے اس پریشان کا سبب وہی ہے۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ آکا بگیا کی نظر پچاکر مجھے خاموش رہنے والے اسارہ بھی کیا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ شلنے لگا۔ اچانک آکا بگیا خاموش ہو گیا۔ اس کے پوچھے گھر میں گونجتے قصتے تھے تو جیسے ایک دم سانان طاری ہو گیا۔ میں نے چونکہ دیکھا۔ وہ سر جھکائے ساکت بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب آگیا۔

”سب نہیک ہو گیا ہے۔“ وہ اچانک بولا۔ اس بار وہ سجدہ تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرفی معدوم ہو چکی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اب سے پہلے اس کی جگہ کوئی اور تھا۔

”آکا بگیا! زیواس سے خیاء کی جان چھوٹ گئی کیا؟“ یہ طیب تھا جو اشتیاق سے پوچھ رہا تھا۔

”کسی کی کسی سے جان نہیں چھوٹتی۔ بے ترتیبی سنبھل جاتی ہے۔ سب کچھ تابو میں آ جاتا ہے اور یہ لڑکا تو خوش قسمت ہے۔ دیوباں کسی کو اتنی اہمیت نہیں دیتیں۔ صدیاں ان کے پیروں سے لئی میں، ہزاروں میں، میں آکر انہیں مسخر کرنے کی سی کرتی ہیں۔ بڑے بڑے سورماناکام ہو جاتے ہیں اور دیوباں نہیں پیروں تلے روند کر گزر جاتے ہیں۔ سادھو، سنت، جوگی بھکلتے رہ جاتے ہیں یا اپکلے جاتے ہیں۔ زیواس طاقت ہے اور یہ طاقت اب اس کی دسترس میں ہے۔“

اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا پھر اچانک میرے سامنے جھک گیا۔ میں اس کی حرکت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا اور یہ دیکھ کر تو میں اچھل کر پیچھے ہو گیا کہ وہ اپنی پیشانی کو میرے پیروں کے انگوٹھے پر لگانا چاہتا ہے۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”مجھے آزادی چاہئے۔“ اس نے میرے سامنے لمبی لمبی انگلیوں والے بڑے ہڑے ہاتھ جوڑ دیئے۔ مجھے ایک بار پھر وہی خواب میں دکھائی دینے والا بوڑھا یاد آگیا۔

”میں..... میں کیا کرتا ہوں۔ آپ کو کیسی آزادی چاہئے؟“ میں سمجھا نہیں اور پھر..... میں اس سلسلے میں بھلا کیا کر سکوں گا؟“ میں بری طرح بوکھا چکا۔

نیز ضروری تھا۔ میں پسلے ہی تباہیوں کو فیس کر رہا تھا۔“ میں جھنجلا گیا۔ ”اور سنو۔“ میں نہک کر بولا۔“ یہ تم کس کی طاقت کا ذکر کر رہے ہو؟“  
”تم مجھے اور سب کو آزاد کرو۔ بس۔“

وہ اس بار میرے قدموں میں سر جھکا کر اور دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ میں پھر پکلا گیا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم سب آزاد ہو مگر مجھے یہ بتاؤ کہ میں کب عذابوں سے آزاد ہوں گا۔“ میں نے کہا مگر اس نے میرا پورا جملہ سنایا نہیں۔ باہر کی طرف قلانچ بھری اور آنکھوں سے او جھل ہو گیا۔ میں ”ارے، ارے“ کہتا ہوا اس کے پیچے پکا مگر وہ باہر کی تاریکی میں غائب ہو چکا تھا۔ طبیب میرے پیچے ہی تھا اور اب ہونقوں کی طرح اندر ہیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”دیکھا تم نے.....! پتا نہیں کیا فراڈ تھا۔ اب ہمیں بھگتنا پڑے گا۔“ میں طبیب پر برس پڑا۔ ”نہیں ضیاء! مجھے اب بھی لیکن ہے کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیا خاک ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں جھلایا ہو اندر داخل ہو گیا۔ سامنے اینٹا کھڑی تھی۔ بالکل چاق و چوبند۔ مجھے حیرت ہوئی۔ وہ کہہ کر گئی تھی کہ اسے نیند آرہی ہے۔

”چلے گئے؟“ اس نے ہمیں دیکھتے ہی پوچھا۔  
”تھی بھائی!“ طبیب نے جواب دیا۔

اس نے گمراہیں لیا۔ آنکھیں پھیلا کر چاروں طرف اس طرح دیکھا ہے۔ وہ اس کمرے میں پہلی بار آئی ہو۔

”میرٹھ کب چلیں گے؟“ اپنک اینٹا نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے پوچا۔

”میرٹھ؟“ میں حیران ہوا۔ ”کیوں..... وہاں کیا ہے؟“

”لی جان وغیرہ۔“ اس نے بڑی دل فریب مسکراہٹ ہونوں پر سجا کر جواب دیا۔

”ہاں.....! نہیں، وہ..... وہ لوگ تو شاید ہمیں ہی میں ہوں گی۔“ میں نے رکری جواب دیا پھر طبیب سے بولا۔ ”تم کل سوریے ہی دہلی پڑے جاؤ۔“

طبیب نے سربراہ دیا۔

”نہیں ضیاء! ہم ایک ساتھ جائیں گے۔ وہاں ہماری ضرورت ہے۔“ اس نے انھلا

سفید رنگ کے کیڑے کلکلا رہے تھے۔

”یچھے ہٹو!“ میں ٹھپرا کر اور دور ہو گیا۔

”کہہ دو ضیاء.....! کہنے میں کیا ہے۔“

پھر طبیب نے میرے قریب آکر سرگوشی کی۔ میں نے لمحہ بھر طبیب کو دیکھ لپھریں خیال آیا کہ آکا بآگیا یقیناً پاگل ہو گیا ہے؛ واقعی میرا ایسا کہہ دینا کون سا بوجھ ہے۔ سو میں نے ایک نظر اس کے لرزتے ہاتھوں پر ڈالی، دوسری نظر اس کے زخمی ٹکوؤں پر اور یہ سوچ کر گھن کھا گیا کہ یہ یہاں تک آیا ہے، یہاں بیٹھا ہے اور زخموں میں کیڑے پڑے ہیں۔ میرا ایک جملہ کہہ دینا میرے ہی حق میں ہے۔ وہ یقیناً یہ سن کر چلا جائے گا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے..... مگر سنو! تم فوراً یہاں سے چلے جانا۔“ میں نے تاگواری سے کہا۔ اب بھی مجھے یہ جملہ کہنے میں عار تھا۔ میں خود ہی شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔

”ہاں.....! چلا جاؤں گا۔“ وہ خوش ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ”تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم مجھ پر کتنا بڑا احسان کرو گے۔ کسی ذی روح کو پانچ صد بولے کے عذاب سے رہائی دینا ایسا آسان نہیں، بہت بڑا احسان ہے۔ تم بہت طاقت ور ہو چکے ہو۔ میں اپنا احسان جتنا نہیں چاہتا لڑ کے، حقیقت میں میرے احسان کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے کہ میں نے یہ احسان خود غرضی کی بناء پر کیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم مجھ پر بلکہ سب پر یہ احسان ضرور کرو گے۔ زیوں ساتھی لاتی ہے تو اس ساتھی کو سمیت بھی سکتی ہے اور اسے ایسا کرنے پر مجبور کرنے والا صرف ایک ہی شخص ہتا اور وہ..... وہ تم ہو۔“

”تم کیا چاہتے ہو آخر اور کیا تم اینٹا سے شادی کر دینے کو اپنا احسان سمجھتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے ایسا مجبور آکیا ہے۔“

”ہاں.....! اس لئے مجبور آکیا ہے کہ تم ابھی اس کی طاقت سے واقف نہیں ہو۔ تم میرا احسان مانو گے اگر اپنے اندر احسان پیدا کرو۔ تباہیوں کو روک دینا تمہارے بس میں نہ تھا اگر تم ایسا نہ کرتے تو..... اور سنو! کبھی اپنی بیوی کو نوکنا نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ راز ہے۔ اسے راز رہنے رہتا۔ یہ اگر عیاں ہو گیا تو..... تو بھی بڑی تباہی آجائے گی۔“

”پھر وہی تباہی۔ تم پتا نہیں کیا چاہتے ہو۔ اگر تباہیوں ہی کی نوید دینا تھی تو یہ قطی

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ میرے خاندان سے تاواقف ہونے کے باوجود اس قدر اپناست اور بے تکلفی کاظمار کیوں کر رہی ہے۔ بہر حال یہ اس کی خوبی ہی تھی ورنہ باہر کی عورتیں کب خاندانوں کو لفٹ کرتی ہیں۔ مجھے اس کے انداز سے اتنی ڈھارس ضرور ہوئی کہ وہ گھر والوں اور ہمارے درمیان پیدا ہو جانے والی خلا کو اپنے رویے سے بھردے گی۔

طیب نے اینیتا کی تائید کی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہم سب ساتھ جائیں۔ ان دونوں کا گناہ تھا کہ حالات قابو میں آجائیں گے۔ طیب کا الجھ تو ایسا کہتے ہوئے کچھ کھوکھلا بھی محسوس ہوتا تھا مگر اینیتا اتنے وثوق سے کہہ رہی تھی کہ میں بھی سونپنے پر مجبور ہو گیا پھر میں نے اسے تفصیل سے گھروالوں کے بارے میں بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ میرا یوں شادی کرنا، خاندان والوں کے لئے بڑا سانحہ ہو گا کیوں کہ اب تک میرے بھائیوں کی بھی اتنی بہت نہیں ہوئی تھی کہ خاندان کے بڑوں کو اعتماد میں لئے بغیر کوئی ایسا قدام اٹھائیں۔ میں نے پوری صفائی سے یہ بھی بتایا کہ اس شادی میں اور اس قدر جگلت میں شادی اکیلے کر لیتے میں میری مرضی کا قطعی دخل نہیں تھا۔ یہ سن کر اس نے مجھ سے نہ کچھ پوچھانا نہیں نے بتانے کی کوشش کی۔ میرا خیال تھا کہ میری باتوں سے وہ دل گرفتہ ہو گی۔

”آں فکر نہ کر۔“

”آپ فکر نہ کرس۔“

اس نے سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا تو مجھے اس کا رویہ بہت اچھا لگا۔ اس میں سمجھوتا کرنے کی پلک تھی۔ وہ ہر قسم کے حالات کو بھینٹنے کے لئے تیار تھی بلکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے اسی رویے کی بنابر ان سب کو بہت جلد منا لے گی۔

☆-----☆-----☆

A decorative horizontal banner featuring three five-pointed stars of increasing size from left to right. The banner is composed of a dashed line with solid star outlines.

اگلے روز ہم شام تک گھر پر رہے۔ دن معمول کے مطابق، سوری شاید میں غلط کہہ گیا، معمول سے ہٹ کر پُر سکون گزرا تھا۔ اینتا نے کل کی گفتگو کے بعد بڑا بہتر اور خوش گوار دن گزارا۔ رات بھی اچھی گزری تھی حالانکہ مجھے ایک دوبار آکا باری کا خیال آیا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی کئی بار آیا کہ اینتا نے اس سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں

وہ مجھے ایک طرف کھینچ کر جو بولنا شروع ہوئیں تو بلا وقٹے کے بولتی چلی گئیں۔  
طیب ان کی پشت پر کان لگائے سب سن کر دبے دبے انداز میں بس رہا تھا۔

انیتا شاید سمجھ رہی تھی کہ مجھے ڈانٹ پڑ رہی ہے۔ اس کے ہونوں کے کناروں پر  
میں سی مسکراہٹ تھی اور وہ لا تخلی خاہر کرتے ہوئے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی مگر  
کبھی کبھی کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھتی اور مسکرا کر پلٹ جاتی تھی۔

”آپ بول چکیں۔“ زہرہ آپا کے جملوں میں وقف آتے ہی میں نے پوچھا۔  
”تم آخر بمبی میں ہو کیوں؟ یہاں رہے تو اور بگڑ جاؤ گے اور یہ طیب تو ہے ہی بگڑا  
ہوا نواب۔ تمہاری وجہ سے اب گھر کے لوگوں کو اس کے بگڑا کا سبب بھی تم دکھائی دے  
رہے ہو۔ اماں الگ پریشان ہوں گی۔ سارے بیٹے انہیں چھوڑ بیٹھے ہیں۔“

آخری جملہ کستے کستے ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ انہوں نے ناک سڑکی اور دوپٹے  
کے پلوے آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

”بھاہی! جی! اللہ کے واسطے۔ ہمیں بھی کچھ بولنے دیں۔“

طیب ان کی پشت کی جانب سے سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔  
میں سر کھجرا رہا تھا۔ طیب نے ٹھیک کما تھا کہ وہ سب کو پاکل کر دینے والی ہستی ہیں اور  
جانے طاہر بھائی کا گزارا کیسے ہوتا ہو گا۔

”تم.....!“ وہ ایسے چوکیں جیسے اسے پہلی بار دیکھا ہو۔ ”تم کماں سے آگئے؟“  
”میں ان دونوں کے ساتھ ہی آیا ہوں۔ آپ کو تو نظری نہیں آیا ہوں گا۔

خیر.....! اب جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ آں..... آں بولنے گا کچھ  
نہیں۔“ اس نے زہرہ آپا کو پھر اشارت لینے والی پوزیشن میں دیکھ کر تیزی سے کما۔

”صرف سر کے اشارے سے امان دے دیں اور پھر پوری توجہ سے میری بات سن لیں۔“  
”بھاہی! آپ بیٹھیں۔“ طیب نے انیتا کو اشارہ کیا۔ مگر زہرہ آپا بعد سے صوفے پر  
بیٹھ گئیں پھر محسوس کر کے کہ طیب نے انہیں نہیں انیتا کو مخاطب کیا ہے تو کچھ حیران

ہوئیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے بھاہی کئے کام مطلب پوچھتیں، طیب جلدی سے بولا۔  
”آپ میرے ساتھ آئیں۔“ اب طیب نے ان کا ہاتھ تھام کر کھڑا کر دیا۔

انہوں نے جاتے جاتے مز کر ایک دوبار پھر انیتا کو حیرانی سے دیکھا، مجھے دیکھتے ہی  
ان کے چرے کے تاثرات تیزی سے بدلتے اور لگا جیسے ابھی رو دیں گی مگر رونے کا منظر

نے بھی خود پر قابو رکھا، اس سے بات نہیں کی البتہ میں اور طیب صح ناشتے کی نیبل پر اس  
کے بارے میں گفتگو کرچکے تھے۔

دوپر میں سو گیا اور طیب گوپال کے پاس چلا گیا۔ انیتا گھر کی صفائی کروانے میں لگ  
گئی۔ ہم نے ڈرائیکٹ روم میں ٹھیک بدو محسوس کی تھی جو خون کی بدبو لگ رہی تھی۔ انیتا  
کا خیال تھا کہ رات کتے کے گوشت سے پسکنے والا خون فرش پر جم گیا ہو گا اس لئے بدبو  
ہے۔ آج وہ اس کی صفائی میں لگ گئی تھی۔ میں جی بھر کے سویا۔ شام کو اھا تو طیب آچکا  
تھا۔ انیتا نہانے چلی گئی تھی۔ طیب نے بتایا کہ زہرہ آپا دوبارہ فون کر کے کہہ چکی ہیں کہ ہم  
جلدی آجائیں۔ میں بھی ڈا جانتا تھا کہ وہ آج سوریے سے کھانے پاکانے اور صفائی کرنے  
میں لگی ہوں گی۔ فراغت ہوتے ہی ہمارا انتظار شروع کر دیا ہو گا اور یہ وقت ان سے  
کالئے نہیں کٹ رہا ہو گا۔

”تم تیار ہو جاؤ یا! ورنہ اب گھر کے ہر فرد سے فون کروائیں گی وہ۔ ویسے  
ضیاء..... یہ گئی کس پر ہیں۔ عصمت تو بالکل مختلف ہے اور تمہاری اماں تو شاید کائنات  
کی سب سے پر کوئون ہستی ہیں۔“ طیب چڑ کر بولا۔

”یہ خالہ بی پر گئی ہیں۔“

”لو.....! وہ تمہاری تالی کی بس ہیں۔ ان سے کیا تعلق؟“  
”خاندان کی ہیں۔ یہ طبیعت انہیں پورا شت میں ملی ہے۔“ میں نے کوٹ پسند  
ہوئے کہا۔

”پتا نہیں، طاہر بھائی کیسے گزارا کرتے ہیں؟“ طیب نے منہ بنا کر کہا۔  
اتی ویر میں انیتا آگئی۔ آج اس نے فیروزی رنگ کا پلین شلوار قیص پہننا تھا۔ میں  
نے لمبیان کا ساس لیا۔ جو ساڑھی اس نے کل باندھی تھی، اس سے تو مجھے وحشت  
ہوئے لگتی اگر وہ وہی پہن لیتی تو..... ہم تیوں ناصر بھائی کی طرف چل پڑے۔ میں نے  
زہرہ آپا کے بارے میں اسے مختصرًا بتادیا تھا مبارا وہ دل گرفتہ ہو۔

وہاں پہنچ کر جب زہرہ آپا نے انیتا کو ہمارے ساتھ دیکھا تو ان کا رنگ اڑ گیا۔  
”یہ..... یہ کون ہے؟ تم پاکل تو نہیں ہو گے ہو۔ میرے سر اسی وائلے کیا کہیں  
گے، یہاں آکر بالکل بگڑ گئے ہو۔ لڑکیوں سے دوستیاں رکھتے ہو اور اتنی دیدہ دلیری سے  
اسے یہاں بھی لے آئے۔ طاہر تو میری جان کھالیں گے۔“

اس کی باتیں سن کر انتا مسکرا رہی تھی۔ ”دچپ خاتون ہیں۔“ وہ بولی۔  
”دو دن کے لئے آپ لے جائیے۔ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔“ طب نے  
ہل کر جواب دیا۔

میں ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔ اندر گیا تو وہ پکن میں تھیں۔ بڑی تیزی سے برتن  
کپڑے سے صاف کر رہی تھیں۔ میں چکے سے دروازے پر جا کر کھڑا ہوا۔ طب نے کما تھا  
کہ آدھا دریا تم سونتو مگر میں تو پکھ بھی نہیں تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے کھانے کے  
برتن اور چپھوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھیں۔ چھرے پر خوشی تھی، مجھے یقین ہو گیا تھا کہ  
اب تک سب پکھ بھول بھال گئی ہوں گی۔

”کیا پکایا ہے آپ نے؟“ میں نے دھیرے سے کما گمراہ اچھل پڑیں۔

”آئے! ڈر ادیا مجھے۔“ وہ بینے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔

”انتا کیوں ڈرتی ہیں آپ؟ طاہر بھائی نہیں ہیں کیا؟“ میں نے دوسرا جملہ پلے جملے  
کا اثر زائل کرنے کے لئے بولا تھا۔

”ہیں تو یہیں..... ذرا باہر گئے ہیں۔ اچھا تم میں کیوں آگئے۔ جاؤ میھو۔ میں  
شربت لے کر آتی ہوں۔“

میں نے موقع غنیمت جانا اور فوراً دہان سے کھک آیا۔ طب کو آکر سب بتایا تو وہ  
ہل گیا۔

”یار! اب قسم کے بجوبے تمارے ہی گھر میں پیدا ہوئے ہیں؟“

”نہیں! ایک ناصر چوپا کے گھر میں بھی ہے۔“ میں نے اس پر ٹزکیا۔ انتا ہنسنے لگی۔  
یہ وقت شربت کی ٹڑے اٹھائے زہرہ آپا اندر داخل ہوئیں۔ انتا کے چرے پر نگاہ پڑتے  
ہی ان کے تاثرات متغیر ہوئے تھے۔ میں ڈر گیا مگر پھر وہ شربت پیش کرنے لگیں۔ ذرا دری  
بد ہی وہ اس سے گھل مل کر باتیں کر رہی تھیں۔ نہ تو انہوں نے یہ پوچھا کہ آخری ایسی  
لیا ایسہ جنی تھی اور سہ یہ کہ انتا ہے کون اور کمال میں؟ ایک مفرکہ سر ہو چکا تھا۔ انتا  
لے تدر بے تکلفی اور اپنا سیست سے باتیں کر رہی تھی کہ انہیں ایک لمحے کو بھی اس کے  
ارس میں سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ اب میرے دل کو کافی ڈھارس تھی۔ زہرہ آپا نے  
ٹکلف دعوت کا انتظام کیا ہوا تھا اور میری پسندیدہ ڈسٹریبیوٹری تھیں۔

اچھا تو یہ ہوا کہ اس دوران میں نہ تو طاہر بھائی آئے، نہ ناصر چوپا وغیرہ۔ زہرہ آپا بتا

میں نہیں دیکھ سکا، اس لئے کہ طب اس سے پلے ہی انہیں اندر لے جا چکا تھا۔  
”تم ماہنڈ مت کرنا۔“ میں نے جھینپ کر انتا کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو ہوتا ہی تھا۔“  
”فکر نہ کریں۔ ایسے حالات میں اکثر ایسی بجو شنز پیدا ہو جاتی ہیں۔“ اس نے  
اطمینان سے جواب دیا، میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

ہم دونوں خاموشی سے باہر کان لگائے بیٹھے تھے میں جانتا تھا کہ طب انہیں راضی  
کر رہا ہو گا۔ تفصیل بتا رہا ہو گا۔ وہ واحد ہستی تھیں جن کے بارے میں کوئی نہیں کہ سکتا  
تھا کہ ان کا رو عمل کس بات پر کیا ہوا گا۔ مگر بات خوشی کی ہو یا غم اور دکھ کی۔ ان کا ہولانا  
ضروری تھا۔ بھی وہ مارے خوشی کے ہولاتی تھیں اور کبھی مارے غم کے۔

بہت دیر تک اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ پتا نہیں، طاہر بھائی گھر پر تھے بھی کہ  
نہیں۔ ناصر چوپا کی موجودگی کا بھی کوئی احساس نہیں تھا۔ اب مجھے کوفت ہونے لگی تھی۔  
جی چاہ رہا تھا کہ اندر جا کر حالات کا جائزہ لوں مگر انتا نے شاید میرا ازادہ بھانپ لیا۔

”سب ٹھیک ہے۔ بیٹھے رہیے۔“

اس نے بے ساختہ کہا، میں چونکا کہ وہ میرا ارادہ جیسے جان گئی مگر اس کی نگاہیں  
میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، میرا خیال تھا کہ وہ اچھی قیافہ شاس بھی ہے۔

دوسرے ہی لمحے طب اکیلا کر کرے میں داغل ہوا۔

”کیا ہوا؟“ میں نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”آدھا دریا میں سونت آیا ہوں۔ آدھا تم سونتو۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں صوف  
پر بیٹھ گیا۔

”ہوا کیا، بتاؤ تو۔“

”شادی کا سنتے ہی پلے تو مارے خوشی کے روپڑیں پھرد کھے سے روئیں کہ اماں وغیرہ  
دور تھیں مگر میں تو یہیں تھی۔ ایسہ جنسی میں مجھے بھی بھول گئے۔ پھر اپنے ارمان کا ماتم  
کیا۔ اب اماں وغیرہ کے ارمانوں کو خاک میں ملتا یکھ کر روری ہیں اور یہ دکھ بھی ہے کہ  
عصمت کا یاہ ہونے تک انتظار کر لیتا تو کیا بگز جاتا۔“

”انتا کے لئے کیا کہا؟“

”انتا وقت کمال ملائیں سوچنے کا۔ اب جاؤ۔ تمارے حصے کے جوتے میں کھا آیا  
ہوں۔ تم صرف تسلی دے دینا۔“

”نمیں! ہوا تو کچھ بھی نہیں۔ وہ عصمت کی عادتی جنگلی بلی کی سی ہیں۔ وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جاتی ہیں۔“ وہ جھینپ کر بولا۔

”انمیں چھوڑو۔ تم اماں کی فکر کرو۔“ میں نے ہست کر کے دروازے پر دستک ریتے ہوئے کہا۔ دروازہ طیب کے کچھ بولنے سے پسلے ہی کھل گیا۔ سامنے سپاٹ چڑھ لے عصمت آپا کھڑی تھیں۔

”السلام علیکم!“ میں نے اور اینتا نے ایک ساتھ سلام کیا۔

انہوں نے وعلیکم السلام کہ کر ایک سرسری نگاہ انیتا پر ڈالی اور پلٹ گئیں پھر چوکمیں، چٹیں۔ میں نے دم سادھ لیا مگر وہ اس بارہمیں نہیں، ہماری پشت پر کھڑے طیب کو دیکھ رہی تھیں۔

”تم پیاس کیا کر رہے ہو؟“

”کون.....؟“ طیب پلٹ کر گلی میں دیکھنے لگا۔

”ارے! تم۔“ وہ تیز لبے میں بولیں۔

”میں؟“ اس نے سینے پر انگلی رکھ کر ”میں“ کو کھینچا۔ ”اوہ! میں تو ان دونوں کو پھوڑنے آیا تھا۔“

”چھوڑ دیا؟ جاؤ۔“

”عصمت آپا!“ میں نے ان کا مودہ گزتا دیکھ کر مدخلت کی۔

”اور تمہیں کیا کوئی ضروری کام یاد آگیا یا کوئی جیز بھول گئے تھے؟“ انہوں نے طنزیہ انداز میں مجھ سے کہا۔ ”اور آپ کو کس سے ملتا ہے؟“ آخری جملہ عصمت آپا نے انیتا کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

”عصمت آپا! اندر آنے دیں گی؟“ میں نے نرم لبجے میں کہا۔ انیتا انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر نہ گھبراہٹ تھی نہ تردود۔ نہ ہی اس پر عصمت آپا کے لبجے نے کوئی اثر کیا تھا۔

عصمت آپا نے گھوڑ کر مجھے دیکھا اس دوران میں طیب آسمان میں کچھ ٹالش کرتا رہا۔ وہ کچھ دری اسی طرح گھورتی رہیں پھر پلٹ کر اندر چل گئیں۔

”کون ہے عصمت؟“ اماں کی آواز اس کے کمرے سے آئی تھی۔

”آپ کے کھوئے ہوئے صاحب زادے آگئے ہیں۔“ عصمت نے دس سے

چکی تھیں کہ ناصر پچا وغیرہ کل شام سے اپنے سرال گئے ہوئے ہیں۔ غالباً کوئی تقریب وغیرہ تھی آج۔ ظاہر بھائی رات کو زہرہ آپا کو لے کر جانے والے تھے۔ ہم دوپہر بھروسہیں رہے مگر شام سے پسلے لوٹ آئے۔ میں خود میں ظاہر بھائی کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں پا رہا تھا۔ باوی زہرہ آپا تھیں، ظاہر بھائی نہیں تھے۔ وہ تو خوب لٹے لیتے اور ممکن ہے کہ انیتا کو بھی ناپسند کرتے۔ بہرحال ہم ان کے آنے سے پسلے ہی چلے آئے۔ زہرہ آپا کو میں نے بتایا تھا کہ ہم کل دہلی کے لئے روانہ ہو رہے ہیں۔ دہلی کے نام پر انہوں نے کمی آنسو پنچاہور کر دیئے۔ اماں کو لمبا پوزا خط لکھا جو آدمی سے زیادہ انیتا کی تعریف میں تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔ خط سے یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس شادی میں زہرہ آپا بھی نہیں تھیں۔ اور یہی بات میرے حق میں جاری تھی۔ میں بغیر کچھ کہے یہ ظاہر کر سکتا تھا کہ زہرہ آپا تھیں۔

اس رات ہم نے جانے کی تیاری کر لی۔ انیتا پر سکون تھی وہ زہرہ آپا سے کافی متاثر ہوئی تھی۔ اس کے بقول وہ بے حد معصوم تھیں اور یہ حق بھی تھا مگر مجھے عصمت آپا کی نکر تھی۔ وہ اس قدر اکھڑا منہ پھٹ اور سخت مزاج کی تھیں کہ کسی کا لحاظ کئے بغیر ہی جو منہ میں آتا تھا، کہہ جاتی تھیں۔ میں نے حفظ ماقبلہ کے طور پر انیتا کو اس کے بارے میں بتا کر درخواست کی تھی کہ وہ ناگوار باتوں کو سہلے۔ اس نے اس بار بھی مجھے تسلی دلائی تھی۔ طیب زہرہ آپا کو بتا آیا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہے۔

☆-----☆

ایک دن اور رات کے طویل سفر کے بعد ہم لوگ دہلی پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر مجھ پر گھبراہٹ طارہ ہی ہو گئی۔ دل بیٹھنے لگا۔ طیب گو خود بھی گھبرا یا ہوا تھا مگر مجھے پھر بھی تسلی دے رہا تھا۔

”کچھ نہیں ہو گا ضیاء! آپ یونہی گھبرا رہے ہیں۔“ انیتا نے کہا۔ زہرہ آپا بھی اتنی اچھی ہیں۔ آپ تو ان سے بھی گھبرا رہے تھے۔“

”ہاں یا ر.....! میں ہوں نا۔ تم کیوں گھراتے ہو۔“ طیب نے سینے چوڑا کر کے کما مگر جب ہم گھر کے دروازے پر پہنچے تو وہ سب سے پیچے تھا۔

”اب کیا ہوا؟“ انیتا نہیں۔

جواب دیا اور پکن میں چل گئیں۔

”ارے کون ہے؟ ضیاء کہ رضلا۔“ اماں کی آواز میں بے چینی تھی۔ میرا دل بھر آیا۔ اسکی بے چینی کبھی کبھی ہی ان کے اندر پیدا ہوتی تھی۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ وہ بھرے گھر میں رہنے والی، آج اپنے بچوں سے بھی جدا اور ایکلی تھیں۔ عصمت آپا کو تو تسلی دنیا بھی نہیں آتی تھی۔ زہرہ آپا ہی تھیں جوان کا دکھ برابر کا بانت لیا کرتی تھیں۔ گھر میں اور کسی کی موجودگی کے آثار نہیں تھے۔ میں نے امیتا کو وہیں رہنے کا اشارہ کیا اور لپک کر اندر داخل ہو گیا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اماں کے زرد چڑے پر لمحہ بھر کو رونق پھیلی پھر انہوں نے منہ پھیر لیا۔

”اماں! ناراض ہیں؟“ میں نے سلام کرنے کے بعد ان کے قریب بیٹھ کر ان کا ہاتھ ٹھام لیا۔ ”آپ تو جانتی ہیں کہ میں کیوں گیا تھا؟“

”لیکن خط میں خیریت لکھنے سے تو پکھ نہ ہو جاتا۔“ وہ ایک دم پھوٹ پڑیں۔ ”ایک رضاہی بے تلقی کو کافی تھے۔ اتنے قریب رہتے ہوئے بھی انیس گھروالوں کا خیال نہیں آتا۔ نہ کبھی بن سے ملنے کی ہڑک ہوتی ہے، زہرہ نے لکھا تھا کہ وہیں سے انگلینڈ روانہ ہو گئے۔ فون کر کے فرض نبھادیا اور بس۔ تم کہاں کی تیاری کر رہے ہو یا بڑے بھائی نے رضا کے بعد تمہیں بھی بلایا ہے؟“

”وہ بولتی چلی گئیں۔ مجھے پہلی بار دونوں بھائیوں کی بے حسی کا احساس ہوا۔ رضا بھائی بسمی میں تھے۔ نہ میرے پاس ایڈرلیس تھا، نہ زہرہ آپا کے پاس درندہ میں تو ضرور جاتا۔ دہلی کے پتے پر گلی بندھی رقم بھیج کر وہ گویا تمام فرائض نبھارہے تھے۔“

”میں کہیں نہیں جا رہا اماں! اور اب کہیں بھی نہیں جاؤں گا۔“

”وے بچ!“ اماں سارے دکھ بھول گئیں۔

”جی اماں! اب میں یہیں رہوں گا لیکن اماں.....! آپ بڑے دل والی ہیں۔ آپ نے اولاد کی ہر خطہ کو ہمیشہ معاف کیا ہے۔ میری غلطیوں کو بھی معاف کر دیتی۔“ میں نے ان کے گھنٹے پر سر رکھ دیا۔

”اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ سب خیریت تو رہی تاں۔“ وہ تشوش سے بولیں۔ شاید انہیں پچھلے نہ اب یاد آگئے تھے۔

”جی اماں! سب خیریت رہی اور اب مجھے یقین ہے کہ خیریت ہی رہے گی۔“

”اے اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“  
”لیکن اماں.....! میں نے بہت بڑی قیمت چکائی ہے اس سکون کی۔“  
”کیوں..... کیا ہوا؟“ وہ ایک دم پر بیٹھا ہو گئی۔ مگر ان کے اس موضوع نے نہیں پیدا کر دی۔ میں نے دھیرے دھیرے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ انہیں اصل بات سے بہر کر کے ہی میں آنے والے طوفان کو روک سکتا تھا۔ میری میری باتیں سن کر ان کے پرے پر ایک رنگ آتا رہا، ایک جاتا رہا۔ کبھی ان کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور کبھی وہ سن بھی رہ جاتیں۔ میری شادی کر لینے والی بات سن کر تو وہ لمحہ بھر کو سکتے میں ہی رہ گئی۔

”اے میں اب بی جان کو کیا جواب دوں گی۔ ابھی جانے سے پہلے ہی تو میں نے ان سے فرحت کی بات کی تھی۔ وہ اس کے لئے بہت پر بیٹھا تھیں۔“

”بی جان وغیرہ کو جانے کیوں دیا آپ نے؟“  
”بھی! خالہ بی کہاں مانتی ہیں اور ہاں.....، شادی کر کے یہی کو کیا وہیں چھوڑ نے؟“  
”نہیں اماں! وہ ساتھ آئی ہے۔ میں نے ہی باہر روک دیا تھا کہ کہیں اپ.....“

”بلاؤ۔ جوڑے تو آسمان پر لکھے جاتے ہیں۔ آدمی کے بس کی بات کہاں ہوتی ہے۔“  
”خوب سوچتا ہے، کب پورا ہوتا ہے۔“

اماں کا روز عمل سمجھدار لوگوں کا ساتھا جب کہ مجھے جذباتی روز عمل کی توقع تھی۔ کچھ ریاضت کی تھی مگر میرا یہ فیصلہ کہ انہیں سب کچھ بچ بچتا دینا چاہئے، ایک درست نہ لکھا۔ طیب اور امیتا باہر ہی تھے۔ عصمت آپا کثرا زبان کا کام برتوں سے لیا کرتی تھیں، مگر بر تن پختن اداز بر بر آرہی تھی۔ عصمت آپا اکثر زبان کا کام برتوں سے امیتا کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ایں مسکرائی جیسے حالات اس کی توقع کے مطابق نکلے ہوں۔ اماں نے امیتا کو بڑے پیارے قبول کیا۔ میں بتا پکھا تھا کہ وہ اب دنیا میں اکیلی ہے اور اس کی ماں اور بیوں ایک ساتھ مر جوکی ہیں۔ اماں رحم دل تھیں۔ انہوں نے ہمارے سارے خدشات غلط نہیں۔ طیب اسے اپنا کارنامہ سمجھ رہا تھا۔ خوش تھا۔ عصمت آپا کو پتا چلا کہ امیتا میرا

”عصمت! تو زبان بند رکھ۔ یہ چھٹا نک بھر کی زبان ہی فساد کی جڑ ہے۔“ اماں کو نہ آگیا۔ ”بھائی! یوں لایا ہے، یہ خوشی کی بات نہیں۔“

”ہاں! ایسے لایا ہے میسے آئٹے کی تھیلی بازار سے لایا ہو۔“

میں نے گھبرا کر اینتا کی طرف دیکھا جو اماں سے مزركی پھیلوں کی نوکری لئے صحنی پہنچے تخت پر بیٹھ رہی تھی۔ اس نے یقیناً سن لیا ہو گا مگر اس کے چرے سے لگ رہا تھا ہے اس نے کچھ سنائی نہیں۔

”چپ رہ کم بجت!“ اماں نے دانت کچکپاٹے۔ ”اخلاق پیدا کر خود میں۔ اخلاق سے بہ کر کوئی خوبی نہیں۔“

”ہاں عصمت آپا! ایک پتے کی بات بتاؤں؟“ طیب جلدی سے بول اٹھا۔ غالباً اسے رہو گا کہ عصمت کا جواب اب اور زیادہ کڑوہ بھی ہو سکتا ہے۔

”تم ساری پتے کی باتیں اپنے پاس رکھو۔ میں منے دادا کا انتفار کر رہی ہوں۔ یہ اڑی کارستانی تمہاری ہی ہوگی۔ بھمی کی آب وہوا خراب ہے۔“

”میں بھی ان کا انتفار کر رہا ہوں اور بھمی کی آب وہوا انسانیت اور کردار کی ٹونکیں معاون ہوتی ہے۔“

”میں نے بھمی کے بہت سے انسان دیکھے ہیں۔ جو وہاں جا کر پڑ جائے، اس کے دار کی جڑیں بھی کھو کھلی ہو جاتی ہیں۔“ وہ برا بر جواب دیئے گئیں۔

”اچھا! چپ رہ فلسفی! کام کر اپنا۔“ اماں نے اس بار انہیں فوج ہی لیا۔

”اسے چپ کرائیں۔“ وہ بلبا اٹھیں۔ ”اپنے گھر میں رہنے کی عادت نہیں ہے یہ؟ دوسروں کو پریشان کرنے پہنچ جاتا ہے۔“

اب بات میری برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ میں بھٹلیا ہوا کچن میں پہنچا۔ عصمت آپا! آپ کی بات مذاق کی حدود سے نکل چکی ہے اگر آپ کو میرے اور اینتا کے نے تکفیں پہنچی ہے تو.....“

وہ چپ رہیں مگر اماں بلک اٹھیں۔ ”ارے! بکنے دے اسے۔ سارا دن اس پھر کے غر بر پھوڑتی ہوں۔ اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہو گا۔ گھر بھر میں ایسی چکراتی پھرتی۔ پھر وہ دیواروں سے محبت ہے اسے۔ انسانوں کی چہل پہل کھلتی ہے۔ بھرا گھر ن ہونے کی سب سے زیادہ خوشی اسی کو ہے۔ جمال ہے جو کبھی کسی بین یا بھالی کو یاد

یوں ہے تو انہوں نے چونک کر پلے مجھے پھر اینتا کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ کچھ بولیں نہیں۔

ان کے ساتھ سب سے برا مسئلہ یہی تھا کہ ان کا چہرہ کسی تاثر کو منکس نہیں کرنا۔ کچھ پتا نہیں چلا کہ انہیں اس خبر نے خوش کیا یا غم زدہ؟ بس اس کے بیٹھے رہ جانے کے انداز نے احساس دلایا کہ ان کے تاثرات زہرہ آپا سے مختلف نہیں۔ صرف طریقہ اظہار محبت مختلف ہے۔ اینتا نے زہرہ آپا کی طرح عصمت آپا سے بھی بے تکلفی سے گفتگو کرنا چاہی تو وہ چپ چاپ اٹھ کر چل گئیں۔ اینتا نے ماہنڈ نہیں کیا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ اماں کی ناگہیں دبارہ تھی۔

گھر کا ماحول بالکل بدل چکا تھا۔ اماں خوش تھیں۔ اینتا گھر بھر میں گھومتی اور بہت پھر رہی تھی۔ طیب اور میں خوش تھے حالانکہ جیرت ہمیں سمجھیدہ رہنے پر اکساری تھی۔ منے دادا اور منی دادی قول باغ کسی سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ اماں نے بتایا کہ شام تک لوٹ آئیں گے۔ یہاں کے ماحول اور اماں کے رویے نے مجھے بالکل یہاں پھلکا کر دیا تھا۔ عصمت آپا کا رویہ تو سب کے ساتھ ہی ایسا تھا۔ وہ معمول کی بات تھی اس لئے میں بو جھل نہیں ہوا۔ طیب کو وہ زیادہ گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ اماں نے فوراً ہی کھانے پہنچنے کا بندوبست کر لیا۔ وہ اور عصمت آپا کچن میں لگ گئیں۔ اینتا نے بھی ہاتھ بیانا چاہا تو عصمت آپا نے منع کر دیا اور بولیں۔

”ہم اپنے کام خود کرنے کے عادی ہیں۔“

”یہ عادت میری بھی ہے۔“ اینتا نے ان کے سر در رویے کو نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”حال ہی میں ڈالی ہو گی یہ عادت۔“ انہوں نے سالم بھونتے ہوئے طنزہ انداز میں جواب دیا۔

”عصمت! میرے لئے کھیر ضرور بنایے گا۔“ طیب جوان سے ایسی ہی حرکتوں کی توقع باندھے دیں کھڑا تھا، بول اٹھا۔

”ارے ہاں! وہ تو بنے گی۔ بھلا اتنی بڑی خوشی ہو گھر میں اور وہ بھی چپ پہنچاتے۔“ اماں نے لہک کر کہا۔

”کون سی خوشی؟“ عصمت آپا نے تیز لمحے میں پوچھا۔

کر کے دو آنسو بھالے۔ ہم بوڑھوں کو بھی یوں برداشت کرتی ہے کہ کونوں میں پرے چھپتوں کو سکتے رہتے ہیں۔ دو گھری پاس بیٹھ کر جو باقیں کر لے۔"

"ارے اما! آپ کیوں رو نے لگیں؟"

انیتا اٹھ کر پکن میں چل آئی۔ عصمت آپا ویسے ہی سالم بھونے لگی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ "عصمت آپا بھی کیا کریں! رونق کے پسند نہیں ہوتی۔ اماں مگر جب گھر میں رہنے والے گھر کو چھوڑ گئے، پلٹ کرنے آئے تو عصمت آپا کیا کرتیں۔ تنہائی، اکیلا پن، کڑواہت نہیں بھرے گا تو اور کیا ہو گا۔" پھر وہ مجھ سے بولی۔ "چلنے! آپ کمال میدان میں اتر آئے؟ کوئی معرکہ تھوڑی ہو رہا ہے۔ طیب اور عصمت آپا باقیں کر رہے ہیں، کرنے دیں۔ چلیں اماں!" اس نے اماں کا بازو تھام لیا۔ "میں عصمت آپا کا ہاتھ بیانی ہوں۔ آپ آرام کریں۔" وہ اماں کو لے کر تخت پر جانیشی۔ میں بھی وہیں آگلے طیب بھی ماول میں تاؤ کے خوف سے تولیہ لے کر نمانے چلا گیا۔ انیتا مڑاٹھا کرو دبارہ پکن میں پنج گئی۔ ذرا دریں بعد عصمت آپا پیر پیختی ہوئی باہر نکلیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

"اے ہٹو بھی! یہ تو بڑی منہوس ہے۔ میں کرتی ہوں۔" اماں فوراً اٹھ کر پکن میں پچھیں مگر انیتا نے زبردستی انہیں بھاول دیا اور کما کہ وہ صرف یہ بتا دیں کہ کیا کیا بنے گا۔ اماں ضد کرتی رہیں مگر انیتا نے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ کوئی کام انہیں نہیں کرنے دے گی۔ یہ بھگڑا بڑھا نہیں، میں نے اور طیب نے اماں کو بھاول دیا ورنہ اماں مسلسل بڑھا رہی تھیں۔ عصمت آپا پھر پلٹ کرنے آئیں۔ انیتا نے ہنستے ہنستے باقیں کرتے سارا کام کر لیا۔ مجھے بت خوشی ہوئی اور یہ احسان بھی ہوا کہ میں نے قدم اٹھایا ہے یا جو کچھ ہو چکا ہے، وہ اتنا غلط نہیں ہوا جتنا میں سمجھ رہا ہوں۔ صرف گھنٹا بھر کے بعد ہی جب انیتا نے کھانا تیار ہو جانے کا اعلان کیا تو اماں بھوچکی رہ گئیں۔ "اے اتنی جلدی؟ بوا! پکانا آتا بھی ہے تھیں کہ بس مروت میں کھڑی ہو گئیں؟"

طیب ان کی بات پر نہیں پڑا۔ ان کا انداز ہی ایسا تھا۔ انیتا بھی نہیں۔ "کھا کر رکھنے گا۔"

اور پھر جب کھانا دستِ خوان پر لگا تو سب ہی جراثم ہو گئے۔ کئی طرح کی چیزیں تباہ تھیں۔ اس خوبی کا مجھے ابھی ابھی پتا چلا تھا۔ طیب اور اماں مزے لے لے کر کھا رہے تھے اور میرے دماغ میں عجیب کھد بد ہو رہی تھی۔ ایک گھنٹے کے اندر کئی چیزیں بنا لیتی میر

سمجھ سے باہر تھا۔ اس بات کو شاید طیب نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ وہ کھاتے کھاتے چونکر بولا۔

"بھاپ! ذاتِ تھ تو خیر، کسی کے ہاتھ میں آہی جاتا ہے مگر آپ کے ہاتھوں میں کوئی مشین فٹ ہے کیا؟"

"اے ہاں دلسن! یہ سب اتنی جلدی کیسے بن گیا؟" اماں نے بھی جیرت سے پوچھا۔ "جلدی کمال اماں! آپ کو بیٹھ سے باقی کرنے میں وقت کا اندازہ نہیں ہوا۔" اس کا انداز نالئے والا تھا۔

بھر حال انیتا نے لمحوں میں اماں کو ہاتھ میں لے لیا۔ عصمت آپا جانے کمال جاچکی تھیں؟ مجھے فکر تھی کہ انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا مگر اماں نے کہہ دیا۔ "لو! وہ بوا بھوکی نہیں رہ سکتیں۔ کہیں نہ کہیں سے کچھ نہ کچھ کر کے پیٹ بھر لیتی ہیں۔ تم نہ لاؤ۔"

پھر وہ زہرہ آپا کی خیریت پوچھتی رہیں۔ انیتا سے اس کے خاندان کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جانے اس نے کیا بتایا، مجھے پتا نہیں چل سکا کیونکہ میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔ لیٹھے کو چلا گیا۔ اپنے کمرے میں جانے کے لئے مجھے عصمت آپا کے کمرے کے سامنے سے گزرنا پڑا تھا۔ وہاں پہنچ کر خیال آیا کہ عصمت آپا سے بات کروں۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ ان سے کبھی کسی نے نہیں کہے تھی اور محبت سے بات ہی نہیں کی تھی۔ وہ پہنچنے سے اکھڑی تھیں۔ منہ پھٹ تھیں۔ ان کی اسی عادت کی وجہ سے سب ان سے کترائے رہتے تھے۔ کسی نے یہ جانے کی کوشش نہیں کی کہ کی کیوں پیدا ہوئی؟ اماں تو انہیں پیدا کر کے بھول گئی تھیں۔ تھیں خالہ یعنی فرحت کی ایسیں تھیں۔ انہوں نے عصمت آپا کا خیال رکھا۔ وہ ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ان کی موت کے بعد گھر کا ہر فرد ان سے الجھتا ہی رہا کہ بد تمیز ہے۔ ان کا پرا بلم محبت سے محروم تھی جو تھیں خالہ کے بعد اور گری ہو گئی۔ پانیں، اتنے برس گزرنے کے بعد آج مجھے ان باقوں کا خیال کیوں آیا تھا؟ مجھے عصمت آپا پر ترس آیا میں نے دھیرے سے ان کے کمرے کے بند دروازے کو دھکیلا۔ وہ کھلتا چلا گیا۔ عصمت آپا نیم تاریکی میں آنکھوں پر بازو رکھے لیٹھ تھیں۔ میں ان کے قریب بلا آہت پہنچ گیا۔

"عصمت آپا!" میں نے ان کے قریب بینچ کر دھیرے سے انہیں پکارا۔ وہ چونک اٹھیں۔ بازو ہٹا تو ان کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ

ہو رہی تھیں ”تم.....!!“

”آپ..... آپ رو رہی ہیں؟ کیوں؟ کیوں عصمت آپا؟“

”کس ناتے سوال پوچھ رہے ہو؟“ انہوں نے اپنے روایتی انداز میں پوچھا۔

”بھائی ہونے کے ناتے۔“ میں کچھ شرمندہ ہو گیا۔

”لیا ہمارے درمیان ناتا برقرار ہے؟ کبھی برقرار بھی رہا تھا؟“ ان کی آواز لرز گئی۔

”عصمت آپا! مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے مگر حالات آپ کے سامنے ہیں۔“

”جہاں سیلان سے گھر بار بہ جاتے ہیں، زندہ پیچے موجودوں کے زیر دم میں گم

ہو جاتے ہیں۔ جہاں طوفان سب کچھ اجڑا کر چلا جاتا ہے۔ جہاں زلزلوں سے اوپنی پیچی

عمارتیں گرداتی ہیں۔ لوگ دب کر مر جاتے ہیں، وہاں بھی رشتے ناتے نہیں مرتے ضیاء!

پیچے کھجیرے رشتے ایک دوسرے کے غم باٹنے کو اور قریب آجائے ہیں۔ تمہارے اوپر کون

سے طوفان گز رے؟ اماں کو غم مل تو کیا حواس ختم ہو گئے تھے؟ نہیں! سب کچھ دیسا کا ویسا

موجود ہے مگر مجھ سے ہر ایک کاتاٹوٹ چکا ہے اور ناتا کوئی تھا ہی کب؟ پہلے روز سے

نہیں میں اجنہی رہی۔ کسی کو یہ خیال بھی نہیں آیا کہ باپ میرا بھی تھا جو دادا میرا بھی تھا جو

جدا ہوا۔ تھیں خالہ سے رشتہ جڑا تھا جو نوتا تو میں زیادہ زخمی ہوئی کہ بالکل اکیلی رہ گئی۔

زہرہ آپا بیانی گئیں تو دنیا سے لپٹ کر روئیں۔ میرا خیال انہیں بھی نہ آیا۔ بھائی گے تو

خیریت کی چھپی بھیجتے ہوئے ایک جملہ لکھنے میں بھی بغل سے کام لیا یا شاید میں یاد ہی نہ

رہی۔ ان دیواروں سے ناتا ہے سونبھارہی ہوں۔ میرا غم اور خوشی..... ہاں! شاید کوئی

خوشی بھی ہو جے تم لوگوں نے ان دیواروں ہی کی طرح دیکھا پھر مجھ سے کیوں توقعات

باندھتے ہو؟ تم لوگوں کے ساتھ مل کر جینا چاہتا تو اکیلا کر دیا سب نے اور جب..... اکیلے

رہنے کی عادت ڈال لی تو میری لاتعلقی کھلتی ہے۔ کیوں؟ کیوں چاہتے ہو کہ تم لوگوں کی

خوشی میں خوش ہوں؟ تمہارے غم پر روپڑوں۔ پریشانیوں میں تسلی دوں یا جاگتی رہوں۔

کیوں؟ کیوں کروں میں ایسا؟ کیوں کروں؟“

میں دم سادھے سن رہا تھا۔ وہ رو رہی تھیں مگر آواز پر پورا قابو تھا۔ آسو اختیار

سے باہر تھے مگر لجھ دسترس میں رہا۔ وہی تند و تیز لجھ، وہی تیخی، وہ کڑواہٹ، وہی کسیلے

جیلے اور زہر میں بجھے سوال۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کب آنکھوں کے کنارے بھیگے اور کب

حلق میں نمک گھل گیا۔

”عصمت آپا!“ میں بولا تو آواز اجنبی گئی۔ لجہ ٹوٹا چھوٹا تھا۔

”جاوہ ضیاء! اماں بہت خوش ہیں۔ ان کا میٹا آیا ہے۔ یوہی کو ساتھ لایا ہے۔ یوہی ذش ہے کہ ساس نے قول کر لیا۔ تم خوش ہو کہ معزکہ سر ہو گیا۔ منے دادا مطمئن ہے جائیں گے۔ طیب..... طیب کو تو شاید زندگی کا طریقہ زندگی کا اور اک ہی نہیں۔ وہ میں اکیلا محسوس ہوتا ہے مگر اسے آگئی نہیں۔ سب سے دور۔ یہاں وہاں رونقیں تلاش کرنا اس کے لئے آسان ہے کہ وہ مرد ہے۔ شاید اسی بھاگ دوڑنے آگئی کا در بند کر کھا ہے۔ میری طرح دیواروں کے پیچے مقید ہوتا تو اب تک یہ دیواریں گرا چکا ہوتا۔“

”عصمت آپا پلیز؛ چھلنی ہو گیا ہوں میں۔“ میں آنسوؤں کو آنکھوں میں نہ روک سکتا۔ ہر کو شش کر کچھ تھا۔ حلق کا نمکین ذائقہ کیسا ہا ہو کہ اب کڑواہٹ میں تبدیل ہونے اتنا۔

”کیوں؟ صرف سن کر چھلنی ہو گئے۔ جو میں نے بھگتا تھا، وہ محسوس نہیں کیا تھا نہیں؟ کیا، کیا پہ چکی ہوں۔ سوچا بھی نہیں گیا تھا سے؟“ وہ ایک دم اکھڑ گئیں۔

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے پہلی بار عصمت آپا کو غور سے دیکھا تھا۔ ناکی باتیں پہلی بار سنی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں محرومیوں کے جنگل آج پہلی بار دیکھے نہ۔ میں نے کہا۔ ”عصمت آپا! خدا کے واسطے بولتی رہیے۔ بولتی رہیے۔ بولتی رہیے۔“

”در گزر کرنے اور نظر انداز کرنے میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے ضیاء! میری عادتوں

اے میری تلخیوں کو در گزر کرنے کی بجائے تم سب نے نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا مجھے۔“

س معیار میں قید کر کے۔ میرے سائے کو باہر بھکلنے کے لئے چھوڑ دیا۔ میں تو خود اپنے

پ سے بھی کبھی نہیں مل پاتی۔ جانتے ہو، کسی کو خود اس سے جدا کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔

سأگناہ بکیرہ ہے۔ کیسا خوفناک عمل ہے۔“

”عصمت آپا! مجھے اپنے جرم کا احساس ہے۔“

”وہ..... تمہاری معصومی، سید ہی سادی اماں! سادگی ہی سے غصب ڈھادیتی

اے کلم کہہ رہی تھیں۔ اے عطیہ بے اولادی کے غم سہ سہ کر مر گئی۔ وہ کھرچن یہاں

اے آگئی؟ اللہ بھی نزاںے کام کرتا ہے۔“ انہوں نے اماں کے انداز میں کہا۔

”لو! اور جو کبھی کوئی یہ کہہ دیتا تو کفر کا فتوی دینے والی اماں ہی ہوتی۔ یوں تو کچھ

بھی ہو جائے، یہ کتنے نہیں تھیں کہ اللہ کے سب کام رنالے ہوتے ہیں۔ بندہ تو اس کی حکمت کی گرد کو بھی نہیں پاسکتا۔ یہاں سارے نظریے، سارے اعتقاد خاک میں مل جائے ہیں۔ میں عطیہ کے گھر پیدا ہو جاتی جو باپ کی ناک کٹا کر چھیرے کے ساتھ بھاگ گئی تھی پھر وہ چھیرا بھی دو سال میں اسی اسے چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بے اولادی کا تو اسے بہانہ مل گیا ہو گا۔ خیر تو محلہ ملاٹا کا تھا۔ ایسی ہے باکی کے ساتھ بھرے گھر میں گزارہ کیے ہوتے لیکن..... اماں کو تعمیراً وجود کھلتاتا ہے۔ ان کے ہاں پیدا نہ ہوتی کہ چمارن کے گھر پیدا ہو جاتی۔ ان کا خیر تو کبھی کبھی بھی نہ کھلتاتا تھا!

”اے! کیوں اول فول بکتی ہے پچی؟ میری جان! میری گڑیا!“

اماں نے آکر مجھے ہی نہیں، عصمت آپا کو بھی اچھل جانے پر مجبور کر دیا۔ وہ جانے کب سے وہاں کھڑی سن رہی تھیں۔ دوڑ کے پٹ گئیں عصمت آپا سے۔ ان کے پیچے اینتا اور طیب بھی تھے۔ اماں کی آنکھوں میں جھٹری پلی بار دیکھی تھی۔ اور اینتا اور طیب کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ میں بے اختیار عورتوں کی طرح روڑیا۔ عصمت آپا پاٹ کر آنکھوں کے کونوں میں کمیں دبک گئے تھے۔

اماں چٹا چٹ ان کے چہرے پر پیار کر رہی تھیں اور عصمت آپا ان کی پشت پر اینتا اور طیب کو دیکھ رہی تھیں۔ میں عصمت آپا کی خاموشی برداشت نہیں کر سکتا تو ان سے پٹ گیا۔ اب اماں اور میں دونوں انہیں بانسون میں بھرے ہوئے تھے۔

”عصمت آپا! جایاں نا اپنے دکھ۔ اماں کو بھی بتائیں۔ ان سب کو بتائیں۔ یہ غم باشئے ہی تو آئے ہیں۔ چپ کیوں ہو گئیں؟ بولیں نا!“

پھر اچانک انہوں نے سراٹھا کر چھت کو دیکھا اور ان کی دل خراش چینیں گونجیں تو ہم سب کی آوازیں اس میں دب گئیں۔ غنوں کا ریلا تھا کہ پھر اہوا طوفان! میں لے پڑو انسان میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ بڑا اذیت ناک عمل تھا۔ اس سے زیادہ اذیت ناک عمل تو انسان کا پتھر بنتا ہوتا ہو گا مگر وہ دکھ، وہ بڑی اعصاب شکن تھی۔ اینتا اور طیب بھی پاس چلے آئے۔ طیب اور اماں نے انہیں چپ کرنے کی کوشش کی اور میں نے انہیں ایسا کرنے کو منع کر گیا۔

”روئے دو انہیں۔ روئے دیں اماں!“

انہا کچھ دور دیوار سے نکل کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔ چہرے پر اطمینان تھا۔ یہ جلتے دیکھتے لجے گھر کے اندر حرارت دوڑا گئے۔ عصمت آپا کی آنکھ سے سارے سمندر بے گئے۔ تھکن نے چینوں کا دم گھونٹ دیا۔ جسم بے جان ہو کر بستر پر گر پڑا۔ اماں کے زانوں پر سر و کھ کر سب کی موجودگی میں گھری نیند سوکیں تو میں اینتا اور طیب کو لے کر باہر چلا آیا۔ اماں کی آنکھوں کے سوتے خلک نہیں ہوئے تھے جانے کتنے لمحوں کی بے حصی یاد آئی ہو گی۔ جانے کون سے گناہ سرزد ہوئے ہوں گے۔ کون کون سے ظلم سینہ زخمی کر رہے ہوں گے۔ انہیں تو بہت زخمی ہونا تھا اور ہر زخم آنسو بن کر رستا ہے سو انہیں بھی روزنا چاہئے تھا۔ شام تک اماں وہیں رہیں۔ باہر آئیں تو شاید آدھا بوجہ ڈھونڈ آئی تھیں۔ باقی بوجہ انہیں اب سے لے کر آخری نیند تک ڈھونٹا تھا۔ ہم ہر ظلم کرتے ہوئے ان کی تعداد بھول جاتے ہیں اور جب حساب چکانا ہوتا تو اتوں کی نیندیں بھی تو اڑتی ہی ہیں کہ سود بڑھ پڑا ہوتا ہے۔

☆-----☆

رات کو منے دادا اور منی دادی آنکھیں۔ مجھے دیکھ کر منے دادا چوکے۔ اینتا کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئے۔ ان کا رد عمل وہ نہیں تھا جس کی مجھے توقع تھی۔ میں نے کچھ نہیں بتایا۔ اماں نے لمحہ ضائع کئے بغیر سب کو سنایا۔ وہ خاموش رہ گئے۔ مجھے لگا، خوش نہیں ہیں۔ اینتا حسب سابق جلدی ہی منی دادی سے بے تکلف ہو گئی مگر منے دادا نے اسے نظر انداز کر دیا۔ منی دادی نے پسلے تو نارا نصی کا اظہار کیا مگر جلد ہی اینتا نے انہیں بھی اپنا گروپہ بنا لیا۔

رات، کے کھانے کے بعد میں سیدھا منے دادا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وجہ سب سے بڑی توہہ تھی کہ انہوں نے سب کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا بلکہ اپنے کمرے میں ہی مٹکوایا تھا۔ دوسرے میں آکا بائیا کی بات کی تقدیم چاہتا تھا کہ اس نے کما تھا اپنے جد کو روکو۔ وہ بے وقوفیاں کر رہا ہے۔ میں اینتا سے ان کا رویہ بھی نوٹ کر دکھا تھا۔ صبح سے ماحول میں تباہ اور خوٹگواری کی جو کھینچتا تھا چل رہی تھی، وہ بڑی اعصاب شکن تھی۔ اب میں اطمینان چاہتا تھا اور مجھے توقع بھی تھی مگر منے دادا کی وجہ سے تقریباً بھی اپ سیٹ ہو گئے تھے۔ اماں نے محروس کر لیا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ اینتا بڑی کھوجتی ہوئی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔ عصمت آپا انھیں گئی تھیں مگر خاموش تھیں البتہ ان

کے چہرے کے خدوخال میں کرنٹی نہیں، نری تھی۔ یہ خوش آئند بات تھی۔  
”کیا کر بیٹھے ہو تم؟“ میرے اندر داخل ہوتے ہی منے دادا نے روکے انداز میں پوچھا۔

”منے دادا! یہ سب کچھ میں نے نہیں کیا۔“ میں ان کے قریب جا بیٹھا۔  
”کیا مطلب؟“ ان کی تیوریوں میں مل پڑے گے۔

تب میں نے سارا معاملہ کہ سنایا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ آکا بگیا کے نام پر اور اس کے ذکر پر منے دادا نہ صرف یہ کہ چونکے تھے بلکہ ان کے چہرے پر ناگوار تاثرات بھی پھیل گئے تھے۔ ساری بات سن کر انہوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے میرے بتائے ہوئے واقعات پر انہیں شک ہو۔ میں نے جھوٹ بولا ہو یا غلط سمجھا ہو لیکن میری بات مکمل ہونے تک وہ قطعی خاموش رہے۔

”آکا بگیا کے کہنے پر تم نے اتنا براقدم اٹھا لیا۔“ انہوں نے میری بات ختم ہونے پر سراٹھا کر مجھے دیکھا۔

”میری حالت اس شخص کی ہی ہے منے دادا! جو اندر ہرے میں ہاتھ پاؤں چلاتا ہے۔ عصمت آپا والے واقعے کے بعد میں بہت خوفزدہ ہوں۔ میں اینی، آپ کو یا اماں دیغروں کو قطعی نہیں کھونا چاہتا۔ میں ان کمزیوں کا وجود مٹا دیتا چاہتا ہوں جواب آپ میں سے کسی کی طرف بھی بڑھنا چاہیں۔“

”تمہارے خیال میں اس شادی سے سب کچھ ختم ہو جائے گا؟ تم نے شادی انتبا سے کی ہے، زیواس سے نہیں۔“  
”جی!“

”آکا بگیا کی باتوں سے تو یہ تاثر ملتا ہے جیسے اس نے تمہیں زیواس سے شادی پر مجبور کیا ہے۔ اینتا کا آخر ان واقعات سے کیا کنڑوں ہے جو اس سے شادی تمہیں عذابوں سے بچاؤ کا طریقہ لگ رہی ہے۔ ضیاء! مجھے ذر ہے کہ تم آکا بگیا کے ہاتھ میں کھلو ہیں گے ہو۔ تم تو بہت سمجھدار آدمی ہو۔ مجھے تم سے کسی بھی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ وہ اس شادی پر مصروف کیوں تھا۔ شادی کے بعد خوش کیوں ہوا اور اگر یہ سب کچھ اس نے کسی بھی اعتبار سے تمہارے لئے بہتر کیا تھا تو وہ تم سے اپنی آزادی کا طلاقگار کیوں ہوا؟ اگر وہ کسی کی قید میں تھا تو کیا وہ تم تھے یا تم ذمے دار تھے؟ قید سے

آزادی تو وہی دلا سکتا ہے نا جس نے اسے قید کیا ہو تم نے تو بقول تمہارے، اس شکل کے بوڑھے کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ صدیوں سے آزادی کا خواہش مند تھا۔ کیا تم جانتے ہو کہ وہ کس کی قید میں تھا؟“

میں حیرت سے منے دادا کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کے منہ سے نکلا ہر حرف سچا تھا۔ بہت وزن تھا ان کی بات میں۔ میں نے یہ سب پوری طرح سوچا ہی کہ تھا۔ کبھی کبھی جو سوال میرے دماغ میں آتے اور جاتے رہے، وہ یہی سب سوال تھے مگر میں نے ان پر توجہ نہ دی تھی۔ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنے کی تگ دو کرتا تو شاید سب کچھ پالیتا۔ ”سب سے اہم بات!“ منے دادا نے ہنکار کر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس نے تم سے کہا کہ اسے..... اور سب کو آزاد کرو۔ کون سب؟“ تم نے جاننے کی کوشش کی تھی؟ اس نے رابرٹ، پپاس، سورن سکھ اور جینو پیا کا ذکر کیا تو کیا تمہیں خیال نہیں آیا کہ وہ انہیں کیسے جانتا ہے؟ اور کیا وہ جن ”سب“ کی آزادی کا متنی ہے، وہ تمہیں اور پہنچ دوسرے لوگوں کو آزاد بھی کر دے۔ زنجیریں اسے دے کر تم نے یقیناً اس کے دل میں اپنے لئے زم گوشہ پیدا کر لیا ہو گا مرضیاء! سوچو تو کہ اگر کوئی موت کو پہنچ کرنے لگے، تباہیوں پر ترس کھلانے لگے تو کیا ہو گا؟ عذابوں سے پیار کا جواب کیسے ملتے گا؟ موت، زندگی کا دوسرا عکس ہے۔ یہ دونوں ایک ہی رخ پر اکٹھے تھے کیسے ہو سکتے ہیں؟ خدا خیر کرے ضیاء! تم اگر مجھے کسی قابل سمجھ کر یہ انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے کوئی مشورہ کرتے تو میں قطعی اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ تم نے زنجیریں زیواس کے حوالے کی تھیں تو اس وعدے پر کرتے کہ وہ تم سے بلکہ یہاں سے دور چل جائے۔ و تسلی آج بھی روئی ہے۔ تم اس کی حالت دیکھو گے تو لرز اٹھو گے۔ وہ بھی زیواس کی شکار تھی۔ شالی بیاواٹاٹھ فیض میں لگے تھے۔ انہیں امید تھی کہ جلد ہی کوئی لا جھ عمل سامنے آجائے گا۔ تم نے..... ضیاء! تم نے جلد بازی سے کام لیا۔ کل مجھے شالی بیاوا سے ملنا تھا۔ مگر..... اب میں خود میں ہمت نہیں پا تک کیا منہ لے کر جاؤں گا؟ وہ میری خاطر، ہم سب کی خاطر بن پاس لئے بیٹھے ہیں۔ دن رات چلے کاٹ رہے ہیں۔ انہوں نے ہماری وجہ سے ہی جینو کو قید کر رکھا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ ہمارے لئے مزید عذاب نہ بن سکے۔ اسے بھوکا لگ چکا ہوا، اسے مینے بھر تک بھوکا رکھنا کتنے حوصلے کی بات ہے کہ جانے کب اس کا داؤ

بُونی میری نگاہ آنے والے پر پڑی، میرا منہ کھل گیا مگر آواز حلق میں ہی کمیں اٹک کر رہے تھے۔

ہاں.....! میری آواز حلق میں اٹکی رہ گئی تھی۔ اس لئے کہ شاید میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں جیرت سے جیچ پڑوں یا خوشی سے نعرہ لگاؤں۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میرے سامنے جینوں کھڑا تھا۔ ہاں وہ جینو پیاریکو، وہ اٹھیں لڑکا ہے میں نے جانوروں کی طرح چاروں ہاتھ پر چیزوں پر حلتے دیکھا تھا۔ وہ جس کے منہ کو خون لگ گیا تھا۔ وہ جو فون پر درود کر سمجھ سے مدد مانگتا تھا۔ وہ جس نے بتایا تھا کہ اس کا جسم سکر کر رابرٹ کے جسم کی طرح کا ہوتا جا رہا ہے۔ میں آج اسے یوں بھرپور جوان کے روپ میں کھڑا پہلی بار دیکھ رہا تھا مگر مجھے سو فیصد یقین تھا کہ یہ جینو ہی ہے۔ وہ میرے سامنے ساکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر تشویش اور گھبراہست بھی تھی۔ شاید وہ نئے دادا کے گر جانے پر پریشان تھا۔ نئے دادا کی طرف تو میں بھی پکا تھا مگر جینو کو پچانتے ہی میں دادا سے بے خبر ہو گیا تھا۔

”تم..... تم..... جینو ہوتا! جینو پیاریکو؟“

”جی.....! جی! میں ہوں۔“

وہ انگریزی میں بولا تھا۔

”مگر تم تو.....“ میں نے دادا نے اب خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ وہ جھک کر دادا سے پوچھنے لگا۔ اب طیب انہیں سارا کہا اٹھا رہا تھا۔

”تم نے..... شال..... شال..... شال کہاں ہیں؟“ دادا بھی گھبرائے ہوئے تھے۔

”وہ تو یہاں نہیں ہیں۔ نیپال جا چکے ہیں۔ مسٹر ضیاء.....! میں تمہارا یہ احسان بھی نہیں بھولوں گا۔“ جینو نے میرے دو ہاتھ قائم لئے۔ اچانک اس کی نگاہ انتبا پڑی۔ وہ بڑی زور سے اچھلا اور پھر ہمارے دیکھتے اس نے انتبا کے سامنے سر جھکا دیا۔

”عظیم دیوی! بے شک یہ ضیاء کا کارنامہ ہے۔ یہ اسی کا حوصلہ ہے۔ مجھے معاف رہو۔ میں تمہارا اور ضیاء صاحب کا زندگی بھر منگور رہوں گا۔“

میں نے جیرت سے یہ منظر دیکھا تھا۔ انتبا کے چہرے پر بڑی زم مسکراہست تھی۔ وہ

”جینو کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سر پر شفتت کا ہاتھ پھیرنا چاہتی ہو۔“

”تم بے قصور ہو جینو! میں مجبور تھی ورن.....!“ انتبا نے اتنا ہی کہا تھا کہ طیب

چل جائے اور وہ سب کو چیز پھاڑ کر رکھ دے۔ اس کا سب سے پہلا شکار خود شالی ببا ہو سکتے ہیں۔“

منے داد کی باتیں میرے حوصلے پت کر رہی تھیں۔ اس وقت میرے دماغ میں آکا گیا کی آواز یوں گونج اٹھی جیسے وہ میرے قریب ہی بیٹھا سرگوشی کر رہا ہو۔ ”اپنے جد کو روکو۔ وہ بے وقوفیاں کر رہا ہے۔“

”منے دادا!“ میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں آواز دی تو انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا یوں جیسے میرے لجے میں ہزاروں پچتو سرسر اڑ رہے ہوں جنوں نے منے دادا کو ڈونک مار دیا ہو۔

”ہوں! ضیاء! کیا بات ہے؟“

”شالی بابا کیا کر رہے ہیں؟ جینو کہاں ہے اور آپ.....?“

”اب ساری باتیں فضول ہیں ضیاء! دعا کرو، وہ خیریت سے ہوں۔“ منے دادا نے پریشان ہو کر جواب دیا اور سکرے سے باہر چلے گئے۔

میری قطعی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کیا چاہے رہے ہیں؟

☆-----☆

اسی رات ہم سب آنگن میں بیٹھے تھے۔ منے دادا بھی ابھی عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تھے۔ جب سے میری ان سے بات ہوئی تھی، اس وقت سے وہ سخت مفطر ب تھے۔ میں نے جب بھی ان سے وضاحت طلب کرنا چاہی، وہ کترا کر نکل گئے مگر ان کے اضطراب کا اضافہ ان کے اندر زلزلہ سایپا کے ہوئے تھا۔ بلکہ مجھے لگ رہا تھا کہ بس وہ اب پہنچے کہ تب، بہرحال ہم سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ منے دادا دروازے کے قریب سے گزر رہے تھے لگ اچانک نٹھک اٹھے۔

”کیا وقت ہوا ہے؟“ انہوں نے دروازہ کھولنے سے پسلے تیزی سے پلٹ کر سمجھے پوچھا۔

”تو بجئے والے ہیں۔“ میری بجائے طیب نے جواب دیا۔

میں منے دادا کو دیکھ رہا تھا۔ یوں لگا تھا جیسے وہ کسی کے منتظر ہوں۔

منے دادا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا مگر پھر میں نے ان کے چہرے کا رنگ سفید ہوتے دیکھا۔ وہ دروازے کے قریب ڈھتے چلے گئے۔ ہم سب چیخ کر آگے بڑھ۔

نے اسے چونکا دیا۔

”بھابی.....! آپ..... آپ اسے جانتی ہیں؟“

وہ بڑی طرح اچھل پڑی۔ ”نہیں.....! کون ہو تم؟“ اور پھر جینو نے حیرت سے اسے دیکھا۔ مجھے لگا جیسے لمحہ بھر کو جینو ساکت ہو گیا ہو۔ اس کی آنکھیں انتباہ کی آنکھوں میں گزی تھیں پھر جینو کی روبوٹ کی طرح مڑ گیا۔ پہنچنے تک قدم اٹھا آتا ہوا وہ بڑی سرک کی طرف جانے لگا۔ میں پسلے اسے دیکھتا رہا پھر اچھل کراس کے پیچے بھاگ۔

”جینو.....! جینو.....! میری بات سنو جینو.....! یہ کیا ہے.....؟ کیا ہے یہ سب؟“

وہ بالکل ایسے چونکا جیسے گھری نیند سے جگایا گیا ہو۔ ”اوہ، مسٹر ضیاء.....! تم حیرت انگیز انسان ہو۔ بت حیرت انگیز!“

”تم کیسے ٹھیک ہو گئے؟ شالی بیبا کماں ہیں؟“

”شالی بیبا کو بھول جاؤ ضیاء! وہ شخص دل میں لاچ لئے تھا۔ وہ زیوسا کی طاقت کو قابو کرنے کے عمل کر رہا تھا۔ شیطان ویسیں مholm کرتا ہے جمال وہ کمزوری پاتا ہے۔ انہوں نے مجھے اسی لئے قید کر رکھا تھا۔ صرف اس لئے کہ زیوسا میرے ذریعے ان تک پہنچ سکے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ زیوسا تمہارے پاس ہے۔ ضیاء مجھے لیکن ہے کہ اب وہ رابرٹ کے پاس گئے ہوں گے۔“

میں حیرت سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ شالی بیبا میرے حساب سے میرے معاملے میں ناکام ضرور رہے تھے مگر وہ جو تھے اس کے بالکل بر عکس ہوں گے اس کا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا۔ جینو کو میں جس حالت میں ان کے پاس دیکھ چکا تھا، یہ راز فاش ہونے کے بعد کہ جینو کو انہوں نے قید کر رکھا ہے، جو حالت ان کی ہوئی تھی، وہ یاد آیا تو مجھے جینو سچ بول رہا ہے۔ سچ ہے، شیطان اسی آہنگ سے حملہ کرتا ہے۔ ایسے ہی غیر محسوس انداز میں آدمی کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے کہ نہ وہ کچھ سوچ پاتا ہے اور نہ ہو اسے سنجھنے کا موقع ملتا ہے۔ شالی بیبا بھی انسان تھے۔ وہ بھی اس شیطان کی گرفت میں آئکتے تھے۔

”ضیاء ایسا نہ ہو کہ وہ رابرٹ کو بھی اپنے لئنے میں چاہیں لے۔ جلدی کرو ضیاء! اسے تم ہی بچا سکتے ہو۔“

”میں..... میں کیا کر سکتا ہوں جینو.....؟“ میں بوکھلا گیا۔

”تم سب کچھ کر سکتے ہو ضیاء! تمیں اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ جاؤ! جلدی کرو۔ دیکھو، یہ ایک نیا عذاب ہو گا۔ جو کچھ ہم نے کیا، اسے بھگت پچھے ہیں۔ ایسا ہو کہ جو کچھ ہم نے نہیں کیا، اس کی پارادیش میں ہماری عمر ہی گزر جائے۔ وہ صرف رابرٹ کو ہی نہیں سب کو اپنی دسترس میں رکھنا چاہتے ہیں۔“

میں ابھی شش دفعہ میں ہی تھا کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ جینو نے بھی میری پشت پر کسی کو دیکھا تھا۔ میں پلٹا۔ میرے سامنے نہ دادا کھڑے تھے۔

”ضیاء! یہ جھوٹ بولتا ہے۔ اس نے ضرور شالی بیبا کو کوئی نصان پہنچایا ہو گا۔“ لیکن نہ دادا! آپ..... آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جینو ہے۔ وہ جینو جو جانوروں کی سی حالت میں رہتا تھا۔ آج یہ اپنے پیروں پر کھڑا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ جھوٹ بولنے میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”میں جو تم سے کہ رہا ہوں کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ وہ دھاڑے۔ میں نے حیرت سے ائمیں دیکھا۔ ”میں اسے جتاب کر دوں گا۔ نیست وتابود کر دوں گا۔ پسلے سے بھی زیادہ بدتر حالت کو پہنچا دوں گا۔“

وہ بالکل ایسے چیز رہے تھے جیسے آپ سے باہر ہوں۔ مجھے ان کا رو یہ اور ان کی باتیں حیران کر رہی تھیں۔ انہیں تو جینو کو ٹھیک دیکھ کر خوش ہونا چاہئے تھا۔

”ضیاء.....! یہ بڑھا شالی بیبا کا دست راست ہے۔“ جینو نے خوف زدے سے انداز میں کما اور اٹھے پیروں مجھ سے دور ہونے لگا۔

”ہوش میں رہو جینو!“ میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”یہ میرے دادا ہیں۔“ ”نہیں.....! نہیں ضیاء! تم دھوکا کھارے ہو۔ نقصان اٹھاؤ گے ضیاء! دھوکا ہے یہ سب۔“ وہ یہ کتنا ہو اپلٹ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اپنک مجھے اپنے پیچھے عجیب سی آواز محسوس ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نہیں دادا آنکھیں بند کئے کچھ پڑھ رہے تھے۔ ان کے بوڑھے چہرے کی کھال یوں لرز رہی تھی ہیسے اندر کمیں زوالہ آیا ہوا ہو۔ ”منے دادا.....!“ میں نے لپک کر انہیں تھام لیا۔ میرے تھامتے ہی ایسا لگا جیسے میں نے کسی زندہ وجود کو نہ تھاما ہو بلکہ وہ صرف ایک جسم ہو، بے جان، ٹھنڈا اور بھاری۔ میں نے انہیں اٹھایا اور گھر کی طرف مڑا۔ جینو میری

”اے طیب! دیکھ تو۔“

اور طیب بھر جھری لے کر میری طرف پلکا۔ انتہا نے بھی باہر آنے کو قدم بڑھایا تھا کہ اماں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ میں نے اور طیب نے سارا دے کرنے منے دادا کو ان کے کمرے میں بسترپ لٹا دیا۔ منے دادا زندہ تھے اس کا اندازہ میں نے ان کے سینے کے زیر دم سے نگالیا تھا۔ ان کے ہوت ساکت تھے مگر ان کا چڑہ بالکل سفید ہو چکا تھا۔ چرے کے تاثرات سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شدید اندر ورنی کرب میں مبتلا ہیں۔

اماں سے میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ منی دادی کو اندر لے جائیں۔ انہیں پتا نہ چلے۔ اماں لپک کر برآمدے میں چلی گئی تھیں تاکہ وہاں بیٹھی منی دادی کو کسی بہانہ اندر لے جائیں اور گھر میں واویلانہ مچے۔ اماں بڑی ہمت والی تھیں۔ ان کی یہ خوبی رہ رہ کر سامنے آ رہی تھی۔ عصمت اپا پتھر سے انسان بن چکی تھیں۔ ان کی آنکھیں فرم تھیں۔ وہ بڑی بے قراری سے ہمارے ساتھ کرے تک آئیں اور بار بار طیب سے پوچھ رہی تھیں۔

”کیا ہوا منے دادا کو؟ کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں عصمت آپا،“ یہ انتہا تھی۔ ”آئیے! ہم اندر چلیں۔ انہیں اکیلا چھوڑ دیں خیا.....!“ وہ پھر میری صرز۔ پلٹی۔ ”پلیز! انہیں اکیلا چھوڑ دیں۔“

میں نے حیرت سے انتہا کو دیکھا۔ ”کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ اس حالت میں انہیں اکیلا کیسے چھوڑا جاسکتا ہے؟“

”ضیاء.....!“ میں آپ سے کہہ رہی ہوں نا!“ انتہا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ لمحے کا ہزار داں حصہ تھا کہ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے متصادم ہوئی تھیں اور میرے بدن میں چیوٹیاں کی رینگ گئی تھیں۔

پھر مجھے نہیں پک۔ میں کرے سے باہر نکل آیا تھا۔ میں نے سنا، وہ طیب کو جسی پٹے جانے کہ کہہ رہی تھی پھر شاید ہم سب ہی اس کے ساتھ اس کمرے میں آگئے جہاں اماں منی دادی کو لئے بیٹھی تھیں۔ منی دادی اماں کے لئے پان لگا رہی تھیں اور پوچھ رہی تھیں۔

”ہوا کیا؟ یہ لڑکا کون تھا؟“

”پا نہیں اماں.....! میں نے تو پہلی دفعہ دیکھا ہے۔“ اماں نے منہ بنا کر کہا۔

اسی وقت ہم لوگ اندر داخل ہوئے۔ اماں نے سراخا کر ہمیں دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھا کہ کیا ہوا۔ میں انہیں کوئی جواب نہیں دے سکا لیکن میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پلٹ کرنے والے کے پاس چلا جاؤں پھر بھی کوئی ان دیکھی طاقت تھی جو مجھے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔

”اماں! سب نیک ہے۔ آپ لوگ یہاں بیٹھیں۔ منے دادا خود یہاں آئیں گے۔“ یہ انتہا تھی۔

بیجی بات ہے کہ اس کا یہ جملہ جیسے آسمان سے برستا ہوا محسوس ہوا تھا۔ چاروں طرف سے الٹ کر آتا ہوا حالانکہ وہ میرے بالکل برابر میں کھڑی تھی مگر آواز جیسے باز گشت بن کر چاروں جانب کی دیواروں سے ٹکر کر سنائی دی تھی۔ ہم سب کے سب ساکت رہ گئے۔ اس آواز کے سوا کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دی اور انتہا کے چپ ہوتے ہی جیسے گمرا سنانا چھا گیا۔ یہ احساس مجھے بست دیر میں ہوا کہ انتہا کمرے سے جا پہنچی تھی اور وہاں کمرے میں موجود ہر شخص پتھر کا نہ بننے کے باوجود بے جان ہو کر رہ گیا ہے۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ یہ سوال میرے اندر گونجا تھا مگر جواب میں گمرا سنانا محسوس ہوا پھر پتا نہیں کتنا دقت گزرا۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا۔ احساس اس وقت ہوا جب انتہا کے ہنپتے اور بولنے کی آواز کمرے میں داخل ہوئی۔ ہم سب ہی جیسے نیک ہو گئے۔ میں ایک دم دروازے کی طرف پلکا۔

سامنے دادا اور انتہا کھڑے تھے جو ادھر ہی آرہے تھے۔ ”آپ کیسے ہیں منے دادا؟“ منے دادا نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ایسے دیکھا جیسے مجھے اور دوسرے لوگوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

”منے دادا! بالکل نیک ہیں ضیاء لیکن اب تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑے گی۔ منے دادا کو وہ کمرا دے دیں جو ناصر پچا کے پاس تھا۔ منے دادا کمرا ہم لے لیں گے۔“

”مگر کیوں؟“ یہ بست پرانا سیٹ اپ ہے اور پھر منے دادا کو کسی اور کمرے میں چینی کب آتا ہے۔ سردیوں میں انکھیں سے کما کر ان کے روشن ان کا گیشہ نوٹا ہے۔ اسے سرد ہوا آتی ہے۔ آپ دوسرے کمرے میں شفت ہو جائیں مگر وہ نہیں مانے تھے۔ اب

تھے اس وقت چپ چاپ بستر پر لیٹ پکے تھے۔

منے دادا کے کمرے میں خود شفت ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر انہی نے شام کی طبیب اور عصمت کے ساتھ مل کر میرے کمرے کا سامان وہاں شفت کر دیا اور میں غاموش بیٹھا دیکھتا رہا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے انہی نے سارے گھر پر خداو کر دیا ہے۔ وہ سب کچھ اپنی مرضی سے کر رہی تھی۔ عصمت آپا جیسی پتھر بھی ان کے سامنے بھکی بھی نہیں ہوتی۔ طبیب کی ساری شو خیاں دھری رہ گئی تھیں۔ شستیک کے مرطے کے بعد سب کچھ میںے نارمل ہو گیا۔ سب کی جیسے کیا پلٹ گئی ہو۔ سب سے پہلے اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب عصمت آپا طبیب پر چھین۔

”اب کوئی یہاں سے نہیں جائے گا اس لئے اب تم چپ چاپ سامان اٹھا کر چلتے ہو، سمجھے تم؟“

”عصمت آپا یہ تو مجھے پتا ہے کہ ضیاء نہیں جائے گا مگر میں تو کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں۔ اکیلے سفر کرنے کی عادت نہیں رہی ہے تاں۔“

”تو..... اب کیا ارادہ ہے؟“ عصمت آپا نے بھنا کر پوچھا۔

”منی دادا کو لے کر میرٹھ جاؤں گا۔“ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”میرٹھ وہاں تمہارا کون ہے؟“ عصمت آپا چونکہ انھیں۔

”لبی جان ہیں تاں وہاں..... اور فرحت۔“ اس نے یوں آسمان پر تکا جیسے وہاں ل کا روشن مستقبل بجگہ کارہا ہو یا کوئی خواب اڑ رہا ہو۔

”اے ہے.....! ہوش میں تو ہو؟“ عصمت آپا نے اس کے سامنے ہاتھ نچالا۔ لبی جان سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ ہماری تانی ہیں، تمہاری نہیں اور دوسروی بات لے فرحت بڑی بھولی بھالی لڑکی ہے۔ میں تم جیسے آوارہ مزاجوں کے منہ سے اس کا نام بھی نہ پسند نہیں کرتی۔“

”اے.....! آپ کو تو کچھ پتا ہی نہیں۔“ وہ بڑا لٹک کر بولا۔ ”ہم جیسے لوگ یلوں میں شزادے کا روپ دھار کر آیا کرتے ہیں۔“

”کن پچاروں کے خوابوں میں آیا کرتے ہیں۔ یہ نہیں بتایا تم نے! خیر یہ میں جانتی لے۔ ٹلوے کی ماں دو مرتبہ پوچھ چکی ہے تمہارا۔ میں بھی حیران ہوں کہ وہ کیوں پوچھ رہی ہے۔“

”کیسے مانیں گے؟“  
”آئے گا جیں۔ اب انہیں اسی کمرے میں چین آئے گا۔ ضیاء! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں تا؟“

اس کا آخری جملہ سن کر پھر وہی ہوا۔ بدن میں جیونیاں سی رینگیں۔ گمراہنا چھا کیا اور ہم سب نے ایک ساتھ اس کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ منے دادا کسی روبوٹ کی طرح چپ چاپ پیٹھے رہے۔ انہیاں باہر چلی گئی۔ ہم سب دہن پیٹھے تھے۔ چند ہی لمحوں میں وہ لوٹ آئی۔ اس کے لوٹے ہی جیسے ہم میں جان پڑ گئی مگر میرے ذہن میں اب بھی گمراہنا سامس سامیں کر رہا تھا۔

”آئیے منے دادا!“ انہی نے کہا اور منے دادا کھڑے ہو کئے۔

میں ان کے پیچھے گیا۔ طبیب میرے ساتھ تھا۔ اور جب ہم دونوں ان کے ساتھ ہی ناصر چاچا والے کمرے میں داخل ہوئے تو میرے پوودہ طبق روشن ہو گئے۔ ناصر چاچا کے جانے کے بعد سے یہ کرا بند پڑا تھا۔ دھول اٹی ہوئی تھی۔ ان کا سامان بھی ویسے ہی بند پڑا تھا۔ کیوں کہ بھتی جا کر انہوں نے وہیں سے انکار کر دیا تھا حالانکہ منی دادی نے کہا بھی تھا کہ اپنا سامان لے جاؤ مگر انہوں نے انکار کر دیا تھا کہ اس پرانے کاٹھ کباڑ کا کیا کروں گا۔ اس وقت وہ سارا کاٹھ کباڑ بہرہ برآمدے میں ترتیب سے رکھا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ بالکل صاف سترھا تھا اور ناصر چاچا والے کمرے میں منے دادا کا سامان تھا۔

”یہ..... یہ کیسے ہوا؟“ میں نے انہیاں سے پوچھا۔

وہ مسکرائی۔ ”میں نے محلے کے بچوں کو بلا کر سب کروا لیا۔“

”مگر محلے کے بچے تو بہت منہوں ہیں۔ مجھے پان تک نہیں لا کر دیتے۔“ اماں پا نہیں، کب ہمارے پیچھے چل آئیں تھیں۔

”اماں! پیار سے کچھ کو تو بچے سب کر دیتے ہیں۔ آپ کو پان ملگوانا ہوتے مجھے کئے گے۔ انہی بچوں سے ملگوانوں گا۔ دیکھنے گا کیسے بھاگ کر لے کے دیتے ہیں۔“

”میں حیران تھا مگر بس..... صرف حیران تھا، میرے ذہن میں ویسا ہی سننا تھا۔ نہ کوئی سوال اُبھرا تھا نہ حیرت نے مجھے بے چین کیا تھا۔ طبیب چپ تھا، بالکل چپ، جو میرے حساب سے خلاف نظر تھا۔ اس کی نیچر ہی کچھ ایسی تھی۔ مگر اس وقت کوئی بھی بات معمول کے مطابق نہیں لگ رہی تھی۔ منے دادا جو جگہ بدلنے پر جزو ہوا کرتے

”آپ کی توجہ، آپ کا اعتماد حاصل ہو تو میں سب کچھ کر سکتی ہوں ضیاء!“ اس نے بڑی دار فکر سے کہا۔

”فضول باقی نہ کرو۔“ میں جھلا کر بولا۔ ”یہ سب تمہارے بس کا نہیں۔“ تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔“ میں نے بستر سے اترتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ میرے جملے کا کیا در عمل تھا۔ میں کمرے سے باہر آگئی۔ اینتا میرے پیچھے تھی۔ میں طیب سے کچھ باقی کرنا چاہتا تھا۔

”طیب، اماں کے پاس کمرے میں تھا۔ میں اس کی آواز سن رہا تھا۔ میں نے اینتا سے چائے کے لئے کہا۔ وہ پنج میں چلی گئی جہاں غالباً عصمت آپا بھی تھیں کیوں کہ برتن پختن کی آواز آرہی تھی۔“

”بھی ضیاء! تم سبھالو اے۔ بھلا میں اکیلی میرٹھ کیسے جاسکتی ہوں۔ منے ابا کی طبیعت نہیں نہیں لگتی۔ منی ماں جان کھالیں گی میری اور پھر اگر جانتا ہے تو منی اماں جائیں اور منے ابا! میری کیا تک ہوئی؟“

”ہوا کیا ہے؟“ میں سمجھ کر بھی انجان بن گیا۔ میں طیب کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر تھا۔ اس کا چوہ و جذبات سے تمثیلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ستارے بھرے تھے۔

”ضیاء! میں اماں سے کہہ رہا ہوں کہ وہ بڑی ہیں۔ میرٹھ چلیں اور بی جان سے میرے لئے بات کریں۔ آخر کیا کمی ہے مجھ میں؟“

”کی تو صرف ایک ہی ہے کہ تم انسان نہیں ہو اور ہمارے ہاں جانوروں سے شادی نہیں کی جاتی۔“ عصمت آپا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا.....! یہ ریت کب سے ہے؟“ پہلے تو سب چلتا تھا۔ ”طیب نے جل کر جواب دیا۔

”جب سے زہرہ آپا کو تمہارے چھا سے بیالا ہے، آنکھیں کھل گئی ہیں ہماری۔ توبہ کر لی ہے ہم نے۔“ عصمت آپا کب کچھ چکنے والا تھیں۔

”اچھا، اب چپ رہیں۔“ طیب نے بھنا کر کہا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ عصمت آپا اپنے پیٹھتی ہوئی باہر چلی گئیں۔

”ضیاء! اماں کو سمجھاؤ یا!“ ”ویسے اماں نہیں کہہ رہی ہیں یا تو تم اپنی اماں اور ابا کو بلاؤ یا پھر منی دادی اور

”ارے! وہ تو..... وہ تو اس لئے پوچھ رہی تھی کہ میں نے کہہ دیا تھا، بھیں گھملا لوں گا ٹلوے کو۔“

”لیکن ساری تیاری تو اس کی ماں نے کپڑی ہوئی ہے۔ ٹلوا تو قلی لگ گیا ہے۔ اب وہ کہیں نہیں جائے گا۔“ عصمت آپا نے چاولوں کی سینی لا کر اماں کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”ارے! تم اتنا بولتی کیوں ہو؟“ طیب اب جل گیا تھا۔ اینتا بھی رہی تھی۔ منی دادی،“ منے دادا کے پاس تھیں۔ اماں عصمت آپا کو گھور رہی تھیں۔

”ہو کا ہے اسے بولنے کا تم خیال نہ کرتا۔“ اماں اب تک عصمت آپا کو غصے سے گھور رہی تھیں۔ باخمیں پھیلا کر طیب سے کہا۔

”پتا نہیں، یہ جھک جھک کب تک چلی۔ میں تھکن محسوس کر رہا تھا اس لئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ یہ تھکن بھی عجیب سی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی،“ جیسے اندر برف جمی ہو۔ یاد رکھنے گا کہ اب میرا کراوی تھا جو اب سے پہلے منے دادا کا تھا۔ بستر پر لیتھے ہی مجھے لگا جیسے میں کسی سخت سے پلٹک پر رسیوں سے جکڑ دیا گیا ہوں۔ ذہن ایک دم سن ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں بے جان ہو کر رہ گئے۔ مجھے نہیں پتا کہ میں سویا یا یونہی جاگا رہا۔ رات دھیرے دھیرے آنکن میں اتری تو میرے حواس کام کر رہے تھے۔ باہر چل پہل کی آوازیں آرہی تھیں پھر اینتا میرے پاس آگئی۔ اس کے کمرے میں آتے ہی وہ ٹھنڈا ٹھنڈا سا احساس ختم ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو چاق و چورند محسوس کیا۔

”اب نہیں ہیں نا آپ؟“ اینتا نے بڑے پیارے پوچھا۔

”ہاں اینتا! میں رابرٹ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ میں اسی کے لئے پریشان ہوں۔“

”ضیاء! میں آپ کو اکیلا وہاں جانے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ جینو جو کچھ کہہ رہا تھا وہ درست تھا۔ شالی بابا پر شیطان حاوی ہے۔“

”مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ایسا ہو گیا ہے ضیاء.....! سب کچھ بدل گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اب کسی معاملے میں نہ پڑیں۔ میں..... میں سب کروں گی۔“

”تم..... تم کیا کر سکتی ہو؟“ میں نے جیرت سے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے کا اطمینان مجھے حیران کر گیا۔ اس کے ہونوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

منے دادا جائیں۔ اماں کی کوئی سُک نہیں ہے۔ ”

میں نے دھیرے سے کماورہ بھی تو چاہ رہا تھا کہ اسے ڈانٹ کر چپ کرادوں مگر اب میں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ فرحت کے ہام پر جو ہوک سی دل میں اٹھی تھی اب اس کا سراہل کی گھرائی میں کائنے کی طرح چجھ رہا تھا مگر اب یہ درد سنا ہی تھا لیکن بھی چاہا کہ میرٹھ چلا جاؤ۔ ایک بار اس سے معافی مانگ لوں۔ اسے بتاؤں کہ میں مجبور تھو مگر..... میں مجبور کیوں تھا؟ کیا بتاؤں گا اسے؟ اور پھر جاؤں گا کیسے؟ طیب کی بات کیسے کروں گا؟“

فرحت کے ذکر نے بوجھل کر دیا جب کہ طیب اب میرے پیچھے پڑ گیا کہ تم اماں کو تیار کرو اور میں نے کہہ دیا کہ سیدھی طرح اپنی اماں کو لکھو۔ وہ خود جائیں۔ یہ کہہ دینے کا مطلب یہ بھی تھا کہ مجھے یہی امید تھی، وہ منع کر دیں گے۔ میں نے کبھی انہیں فرحت سے سیدھے منہ بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی تھیں خالہ سے بھی نہیں بتتی تھی۔ وہ ہمیشہ شاکی رہیں کہ تھیں خالہ کے بیان رہنے کی کیا سُک ہے؟ وہ تو بابا کی اور دادا کی وجہ سے بات بڑھی نہیں تھی ورنہ وہ کہیں نہ کہیں کہ مجھے زہراگل دیا کرتی تھیں۔ ان سے تو اماں کی بھی نہیں بنی تھی۔ شاید اماں بھی اسی لئے اس معاملے سے لاتعلقی کا اظمار کر رہی تھیں۔ ان پر الرام آسکتا تھا کہ بیٹے کو پھنسا کر بھائی متذہ دی۔ طیب شاید..... بلکہ یقیناً اپنی ماں کی طبیعت سے واقف تھا۔ وہ بند رہا کہ اماں نہیں تو منی دادی کو تیار کرو۔ میں نے ٹال دیا کہ ضرور کوشش کروں گا۔

بات اس وقت تک آئی گئی ہو گئی۔ رات کو کھانے پر پھر تذکرہ چھڑ گیا۔ منے دادا اور منی دادی اپنے کمرے میں ہی تھے۔ انتی نے منے دادا کو کھانا اندر ہی بھجوادیا تھا۔ دادی بھی اندر چل گئی تھیں۔ عصمت آپا اس نے جلی ہوئی تھیں کہ فرحت ان کی دوست تھی۔ وہ طیب سے ہمیشہ تالاں رہتی تھیں اس نے بھی نہیں چاہتی تھیں۔ یہ پرانا بھگڑا تھا، اس نے میں نے درمیان میں بولنا مناسب نہیں سمجھا، دوسرا وجہ انتی تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ انتی فرحت کے سلسلے میں میری غیر معمولی دلپی کو محسوس کرے۔

”اماں! کیا میں آپ کا خون نہیں ہوں؟ آپ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتیں؟“ طیب روہانسا ہو کر مہ رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ سراہل اکاری تھی۔ ”بات سنو! چھپخونیر، اماں کے اپنے بہت ہیں نگ کرنے کے لئے۔ تم جا کر اپنی

اماں کی جان کھاؤ۔ بیان سے کوئی نہیں جائے گا۔“ عصمت آپا نے سالن کا ڈونگا اس کے سامنے سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

”تم چپ نہیں رہ سکتیں؟“ اماں نے عصمت آپا کو جھڑکا۔

”اصولًا اسے چپ رہنا چاہئے۔ آپ تو مجھے ڈائٹ کے بھانے ڈھونڈتی ہیں۔ میں نے فرحت کے لئے کچھ اور سوچ رکھا تھا، خود فرحت نے بھی کچھ نہ کچھ سوچا ہو گا مگر اب..... اب ایسا بھی کال نہیں پڑا کہ آنکھوں دیکھی کمھی نگل لی جائے۔“ عصمت آپا ناراض ہو گئیں۔

مجھے لگا جیسے عصمت آپا کو سب کچھ پتا ہو۔ اس لئے کہ جب وہ یہ بات کر رہی تھیں تو ان کی نگاہیں میرے چہرے سے ہوتی ہوئی انتی کے چہرے پر جا ٹھہریں تھیں۔ میں نے اسی لمحے انتی کو چوکتے دیکھا۔ ممکن ہے، یہ اتفاق ہو۔ میرے دل کا چور ایسا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ انتی نے پھر میری طرف دیکھا تھا اور میں نے نگاہ نہ اٹھائی۔

”بات یہ نہیں ہے میاں! تمہاری اماں مگل پڑ جائیں گی۔ پتا نہیں، انہوں نے کیا سوچ رکھا ہے۔ ہم اتفاق نہیں چاہتے۔ وہ تو کوہم نے کبھی موقع نہیں دیا ورنہ منی دادی کچے کانوں کی ہیں۔ ان کی باتوں میں آجائیں تو زندگی عذاب بنا کر رکھ دیں۔ ہم گھر میں بزرگوں کی موجودگی چاہتے ہیں۔ بزرگ نہ رہیں تو برکت اٹھ جاتی ہے۔ اب یہ عقیدہ تمہاری اماں کا نہیں ہے ورنہ یہ ان کے ساتھ رہ رہے ہوتے لیکن وہ کان تو بھری تھی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ان کو تھیں یا ان کی اولاد کبھی نہ بھائی۔ مجھے گناہ گارنہ کرو۔ وہ بن باب مال کی بیچی ہے۔ میں تو نصیبوں جلی اس کے لئے کرنے کے قابل نہیں رہی کہ بیٹے منہ زور ہیں۔ اب نیا قضیہ میرے سرہ منڈھو۔“

اماں کی پوری تقریر قائم ہو گئی اور سب چپ رہے۔ میرے دل پر تو جیسے الفاظ بھالے کی طرح لگ رہے تھے۔ مجھے اماں کی پوزیشن کا بھی آج پہلی مرتبہ شدت سے احساس ہوا۔ واقعی وہ تین جوان بیٹوں کی ماں تھی۔ مری ہوئی بہن کی بے سار اپنی کو کوپاہ دینے کے قابل بھی نہ رہیں۔ وہ بی جان اور خالہ بی کے بوڑھے سارے پر کتنی تھا ہو گی۔

”اماں! میں اسے ساری دنیا سے چھپا کر رکھوں گا۔“ طیب نے جذباتی انداز میں جواب دیا۔ ”میں اماں کے پاس لے کر نہیں جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ فرحت کو پسند نہیں کرتیں حالانکہ ہمارے خاندان میں کوئی لڑکی اس کے مقابلے کی نہیں۔ میں اسے چاہتا

ہوں اماں۔ پیار کرتا ہوں اس سے۔ ”

طیب نے بڑی جرأت سے کما اور میں فرق رہ گیا۔ بس دو جملے تھے اور وہ کہہ گیا سب کے سامنے۔ میں تو اپکے میں فرحت سے ایک جملہ بھی نہ کہہ سکتا تھا پھر بھی طاقتور ہونے کا دعوے دار تھا۔ ذہین ہونے پر خزر کیا کرتا تھا۔ خود کو بڑا طرم خان سمجھتا تھا مگر یہ بودا سلطیب بمحض سے زیادہ مضبوط نکلا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”میں فیصلہ کرلوں تو دنیا کی کوئی طاقت اسے نہ بدل سکتی ہے، نہ آڑے آسکتی ہے اماں! اگر آپ میں سے کوئی بھی نہیں گیا تو..... تو میں اکیلا چلا جاؤں گا۔“

وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا۔ ماحول بوجمل ہو گیا۔ عصمت آپا سے حیرت سے بحکمت چپ کی چپ رہ گئیں۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ امیتا نے ابھی ایک حرفاں بھی نہیں کہا تھا۔ وہ اسی طرح چپ چاپ کھانا کھا رہی تھی جیسے وہاں موجودہ ہو۔

میں پار بار اسے کن انگھیوں سے دیکھتا رہا۔ سب چپ رہے۔ کھانا ختم ہو گیا۔ میں بوجمل دل لئے اپنے کمرے میں آگیا۔ اماں بھی چپ تھیں۔ عصمت آپا بھی۔ میں دادا سو رہے تھے۔ منی دادی نے بتایا کہ اب پسلے سے بہتر ہیں۔ میں ان کی طرف نہیں گیا۔ طیب کی باتوں نے مجھے خوب میں بند کر دیا تھا۔ فرحت کی تعلیٰ بی جان کی گمراہی آنکھوں میں جلتی بھیتی آس، خالہ بی کا جچ چڑا پن سب مجھے یاد آتا رہا۔ پتا نہیں طیب کھانا کھا اور امیتا کیا کر رہی تھی۔ میں اس رات آدمی رات تک سو نہیں سکا۔ پھر شاید مجھے نیند آگئی لیکن جب تک میں سویا نہیں، امیتا کمرے میں نہیں آئی۔ پتا نہیں کیا کرتی رہی۔ میرا دل ہی نہیں چھاکا کہ جاگر دیکھوں۔ صبح اٹھا تو رات والا بوجمل پن پورے گھر پر طاری تھا۔ طیب سمجھن میں چپ چاپ میختاشیم کے گھنے درخنوں پر چڑیوں کو چھپتا تھا۔ عصمت آپا کچن میں ٹھیں اور امیتا اماں کے پاس بیٹھی پالک کا ساگ کاٹ رہی تھی۔

”دن چڑھے تک سوتا کوئی اچھی بات نہیں بیٹا! بسمی کے طریقے اب چھوڑ دو۔“ اماں نے نڈھاں لجھے میں کہا۔ ”رات جلدی سونے اور صبح جلدی اٹھنے کی عادت ہے۔“ ”جب اماں.....!“ میں نے اور پکھنہ کہا۔ مجھے دیکھ کر امیتا ناشتا بنانے اٹھ گئی۔ وہ اب بھی خاموش تھی۔ میں نے دیکھا اس پر شب بیداری کا کوئی اثر نہ تھا حالانکہ وہ بھی نہیں سوئی تھی۔ ممکن ہے، آدمی رات کو آکر سوگئی ہو، وہ مجھ سے پسلے کی اٹھی ہوئی تھی مگر چھرے پر دیکھی ہی تازگی تھی۔ میں منہ ہاتھ دھو کر آیا تو ناشتا تیار ہاگر میں صرف چائے

پی کر اٹھ گیا۔

”ناشتا تو کر لیں۔“ امیتا نے دھیرے سے کہا۔

”نہیں! بس..... بھوک نہیں ہے۔“

”فیاء! ادھر آؤ۔“ عصمت آپا نے مجھے آواز دی۔ امیتا نے مجھے اس لئے ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ نگاہیں میرے دل میں اتر گئیں۔ پتا نہیں، ایسا کیا تھا ان آنکھوں میں اور ایسی کون سی بات ہو گئی تھی کہ عصمت آپا یوں مجھے بلا رہی تھیں۔ امیتا کے انداز سے لگا جیسے اسے پتا ہو۔ کوئی خاص بات.....

میں عصمت آپا کے قریب گیا تو انہوں نے اماں اور امیتا وغیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے ایک لفافہ چپکے سے میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”اسے کمرے میں جا کر پڑھنا۔ کسی کو پہنچاں چلے۔“

”کیا ہے یہ؟“ میں نے لفافے پر نگاہ ڈالی۔ وہ میرٹھ سے آیا تھا۔ یہ دیکھتے ہی میں نے اسے جب میں رکھ لیا اور سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ہے۔ عصمت آپا خط دیتے ہی مڑ کر کسی کام میں لگ گئی تھیں اور اس طرح رخ کئے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”جاو!“

اور میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ جاتے جاتے میں نے امیتا کو دیکھا۔ وہ اسی انداز میں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میرے پینے چھوٹ گئے۔ لگا جیسے جو بات عصمت آپا سب سے چھپا رہی ہیں، وہ اسے پتا ہے۔ اس کی نگاہوں میں انتباہی تھی، ترجم بھی اور ایک عجیب سی تنبیہ بھی۔ میں رکا نہیں۔ کمرے میں جا کر میں نے دروازہ بند کر لیا اور خط لے کر پڑھ گیا خط بی جان کا تھا۔ میں نے پنھا بی جان نے لکھا تھا۔

”عصمت!“

بہت سی دعائیں! امید ہے کہ تم لوگ ہماری خیریت کے لئے بھی دعا گو ہو مگر میٹا لگتا ہے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ تم لوگ ہماری خیریت کے لئے بھی دعا گو ہو مگر میٹا لگتا ہے ہماری طرف کے آسانوں پر دربند ہو گئے ہیں۔ پچھلے دونوں لی آپا بہت بیمار رہیں۔ ان پر پاگل پن کا دورہ پڑا تھا اور لگتا تھا، اب بھی بھی پچپاں نہیں پا پہیں گی مگر اب کچھ بہتر ہیں۔ ان کا اکیلا پن ہی پاگل ہونے کا سبب تھا اور کافی تھا مگر اس بار فرحت کے ایکلے پن کا درد زیادہ رہا۔ ہم بوڑھوں کی توبہ چاہیں بھی نہیں ابھر تیں۔ فرحت کے قدموں کی آواز

ہوا تھا۔ عصمت آپا حیران تھیں کہ خط اماں کو کیوں دے دیا۔ انہوں نے تو چھپا کر دیا تھا۔  
”کیا کروں میں؟“ اماں نے چھوٹا سا جملہ کہا تھا مگر اس چھوٹے سے جملے کے پیچھے  
بڑا طوفان تھا۔ پسلے میں سمجھتا تھا عصمت آپا اماں پر گئی ہیں۔ وہ بھی اپنے زمانے میں اتنی  
ہی بے حس ہوں گی کہ اب سب کچھ سہ لیتی تھیں مگر آج..... اس لمحے ایسا لگا جیسے وہ  
زہرہ آپا کی کالپی ہوں یا زہرہ آپا ان کی۔ ایک ایک کر کے انہوں نے ہر حرف پر آنسو  
بھائے۔

”تحسین اپنی قسم فرحت کے سرمندہ گئی۔“ اماں نے روتے ہوئے کہا۔ میں  
نے ایک دم ہی فیصلہ کر لیا۔

”اماں! ہم میرٹھ چلتے ہیں۔“

”کیا کرلو گے وہاں جا کے؟ میرا تو منہ دکھانے کے قبل ہی نہ چھوڑا۔ خاندان میں  
ایک یہی تو آس ہوتی ہے کہ بیٹی کی صورت میں درد چھپا لیتا ہے، ہمارا تو دامن ہی تیوں  
بیٹوں نے تار تار کر دیا۔“

اماں آج دل کے پھچوٹے پھوڑ رہی تھیں۔ بیٹی کی جس خوشی کو انہوں نے  
حالات کی وجہ سے قبول کر لیا تھا، آج وہی حالات انہیں برے لگ رہے تھے۔ وہ بھی کیا  
کرتیں؟ فرحت کا ان کے سوا اور تھا میں کون، خالہ بی تو خیر نام کو ہی تھیں۔ لی جان ناقلوں  
اتی تھیں کہ خوشی ہی برداشت نہ کر پاتیں، غم سننے کا حوصلہ کیسے کرتی ہوں گی۔ اماں رو  
رہی تھیں اور منہ ہی منہ میں کچھ بدبداؤتی بھی جا رہی تھیں۔ عصمت آپا بھی آکر قریب بیٹھ  
گئیں۔ مجھے نہیں پتا کہ اینتا کیا سمجھی، کیا سوچا مگر جب اس نے آکر کہا۔

”اماں! ہم سوریے میرٹھ چلیں گے۔“

تو میں اور اماں دونوں چوک اٹھئے۔ لمحہ بھر کو اسے دیکھ کر اماں نے یہی سوچا کہ بھو  
ہے، سوچتی ہے کوئی مسئلہ ہے یا میں یاد آ رہی ہیں۔ رواداری کو کہہ دیا۔ ملنا بھی مقصود  
ہو سکتا ہے مگر میں نے اس کے لمحے چھرے پر واضح بے چینی اور دکھ کے آثار دیکھ لئے  
تھے۔ لگ رہا تھا جیسے وہ خط کا متن جان چکی ہے یا کسیں پڑھ چکی ہے۔ بہرحال ہمارا حوصلہ  
نوناگر اینتا کے عزم نے فیصلہ مضبوط کر دیا۔ میں نے کہہ دیا تیاری کر لیں۔ جو بھی تھا  
جو بھی ہونا تھا، بہرحال ضروری تھا۔ طیب گھر و اپنی آیا تو یہ خبر سن کر اچھل پڑا۔

”اماں کیسے تیار ہو گئی؟“ اس نے مجھے نے پوچھا۔

اکیل ہی گھر بھر میں گوئی نہیں رہتی ہے۔ اس اکیل چاپ سے خوف تو مجھے بھی آتا ہے پر میں  
بھی پاگل ہو گئی تو کیا ہو گا، یہ خوف ہمت دلاتا ہے اور پیچی رہتی ہوں۔ محلے کا بد معاش اب  
زیادہ رنگین کپڑے پہننے لگا ہے۔ زیادہ پان کھانے لگا ہے اور دن کا بڑا حصہ گلی میں گزارتا  
ہے۔ اس کے قبیلے بھی اب اونچے ہوتے ہیں اور پہنچتیاں بھی، فرحت سہی رہتی ہے۔ میں چوکنی رہتی ہوں مگر بھی آپا، آپے سے باہر ہو جاتی ہیں۔ کل اس نے محلے کی سب سے

خراب عورت کے ہاتھوں خوان بھجوایا تھا۔ جس میں خنک میوں کے ساتھ پھٹا پرانا شجرہ  
بھی تھا جس میں جانے کس کس کے نام تھے پر اس کا اپنا نام کہیں بھی نہ تھا۔ لی آپا کو دورہ  
اس کے بعد ہی پڑا تھا۔ ضیا پٹیٹ کر نہیں۔ ان کی طرف سے مکر ہی گئی رہتی ہے۔ زمانہ  
یوں بھی تیز رفتار ہے۔ ہم بوڑھے ہیں، تیز چل ہی نہیں سکتے۔ ضیا تو ماشاء اللہ جوان ہیں۔  
اللہ سب بہتر کرنے والا ہے۔ اسی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ اب وہ بھی نہ سے تو کیا  
کریں؟ تمہارے اور ضیا کے لئے سو ستر بیجن رکھے ہیں، کوئی آتا جاتا ہو گا تو بھیجوں گی۔ منی  
دادی اور منے دادا کو سلام کہہ دیتا۔ بڑے بھائیوں کو خط لکھو تو میرا شکو بھی لکھ دیتا۔ نیا  
کو سب کی دعا کمنا۔ اپنی اماں کو یاد دلا سکو تو بتا دیا کہ بوڑھی مانچھی کی آس لگائے بیٹھے  
رہتی ہیں۔ اللہ پاک سب کی خیریت رکھے۔ ہم نسب دعا گو ہیں۔ تمہاری بی جان۔“

لی جان کا خط دل میں آگ لگایا۔ ان کی تھانی، شاید ان کے گھر میں اتنی نہ ہو جتنی  
مجھے دل میں محسوس ہوئی۔ انہوں نے اماں کے علاوہ مجھے بھی وعدہ یاد دلایا تھا۔ پھر جس  
خدشے کا اظہار کیا تھا اس سے میں بے چین ہو گیا۔ محلے کے بد معاشوں کی نظر فرحت پر پڑ  
چکی تھی اور اس کی حفاظت کو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں کیا کروں؟ یہ سمجھے میں نہیں آرہا تھا  
مگر وہاں جانا چاہتا تھا۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ یوں منہ چھپا کر بیٹھنے سے سائل بڑھیں گے۔ جو ہو پکا تھا،  
اسے ان کی مرضی کے مطابق ٹھیک کرنا تو اب ناممکن تھا مگر جو ہونے کا خدشہ پیدا ہو گیا تھا،  
اسے سنبھالا جاسکتا تھا۔ طیب بہرحال محلے کے اس بد معاش سے کہیں بہتر تھا۔ نسل بہ نسل  
سانحہ ہوتا ہے اور اب خاندان سانحوں کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

میں خط لے کر اماں کے پاس بیٹھ گیا۔ انہیں خط دیا۔ انہوں نے پڑھا اور بے آواز  
روتی رہیں۔ میں سامنے بیٹھا دل پر گرتے آنسوؤں کا شمار کرتا رہا۔ اینتا دوبار آئی اور چپ  
چاپ واپس چل گئی۔ نہ میں نے خیال کیا یا اہمیت دی، نہ اس نے جلتا۔ طیب کہیں پاہر گیا

نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ بس بی جان کا دکھ اور ان کی تمثیلی ہمیں احساسِ دلاتی تھی اور وہ اچھی لڑکی ہے۔ اسی بنیاد پر میں اسے نسبتاً پسند بھی کرتا تھا لیکن ایسا کچھ نہیں تھا کہ اب تم اپنے حواس ہی کھودو۔ میں ہی نہیں، پوری دنیا قسمت کے آگے مجبور ہوتی ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ طیب اسے واپسی چاہتا ہے۔ اس طرح اسے ایک اچھا شوہر اور طیب کو اچھی یوں مل جائے گی۔ میں نے اماں سے بات کی تھی۔

مجھے واپسی لگ رہا تھا کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ وہ یقیناً خط پڑھ پچھی ہو گئی اور عصمت آپا نے بھی اسے کچھ نہ کچھ بتایا ہو گا ورنہ وہ تفصیل نہیں جان سکتی تھی۔ مجھے عصمت آپا پر غصہ بھی آیا۔ جب سب کچھ بتاچکی تھیں تو خط چھپا کر دینے کی کیا ضرورت تھی۔

”آپ نے اماں سے کوئی بات نہیں کی۔ جھوٹ بول کر آپ سمجھتے ہیں کہ میں بل کتنی؟“ وہ دکھ سے بولی۔

میں جیران ہو گیکے۔ واپسی میں نے بھی اماں سے بات نہیں کی تھی۔ ابھی تو میں اپنے ہی دل کو مضبوط کر رہا تھا لیکن بہر حال یہ فیصلہ تو کر رہی چکا تھا۔ اس لئے پر عزم لجئے میں کمل۔ ”ممکن ہے،“ ابھی اماں سے بات نہ کی ہو میں نے اور مجھے ایسا اسی لئے لگا ہو کہ میں یہ فیصلہ کر چکا ہوں۔ تم پریشان مت ہو۔“

”لیکن ضیا! اگر آپ مجھے قسمت کی مجبوری سمجھ کر قبول کر رہے ہیں تو میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گی۔ محبت میں نے پہلی مرتبہ کی تھی اس لئے اسی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایسی حرکتیں بھی کر گئی جن سے آج مجھے شرمدگی محسوس ہوتی ہے اور شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میں نے آپ سے دھوکا کیا ہے۔“

”انیتا! تم کچھ عجیب سی باتیں کر رہی ہو۔ تم ٹھیک نہیں ہو،“ سو جاؤ۔ میں اماں کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے ان سے بات کرنی ہے گر تم سو جانا، کچھ سوچنا نہیں اور نہ پریشان ہونا۔ میں تمہیں قسمت کی مجبوری نہیں کہہ رہا اگر تمہیں میرے جملے سے دکھ پہنچا ہے تو میں معدورت چاہتا ہوں۔ پلیز! میں بہت پریشان ہوں۔ میرے لئے نبی پریشانی پیدا نہ کرو۔“ وہ چپ چاپ لیٹ گئی۔ میں اماں کے پاس جانے کو نکلا تو راستے میں عصمت آپا مل گئی۔

”آپ کو کیا ضرورت تھی انیتا کو سب کچھ بتانے کی؟ بلاوجہ میری پوزیشن خراب کر دی آپ نے۔“

”میں سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس لئے کہہ دہا۔“ انیتا نے ضد کی ہے۔“ وہ رکا نہیں۔ اچھل کر قلانچیں بھرتا باہر بھاگ لیا۔ پھر شاید صحن میں کمیں انیتا مل گئی۔ اس کی آوازیں میں سک آرہی تھیں۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اب لگی ہیں آپ بھاگی!“ آپ نے مجھے جیت لیا بھاگی! ساری عمر پاؤں دھو کر پیوں گا۔“

”تم ہو ہی اسی قاتل۔ لوگوں کے پاؤں دھو دھو کر پیتے رہو۔ صاف پانی تو بیمار کر ڈالے گا تمہیں۔ تم سارا تو باطن بھی ظاہر کی طرح میلا ہے۔ صفائی اثر نہیں کرنے گی۔“ عصمت آپا کی آواز آرہی تھی مگر انیتا نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ صحیح جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ ابھی دن تھا۔ اماں جانے کو بے چین تھیں مگر منی دادی اور منے دادا کا بھی مسئلہ تھا۔ منے دادا اب تک ساکت بستر پر پڑے تھے۔ بظاہر تو ٹھیک ہی لگ رہے تھے۔ اماں پریشان تھیں کہ دونوں کو چھوڑ کر کیے جائیں۔ عصمت آپا نے کہا۔ ”میں رہ جاتی ہوں۔“ انیتا چپ رہی۔

اسی رات جب انیتا نے کمل۔ ”ضیا! آپ کے ہاں تو چار شادیاں جائز ہیں نا!“ تو میں چونک اٹھا۔ ”ہاں.....! مگر کیوں؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“ دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔

”آپ..... آپ فرحت سے شادی کر لیں۔“

”کیا؟ ہوش میں تو ہو؟“

”کیوں، ایسی کیا بات ہے؟ میں جانتی ہوں ضیا! آپ آج سے نہیں بچپن سے اے پسند کرتے ہیں۔ آپ تو اس کا نصیب تھے مگر میں..... میں بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی اس لئے میں نے..... خیر.....! یہ الگ مسئلہ ہے مگر فرحت واپسی اچھی ہے۔ وہ آپ کو دل کی گمراہیوں سے چاہتی ہے۔ اسے یہ سب جان کر بہت دکھ ہو گا مگر میں اسے متاؤں گی۔ میں اسے اپنی مجبوری بتاؤں گی تو.....“

”انیتا! پلیز! بس کرو۔ اسے مزید تماشا نہ بناؤ۔“ میرا دل غم سے پھنسنے کو تھا کہ میں بول اٹھا۔

”ضیاء! میں نہیں جانتی تھی کہ آپ..... اس قدر دار فتنی رکھتے ہیں ورنہ جمال میں نے اتنی صدیاں تھا گزاری تھیں، وہاں یہ بھی.....“

”صدیاں..... کیا کہہ رہی ہو تم؟“ میں اب چونکا۔ ”دیکھو انیتا.....! میں

پر، یہ کر دیا ہم نے تو دین سے بھی منکر ہو جائیں گی کہ متنی اللہ کر دیں اور پھر تمہیں نہیں پتا، پورے خاندان سے کتنی ہوتی کیوں رہتی ہیں وہ۔ یہ نہیں معلوم تمہیں کہ اپنے فرقے سے باہر کی کوئی چیز پسند نہیں انہیں۔ طیب سے بھی یوں غائب ہیں کہ وہ ان کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔ کہہ دیں گی ہم نے اور رغلانے کو شادی کر دی۔ اپنی بے سار ابھائیں اس لئے منڈھ دی کہ جیز کماں سے دیتیں۔ تم نے نہ سنی ہوں یہ باتیں، میں کان بند کر کے نہیں رہتی دنیا میں۔“

”مگر اماں! یہ طیب کی خواہش ہے۔ وہ خود منٹ لے گا۔“ میں نے کہا۔  
”مگر پھنسیں گے ہم سب۔“

عصمت آپا جو حیرت سے میرے فیصلے کی تفصیلات سن رہی تھیں، اب ہوش میں آچکی تھیں۔

”اماں! ضیاء نھیک کہہ رہا ہے۔ کسی لفٹے کے پلے بندھنے یا اس کی بے باکی کی نذر ہونے سے تو لاکھ درجے بتر ہے طیب۔“

”ارے! آگے پیچھے، اونچ پچھی تو دیکھا کرو تم لوگ! بس منہ کھولا اور کچھ بھی کہہ دیا۔ لو.....! نہ لحاظ، نہ خیال اور طیب کون سا سکھ سے لکھتے ہیں کہ کماں کماں گے اور گھرب سائیں گے۔ اب کیا میں کہیں نگل لوں؟ اور بی جان.....! وہ کیا جانتی نہیں ان کی اماں کو!“

”یہ سب ثانوی باتیں ہیں اماں! طیب اسے چاہتا ہے۔ اپنا چاہتا ہے، یہ کافی ہے ہمارے لئے۔ وہ سول میرج بھی تو کر سکتا ہے۔“

”کیا..... کیا کر سکتا ہے؟“

”کچھ نہیں اماں! بس آپ سوچ لیں۔“ میں نے صاف کہہ دیا۔ پھر آپ نے میری جگہ سنبھال لی۔ وہ طیب کی طرف داری میں اس قدر مدل مگنتو کر رہی تھیں کہ میں یہ ایں رہ گیا۔ بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ یہ وہی عصمت آپا ہیں جو ہر وقت طیب کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔ اماں بھی بالآخر چپ ہو گئیں۔ انہیں اس ”لفٹے“ کی فکر زیادہ تھی جس کا ذکر بی جان نے کیا تھا۔

ابھی عصمت آپا، طیب کی طرف داری ہی کر رہی تھیں کہ طیب اندر آیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ دونوں کانوں کو اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اس نے آگے کو کھڑا

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”ہوش میں تو ہو.....!“ وہ ایک دم اکھڑ گئیں۔ ”میں بی جمالو کا کردار ادا نہیں کرتی۔ تمہیں خط سب سے چھپا کر دیا تھا۔ تم نے تو اماں کوی دکھا دیا۔“ وہ الشاب صح پر گرم ہو گئیں۔

”پھر ایتا کو یہ سب کچھ کس نے بتایا؟“  
”پتا نہیں ضیاء.....! مجھے ایک بات عجیب سی گئی ہے۔“ وہ مجھے لئے ہوئے برآمدے میں آگئیں۔  
”کیا بات؟“

”وہ سب کچھ خود بخود جان لیتی ہے۔ کوئی جادو گرنی ہے کیا؟“  
”فضول باتیں نہ کریں۔ صرف ذہین ہے۔ مجھے تو امید ہی نہیں تھی کہ وہ گھر والوں کو اس طرح ہاتھ میں لے لے گی۔“

”نہیں نہیں! کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔ تم یقین نہ کرو مگر میں کہہ رہی ہوں۔ کوئی گزبر ہے۔ منے دادا کو دیکھو۔ اب تک اسی حالت میں ہیں۔“

”لیکن ہیں تو نہیک۔“

”نہیک کے کہتے ہو تم؟“

”میرا مطلب ہے کہ وہ بیمار نہیں ہیں۔ بس بستر پر ہیں۔ چپ ہیں، ورنہ پوری طرح صحت مند ہیں۔“

”اور وہ جینو، جو بقول تمہارے جانور کی طرح رہتا تھا۔ شالی بیا۔..... جن کے بارے میں وہ اکشاف کر کے گیا ہے اور اس پر منے دادا کا رویہ اسے کیا کو گے تم؟“

”ہاں.....! یہ سب عجیب ضرور ہے عصمت آپا! میرے ذہن میں بھی ہے مگر میں پسلے فرحت والے معاملے کو ترجیح دوں گا۔“

”اب کیا گزر گے، وہ بوا تمہیں دوسرا شادی کی اجازت دیں گی؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ اس نے اجازت دے بھی دی ہے۔ میں نے کچھ نہ کہا اور اماں کے کمرے کی طرف پر بھل۔ عصمت آپا میرے ساتھ تھیں۔ جب میں نے اماں سے اپنی خواہش کا انہصار کیا تو وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔

”باؤ لے ہو گئے ہو تم! ان کی اماں کلاوے چڑھا چڑھا کر ادھ موئی ہو گئیں امام بارگاہ

نے بدنام کر رکھا ہے۔ میں بہت نیک اور فرمائی بردار بچہ ہوں۔“  
”اب زیادہ پھلو نہیں۔“ میں نے اس کی کمرپر دھپ لگایا۔  
”اس میں بھالی جی کا بھی برا کمال ہے۔ چلہ انہوں نے ہی تباہ تھا۔ کہاں ہیں وہ؟“  
وہ یہ کہتا ہوا باہر نکل گیا اور میں نے حیران ہو کر سوچا۔ اینیتا ہر کوار ادا کر رہی  
ہے۔ ایک طرف مجھے کہہ رہی ہے کہ دوسری شادی کروں اور دوسری طرف اسے چلہ  
سکھنچ پر لگا دیں۔ غصہ تو آیا مگر کیا کرتا! ہونا تو وہی تھا جو طے ہو چکا تھا۔ میں اماں سے صح  
تیاری کا کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔  
ainita اکیلی تھی۔ طیب شاید ادھر نہیں آیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سوتی بن گئی۔ صاف  
لگ رہا تھا کہ جاگ رہی ہے مگر میرے اندر جو طوفان اٹھ رہے تھے، مجھے انہیں مٹھندا کرنا  
تھا۔ سو میں چپ چاپ لیٹ گیا۔

☆-----☆-----☆

کر رکھا تھا۔ میرے قریب آکر اس نے اپنی انگلی کاٹی اور بلبلہ کر رہا گیا۔ عصمت آپا اور  
اماں اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں نہ انہیں پہنچا کر وہ اندر آیا ہے۔ میں البتہ اسے دیکھ  
رہا تھا اور ابھی اس کی حالت کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ اس نے اپنی انگلی کاٹ لی  
اور بلکہ اٹھ۔ اس کے بلکن پر اماں اور عصمت تو اچھی تھیں ہی، میں بھی اچھل پڑا۔  
”اے! کیا ہوا؟“ اماں چھیں۔

”دیکھ رہا تھا کہ یہ جو دھکائی دے رہا ہے، جو سنائی دے رہا ہے، وہ حقیقت ہے کہ  
خواب.....“ وہ اتنا کہہ کر عصمت آپا کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اب اس نے ان کے  
قدموں کے قریب زمین کو ہاتھ لگا کر یوں مانگ میں پھیرا جیسے ہندو عورتیں اپنے شوہر کے  
قدموں کی مٹی مانگ میں بھرتی ہیں۔ اس کی اس حرکت پر میری ہنسی چھوٹ گئی مگر عصمت  
آپا بھنا کر کھڑی ہو گئیں۔

”تم اس قابل ہو تو نہیں..... ترس کھانا چاہئے، ثواب ملتا ہے۔ اس لئے کہ  
رہی تھی۔“

اماں بھی اب اس کی حرکت کو سمجھ چکی تھیں اور اب منہ دبائے ہنس رہی تھیں۔

”آپ نے ترس نہیں کھلایا ہے عصمت آپا! نہ آپ کو ثواب ملے گا۔ میں نے چلہ  
کاٹا تھا جو پورا ہو گیا۔ ڈیڑھ دن کا چلہ تھا۔“

”تم ضرور ہوئے ہو کر شالی بیباونو گے۔“ وہ چھیں اور کمرے سے باہر جلی گئیں۔

”چھی اماں! میں آپ کا احسان زندگی بھرنیں بھولوں گا۔“ طیب ان کی ناراضگی  
سے بے پرواہ کہہ رہا تھا۔

اماں پھر اداس ہو گئیں۔ ”طیب! تم تو ہم سب کو پسند ہو مگر تم ساری اماں کا کیا  
کریں؟ وہ ناکوں پنے چبوا دیں گی اس معموم فرحت کو۔“

”ارے! فرحت کو ان کے ہتھے کون چڑھنے دے گا؟“ پھر وہ میری طرف پلانا۔

”ضیا! اب تم سب بے نکر ہو کر جاؤ، میں منے دادا اور منی دادی کی حفاظت کرلوں گا۔“  
اس نے سینہ چوڑا کرتے ہوئے کمل۔

”اے ہاں! تم سارے جانے کی کوئی تک بھی نہ ہو گی۔ اچھا! اب یہ تو ہتاو کہ اماں  
بادا کو جواب کیا دو گے؟“ اماں کو تشویش ہو رہی تھی۔

”بڑوں کو جواب دینا میری سرشت میں نہیں ہے چھی اماں! مجھے بلاوجہ عصمت آپا

اور پھر اسی وجہ سے وہ بذریعہ اپنی اہمیت کم کر دیتی ہیں۔ سب کے چہرے پر میرٹھ میں اترتے ہی سوچ کی پرچھائیاں سی لمرا رہی تھیں مگر میں نے دیکھا کہ اینتا ہم سب سے زیادہ گھبرا رہی ہے۔ شاید وہ اپنے طور پر اس ساری پچویش کی ذمے دار خود کو محسوس کر رہی تھی۔

میں نے آنکا لے لیا۔ ہم گھر کے دروازے پر پہنچے تو ساری کی اور سنائے کاراج تھا اور ان دروازوں کے باہر بھی اتنی ہی وحشت نظر آرہی تھی جتنا شاید اندر ہو گی۔ میں نے بڑی ہمت کر کے ہاتھ بڑھایا اور دروازے کا کنڈا بجادیا۔ ہلکے سے کھٹکا کیا تھا مگر پوری گلی میں آواز گونج گئی۔ بی جان کا دروازہ کھلنے سے پہلے ہی سامنے والا دروازہ کھلا اور ایک بیس بیس برس کا گھر سے سانوں لے رنگ کا لمبا چوڑا لڑکا اپنے گھر سے باہر نکل آیا۔ اس کے ہونٹ پان سے سرخ ہو رہے تھے۔ پاؤں میں تسلی چڑھا ہوا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کا سانیں کا سوت پہننا ہوا تھا۔ مجھے بی جان کا خط یاد آگیا اور کان کی لویں سلگ اٹھیں۔ وہ آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا شاید۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ ایسے شرمیا جیسے میں بردھوئے ہی کو وہاں کھڑا ہوں پھر وہ جلدی سے گھر میں چلا گیا۔ اس کے اندر جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ بی جان کا دروازہ کیوں نہیں کھلا! میں نے ایک بار پھر کھٹکا دیا۔

اس باربی جان کی آواز آئی۔ ”کون ہے ذرا چیچھے ہٹ کے روشنی میں کھڑے ہو۔ دکھائی تو دو کون ہو؟“

تب مجھے احساس ہوا کہ ایک چھوٹا موقت سا بلب دروازے کی پیشانی پر لگا ہے۔ امال وغیرہ دیوار کے سامنے میں کھڑے تھے اور میں دروازے کی چوکھت سے لگا کھڑا تھا۔ ”بی جان! میں خیا ہوں۔ دروازہ کھول لئے۔“ میرا جملہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ دروازہ کھل گیا اور بی جان ایک قدم آگے آکر مجھ سے پٹ گئی۔ بعد میں ان کی نگاہ باقی سب پر پڑی۔ وہ جو مجھ سے پٹ کر رونے لگی تھیں، سب کو دیکھ کر رونا بھول گئی۔

”ارے سیدہ.....! میری بیگی.....!“ وہ امال سے لپٹ پڑیں۔

میں نے لپٹ کر دیکھا۔ سامنے والے دروازے میں جھمری نی ہوئی تھی۔ میرا خون کھول اٹھا۔ ”لی جان اندر تو چلے۔“ میں ان لوگوں کو لے کر اندر چلا آیا۔ میری نگاہوں نے تھنگی جلنے لگی۔ صحن خالی تھا۔ گرانٹا تھا جیسے اندر کوئی بھی نہ ہو۔ ”لو،“ میں تو بالکل باذلی ہو گئی۔ خوشی بھی تو خوف کی طرح ہوتی ہے۔ بو کھلا دیتی

سویرے ہم نے منے دادا اور منی دادی کو اپنا پروگرام بتایا۔ امال نے عصمت آپا سے رکنے کو کما تھا تاکہ کھانے والے کا پر ایلمن ہو مگر منی دادی نے کہہ دیا۔ ”کیوں بچی کا دل کھٹا کرتی ہو۔ ابھی تو میرے ہاتھ پیر میں دم ہے۔“ اور حیرت کی بات یہ کہ جب امال نے انہیں طبیب اور فرحت کے بارے میں بتایا تو وہ جھٹ تیار ہو گئیں کہ فوراً چلنے جاؤ۔ وہ خود بھی طبیب کی امال سے جلتی تھیں، ان کو وہ پسند نہ تھیں۔ منے دادا نے بھی گھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر یوں سر ہلا دیا جیسے میں نے عقلمندی کا فیصلہ کیا ہو۔ ”منے دادا! آپ ٹھیک ہیں نا! اگر محسوس کرتے ہیں کہ بالکل ٹھیک ہیں تو ہم جائیں گے ورنہ ایسی جلدی نہیں ہے۔“ میں نے ان کا ہاتھ تھام کر کما۔ ”کیا تم ساری دلمن بھی جارہی ہے؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”جی دادا!“

”پھر ٹھیک ہے۔“

انہوں نے مطمئن ہو کر کما اور میں نے ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور خوشی محسوس کی جسے میں کوئی عنوان دے سکا نہ ممکن۔ عصمت آپا اور اینتا نے ساری تیاری منہوں میں کمل تھی۔ ہم سوادس بجے والی گازی سے روان ہو گئے۔

☆-----☆-----☆

ہم رات گئے میرٹھ پہنچ گئے۔ مجھے جہاں اس کی خوشی تھی کہ بی جان ہم لوں کو خط کے جواب میں اتنی جلدی سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوں گی، وہاں اس بات پر دکھ ہو رہا تھا کہ جب بات کئے بغیر اینتا کا تعارف ہو گا تو اس پر کیا گزرے گی! فرحت کا کیا حال ہو گا۔ خالہ بی پر کیا اثر ہو گا، مگر یہ وہ غم اور خوشیاں تھیں جن کا اور اک پہلے ہی ہو جاتا ہے

ہمیں دیکھتے ہی انھوں نہیں۔

”خیا! ارے! کیا بے مرمت ہے تو! اتنے دن میں آیا۔ کہہ کر گیا تھا گیارہ دن میں آؤں گا۔ اے! دونوں کا حساب مالوں میں کھینچ لے گیل جیسے غلیل کھینچتا تھا بچپن میں۔“

غالہ بی یہ کہہ کر ٹھنڈہ مار کر نہیں اور کتنی ہی درپر ہنسی چل گئیں۔ ان کی نہیں ایسی تھی جیسے صحرائیں ہوا کے جھکڑا چل گئے ہوں اور ریت آنکھوں کاںوں میں تھی جاہی ہو۔ سب ساکت رہ گئے۔

”تین دن ہو گے، یہی کیفیت ہے۔“ بی جان کی دھیمی سی آواز آئی۔  
”اے بات سن سیدہ!“

غالہ بی نے تیز سرگوشی کی اور اماں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ اماں بھی آنکھیں لئے آگے بڑھ کر ان سے پٹ گئیں۔ ”غالہ بی! ارے اتنے بے بُی میں کیوں زندہ ہو۔ لایج چھلنی کرنے کے سواتم نے کیا کیا بات تک۔“

اماں یہ کہہ کر بلکہ انھیں۔ غالہ بی پر اثر بھی نہ ہوا وہ بولیں۔ ”اے! رات کو تمہارے خالو اس دیوار پر آکے بیٹھ جاتے ہیں۔ بتاؤ تو اتنے بڑھاپے میں ایسی پھوکوری حرکتیں کرتے ہیں۔ مجھے تو شرم آتی ہے۔ پچی.....! اور فرحت سے تو میں نے لاکھ مرتبہ کہا۔ بھاگ جا گھر سے۔ یہ دیواریں تو چاٹ لیں گی۔ ہمارے زمانے میں تو اور اوپھی تھیں، بست اوپھی..... آسمان کے اندر تھیں۔ مگر اب تو بہانہ ہے تاکہ اتنی پیچی چھتیں ہیں اور اتنی پیچی دیواریں، چلو بھئی اللہ خیر سلا۔ دو دن پاتیں بیٹیں گی، تیرے دن کسی اور کی لوٹیا بھاگ جائے گی تو سب اس کی طرف کو رخ کر لیں گے۔ یہ بھی قصہ نہت جائے گا مگر یہ تو بالکل یادی ہے۔ یہیں مرحائے گی، میں تو صاف کہہ رہی ہوں، اسی صحن میں دفا دوں گی۔ کون اتنی دور قبرستان کو جائے گا۔ بھئی! یہیں روٹی پاک کے، یہیں دیا جلایا کریں گے اور روٹی کھا کے سو جائیں گے۔ اے سمجھاؤ۔ وقت گزر گیا تو دیواروں سے ہلانے والے بھی نہ رہیں گے۔ میں تو چلی جاؤں گی۔ میں نہ رکنے کی۔“

غالہ بی بولے جاہی تھیں اور اماں، بی جان، عصمت آپا، حتیٰ کہ اینتا بھی روئے جاہی تھی۔ میرا دل رو رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر انہیں بانہوں میں بھینچ لیا۔ فرحت اب بھی اینتا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ اس کا دھیان غالہ بی کی طرف بالکل نہیں تھا اور باقی سب کا دھیان اس کی طرف نہیں

ہے۔“ بی جان نے کما اور عصمت آپا کو لپٹائے ہوئے اندر آگئیں۔ اب تک انہوں نے اینتا پر دھیان نہیں دیا تھا پھر صحن میں روشنی بھی کم تھی۔

وہ ہمیں لے کر اندر داخل ہوئیں۔ چھت پر جانے والی سیڑھیوں پر فرحت بیٹھی تھی۔ گم صم سی ..... اکیل ..... کسی سائے کی طرح ..... سیاہ ہیولہ لگ رہی تھی۔

”ے فرحت! دیکھو تو کون آیا ہے۔“ بی جان کی آذاز خوبی سے کانپ رہی تھی۔ سب ہی ساکت رہ گئے۔ سب کوشید ایک ساتھ یہ خیال آیا تھا کہ بی جان کی خوبی کا سبب کیا ہے اور فرحت سے اینتا کس حیثیت سے ملے گی؟ اور ملے گی تو کیا ہو گا۔

”کون ہے بی جان!“ تارمل سی آواز آئی۔

”اے ضیا ہے۔“ بی جان کی خوبی کا سبب اب بست واضح تھا۔ انہوں نے صرف میرا ذکر کیا تھا۔

”ضیاء.....!“

فرحت کی آواز میں لرزش تھی۔ پھر قدموں کی لڑکھڑاہٹ میں میرا دل الجھ گیا گریخے اترتے ہی، ہمارے سامنے آتے ہی وہ ساکت ہو گئی۔ اس کی نگاہ ہم سب پر سے ہوتی ہوئی اینتا پر جم گئی۔

”تم.....؟“

اس لفظ میں حیرت کے ساتھ جان پکچان بھی تھی۔ اینتا فوراً میری آڑ میں ہو گئی۔

”تم..... کہاں چلی گئی تھیں؟“ فرحت نے میرے پیچھے جھانک کر اینتا سے کہا۔

”اے! یہ کون ہے؟“ اب بی جان کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔ میں فرحت کی بات سن کر اور اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر حیران تھا۔ لگتا تھا فرحت، اینتا کو جانتی ہے۔

”بی جان! اندر تو چلیں۔ غالہ بی کیسی ہیں؟“ عصمت آپا ان کا بازو پکڑ کر اندر کر کے کی طرف چل دیں۔

”اے! یہ بیک اندر اٹھا لاؤ۔ اوس میں بھیگ جائیں گے سب۔ منوں اوس گرتی ہے رات بھر اور یہ فرحت تو شاید چہرے کی نی ہے۔ ساری رات سیڑھیوں پر بیٹھی رہے تب بھی نہیں بھیگتی۔“

ہم سب اندر آگئے۔ غالہ بی وحشت زدہ آنکھیں لئے بستر پر چت پڑی تھیں۔

”بی جان! آپ تیار ہو جائیں۔ اب آپ یہاں قطعی نہیں رہیں گی۔“ میں نے بی جان کے لرزتے وجود کو بھی سمیٹ لیا۔

”ہاں بی جان! اب نہ خالہ بی کا کوئی بناہ چلے گا نہ کسی اور کا۔ بُن یہ آخری بار کہہ رہی ہوں۔ کیوں مجھے گناہ گار کرتی ہیں۔ قبر میں عذاب اٹھاؤں گی میں۔“ عماں رو رہی تھیں۔

”نہ بی بی! ایسے نہ کو۔ اب اور جگہ نہ ہے دل میں۔ سارا تو چھدا پڑا ہے۔“ بی جان نے اماں کو سینے سے لگایا۔

پتا نہیں، کتنی دیر میں یہ طوفان تھا۔ بی جان کو ہی خیال آیا۔ انہوں نے خالہ بی کو کوئی دوادی جس نے انہیں جلد ہی غافل کر دیا۔

”حکیم صاحب نے کہا تھا، جب آپ سے باہر ہوں، یہ کھلا دیتا۔ سوتی رہتی ہیں تو سکون رہتا ہے۔“ بی جان بولیں۔ اتنی دیر میں انہیں کچھ خیال آیا۔ وہ پلشیں۔ ”یہ کس کی پچی ہے؟ عطیہ کی لگ رہی ہے۔“

”نہیں بی جان! انتیا ہے۔ عطیہ تو لندن سے لوٹی ہی نہیں۔“ اماں نے گول مول سا جواب دیا۔

”ارے ہاں! میں نے تو سنا تھا آئی ہوئی ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ بسمی میں ملی تھیں۔ کہہ رہی تھیں کہ دلی اور میرٹھ بھی جاؤں گی۔ پتا نہیں کون کہہ رہا تھا۔ اب دماغ ہی نہیں چلتا۔“ بی جان نے ماتھے کو رگڑتے ہوئے کہد۔

میں انتظار میں تھا۔ دھماکا ہونے والا تھا، کب..... یہ انتظار تھا۔ یہ خوف سب کے چہرے پر تھا۔ طیب تو آیا نہیں تھا ورنہ شاید اس کے تاثرات سب سے مختلف ہوتے۔ فرحت اب بھی انتیا کو تک رہی تھی۔

”اچھا ہاں.....! تو کون ہے یہ؟ کیا نام بتایا؟“ بی جان کو پھر یاد آیا۔ ”تم اس دن آئی تو تھیں۔ کماں چلی گئی تھیں پھر؟“ یہ فرحت تھی۔ گم صم سی پاٹ لجھے میں پوچھ رہی تھی۔ انتیا گھبرا کر ہم سب کو دیکھ رہی تھی۔

”اے! تم جانتی ہو اے۔ میں تو نہ پہچانی۔“ بی جان پھر بول اٹھیں۔ ”ہاں بی جان! اس دن جب میں بیکار ہو گئی تھی نا۔ جب نیا آئے ہوئے تھے

وہ.....“ اب فرحت نے براہ راست مجھ سے کہا۔ ”آپ تھے نا اس روز، چاندنی میں..... چھت پر.....“ پھر وہ گھبرا کر چپ ہو گئی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ بہت غلط بات کرنے والی تھی مگر میں..... میری حالت اس سے بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ مجھے وہ دن نہیں بلکہ وہ رات یاد آگئی جب میں نے فرحت کو چھت پر بلا یا تھا کہ میں اس سے اطمینان کا فیصلہ کر پکھا تھا تبھی وہ آئی تھی مگر وہ فرحت کب تھی۔ فرحت کے روپ میں زیوں ساتھی جس نے خود کو میرے پردہ کر کے جہاں مجھے نئے سورہ سے آشنا کیا تھا، وہاں میرے ضمیر میں گناہ کا بیچ بھی بو دیا تھا۔ احساس جرم کو پیدا کر دیا تھا مگر وہ تو زیوں ساتھی۔ اس نے اعتراض بھی کر لیا تھا اور یہ..... یہ تو انتیا ہے۔ میں نے چوک کر انہیں کی طرف دیکھا۔ وہ نہیں میں نگاہیں گاڑے کھڑی تھی اور فرحت کے چہرے پر بچان لئے جانے کا یقین ہی یقین تھا۔

”اے یہ کہاں؟ وہ کوئی اور ہو گی۔ یہ تو بسمی سے آئی ہے۔“ اماں نے جلدی سے کہا۔

انتیا نے بھر جھری سی لی اور مسکرانے لگی۔ اب وہ نارمل تھی۔ فرحت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہی تھی۔ اس کے یقین کو متزلزل کر رہی تھی اور میں بھنوڑ میں تھلے بہت سی باتیں مجھے یاد آرہی تھیں۔ اس روز اس انجان جسم کی خوشبو، وہ خود پر دگی؛ وہ نشہ اور پھر انہی سے ملاپ کی پہلی رات، اس کے جسم کی خوشبو تو اب تک میرے دماغ میں بھی ہوئی تھی۔ آج میں نے سوچا تو دونوں ایک ہی لگیں۔ مگر..... یہ ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ مجھے چکر آگیا۔ میں لڑکھرایا تو انتیا نے جلدی سے مجھے سارا دیا اور سرگوشی کی۔

”مجھے لگتا ہے فرحت پر بھی دورے پڑنے لگے ہیں۔“

”اے نال! اللہ نہ کرنے۔ ایسا ہو گیا تو خیا..... میں تو کھڑے کھڑے مر جاؤں ک۔ اے حکیم کو تو دلکھاؤ۔“ اماں نے سرگوشی سن لی تھی۔

”نہیں اماں! وہ..... وہ نہیک ہے۔“ میں نے یقین سے بھرپور لمحے میں کہا تو انتیا کاپ اٹھی۔

”اے عصمت! بھاؤ تو اے۔ جب سے کھڑی ہے، اور فرحت..... جاؤ تم کھانے کا کچھ کرو۔ سب تھکے ہارے آئے ہیں۔“ فرحت تیزی سے باہر چلی گئی۔ انتیا خود

ہی پنگ پڑھے سی گئی۔

میں سیدھا باہر نکل گیا۔ فرحت کچن میں تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”فرحت! تم جو کہہ رہی ہو، وہ بچ ہے کیا؟“

”میں..... میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟“ اس نے نگاہیں چراتے ہوئے کہا۔

”میری طرف دیکھو۔“ میں نے سارے مخلفات چھوڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔

”چھوڑیں تو..... یہ کیا.....“ ”وہ گھبرا گئی۔

”میری بات کا جواب دو۔“ میں نے سخت لمحے میں کہا تو فرحت نے چونک کر مجھے دیکھا۔

”ہوا کیا ہے آپ کو؟“ وہ جراث ہو کر بولی۔ ”اگر بچ بھی ہے تو اس میں آپ.....“

”دھوکا ہوا ہے مجھے۔ بر باد ہو گیا ہوں میں۔“ میں پھٹ پڑا۔

”مگر..... کیا کہہ رہے ہیں آپ؟“

”میں بتائی ہوں ضیا!“

اچانک مجھے اپنی پشت پر سے آواز آئی۔ یہ انتہا تھی جو سپاٹ چہرے لئے میرے پیچے کھڑی تھی۔

”تم.....!“

”ہاں ضیا! میں..... میں..... زیوسا ہوں۔“

یہ کتنا برا دھماکا تھا شاید آپ جان ہی نہ سکیں۔ میرے وجود کے پرخے اڑ گئے تھے۔ وہ میری بیوی تھی۔ میرے گھر کی، میرے خاندان کی تباہی کی ذمے دار، بیبا کی قاتل، رابرٹ، جینو، سورن سنگھ، پیاس کو جس نے شدید اذیت میں بٹلا کر رکھا تھا۔ وہ جس نے بڑی بو، تحسین خالہ اور تباہی کی جان لی۔ فرحت کی ماں کی قاتل آج میری بیوی تھی۔ جس کے ساتھ میں نے اپنے ڈھیر سے دن گزار دیئے اور مجھے تباہی نہیں چلا۔ وہ انتہا کے روپ میں مجھے دھوکا دے گئی۔ میں نے جھپٹ کر اسے بالوں سے کپڑا لیا۔ فرحت کے منہ سے بچنے نکل گئی مگر اس نے اپنا منہ بھینچ لیا۔

”چپ رہو فرحت! تمہیں نہیں پتا یہ کون ہے۔ چپ رہو۔“ پھر میں اس کی طرف پہن۔ ”تم نے انتہا کے ساتھ کیا کیا..... جلدی بولو۔“

”وہ..... وہ! ایکسٹرنٹ میں مرگی تھی ضیاء۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ صرف اس کا روپ اختیار کر لیا کہ تم تک پہنچنے کا ایک ہی ذریعہ تھا۔“ وہ منشائی۔

”او..... آکا بآگیا؟“

”وہ سوریا مادر کا پیچاری تھا۔ صدیوں سے قید۔“

”جینو ٹھیک ہو گیا اور باقی سب؟“ میں سوال پر سوال کر رہا تھا اور فرحت آنکھیں پھاڑنے مجھے تک رہی تھی۔

”او..... اور بولو.....“ میں نے اس کے بال کھینچ کر ایک اور جھکتا دیا۔

”سب ٹھیک ہو گئے ہیں۔ و تسلی کو مار دیا میں نے کہ وہ نیا عذاب نازل کرنے والی تھی تم لوگوں پر۔ شالی نیپال کی پھاڑیوں سے اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس نے منے دادا کو گرفت میں لے لیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں بچایا ہے۔ ضیا! یقین کرو، میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔ تم..... فرحت سے شادی کرلو۔ میں کچھ نہیں کروں گی۔ میں..... میں تو خدمت کروں گی۔ میں فرحت کو بھی چاہتی ہوں۔ بہت پیار کرتی ہوں کہ اس نے بھی تمہارے ساتھ مل کر بچپن میں میری حفاظت کی تھی۔ میں صرف تمہارے قریب رہنا چاہتی ہوں۔“

”تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے پورے خاندان کو تباہ کر دیا۔ میرے باپ کو مار دیا۔“ میں نے دانت کچکجا کر کہا۔

”وہ سب جھوٹ ہے جو تمہیں شالی بیانے تھا۔ وہ بھی جھوٹ ہے جو و تسلی نے بتایا۔ یہی دونوں تھے جو ایلن کا نام لے کر اور مجھ سے منسوب کر کے جھوٹ بولتے رہے۔ میں نے عدا کو نہیں مارا تھا، وہ خود اٹھی کر کے مر گیا۔ اس کا غیر میر زندہ تھا۔ اس کی موت کے بعد میں غصے میں آئی تھی۔ میں نے رابرٹ وغیرہ کو اسی لئے سزا دی تھی کہ وہ سب مردہ ضمیر تھے۔ انہوں نے ایلن جیسی معمصہ لڑکی کو تباہ کر کے اذیتیں دے کر مار دیا تھا۔ وہ سب سزا کے مستحق تھے۔ ضیا! یقین کرو۔ عطا میرے لئے دوست تھا اس لئے کہ اس نے وہ زنجیریں ان لوگوں سے اس لئے ہی لی تھیں کہ وہ انہیں ایلن کی قبر تک پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ سب جھوٹے ہیں۔ خدا کے واسطے میری بات پر یقین کرو۔“

پتا نہیں اس وقت کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ بچ بول رہی ہے۔

”تم یقین نہیں کرتے تو میں خود تمہیں دکھا دوں گی۔ میں ثابت کروں گی کہ میں

کرے میں اس وقت روک لیا جب وہ نماز پڑھنے کے بعد باہر آئی تھی۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے فرحت!“

”کیا بات کریں گے؟“ وہ مجھے بچے انداز میں بولی۔

”بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”بہت ضروری ہے؟“ وہ بہت دسمی تھی۔

”بہت ضروری ہے فرحت! کچھ دیر بیٹھ جاؤ۔“

اس نے میری طرف دیکھا پھر پنگ پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے سامنے ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جانتی ہو، انتا کون ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ..... اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”یہ بتانا بہت ضروری ہے فرحت! وہ میری بیوی ہے۔“ اتنا کہہ کر میں نے اس کے چہرے پر رو عمل دیکھا چاہا اگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ دیے ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔

”لیکن یہ شادی میں نے حالات کی لگنی سے بچنے کے لئے کی تھی۔ آج یہ بات کھلی ہے کہ وہ زیوسا ہے جس نے انتا کے مرنے کے بعد اس کا روپ اختیار کر لیا۔ گویا میرے ساتھ صرف ایک روح ہے۔ وہی روح جس کی وجہ سے میرا خاندان جاتا ہوا۔ بہت سی باتیں تم زیوسا سے من چلی ہو، سمجھ بھی گئی ہو گئی مگر میں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے یہ شادی کیسے اور کیوں کرنا پڑی۔“

انتا کہہ کر میں نے بھی میں پیش آنے والے تمام حالات اسے بتا دیئے۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔

”پلیز فرحت! میرا ساتھ دو۔ میں بہت نوٹ چکا ہوں۔ میں..... میں تم سے بھی اطمینان نہیں کر سکا مگر فرحت! میں اپنا ہر لمحہ تمہارے نام کرنا چاہتا ہوں۔ بولو، میں لی جان سے بات کروں؟“

”کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ انتا کی موجودگی میں مان لیں گی؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر لیا۔ ”آپ یہ سب کچھ انہیں تو نہیں بتا سکتے تاں!“

”کیوں نہیں بتا سکتا؟“

”انہیں دکھ ہو گا اور وہ شاید یہ یقین بھی نہ کریں کہ یہ انتا نہیں، زیوسا ہے۔“

مجھے صرف اپنے پاس رہنے دو۔ فرحت تمہاری ہے۔ اسے اپنالو۔“ ”اور اب طیب کو کیا جواب دوں گا۔“ میرے دل کے اندر کمیں وہ ضیا بیٹھا تھا جو فرحت کو آج بھی اپنی ملکیت بنانا چاہتا تھا۔

”وہ چلا جائے گا بھتی۔ اسے مونیکا مل جائے گی۔ وہ فرحت سے پیار نہیں کرتا۔ جذباتی ہے۔ اس کا ذہن پلٹ جائے گا غیاء۔ اس کی فکر نہ کرو۔ میں ازالہ کرنے آئی ہوں۔ ازالہ کر دوں گی ضیا، مگر پلیز، مجھے خود سے جدا مت کرو۔“

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ فرحت کو بختنی سے منع کر دیا کہ وہ کسی کو کچھ نہ کرے۔ انتا میری شکر گزار تھی کہ میں نے کسی کو کچھ نہ بتایا۔

اور مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب خالہ بی دیکھتے ہی دیکھتے اچھی ہو گئیں۔ بیشتر کے والد نے آگر بتایا کہ حویلی پر رنگ کرا دیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کس نے کما تھا تو انہوں نے بتایا کہ عطا خواب میں آگر کہہ گئے تھے کہ گھروالے آرہے ہیں حویلی کو ٹھیک ٹھاک کردا۔ اس رات امال نے بھی ابا کو خواب میں دیکھا اور صبح بتایا کہ وہ کہہ رہے ہیں حویلی تیار ہے، لوت آؤ۔ میں اسی وقت حویلی کیا۔ اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خالی حویلی میں بھی بڑی رونق تھی۔ صاف تھری حویلی دیکھ کر بالکل نہیں لگ رہا تھا کہ یہ اتنے عرصے سے خالی اور دیران تھی۔ امال تو بہت خوش تھیں۔ جب میں نے انسیں وہاں لے کر چلے کا قصد کیا اس سے زیادہ خوش بی جان تھیں۔ ابھی تک امال اور عصمت آپا نے نہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ انتا میری بیوی ہے۔ وہ جب پوچھنے کی کوشش کرتیں، دوسرا نال جاتا اور کوئی بات نکال لیتا۔ میں امال کو حویلی لے کر گیا تو امال نے کہا۔

”وکی کروں ضیا! میری تو ہست ہی نہیں ہو رہی لی جان کو کچھ بتانے کی۔ وہ یہی سمجھ رہی ہیں کہ ہم رشتے کی بات ہی کرنے آئے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں۔“

”میں آج خود بات کروں گا امال! آپ ابھی انہیں کچھ نہ بتائیں۔ بس پوچھیں تاکہ دیں، میری بیٹی ہے اور کچھ نہ کمیں۔“

میں دراصل پلے فرحت سے صاف بات کرنا چاہتا تھا۔ پھر وہ ابھی پوری طرح بات سمجھی بھی نہیں تھی۔ س نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ اسی رات بلکہ شام کو میں نے فرحت کو اس کے

بیانے جب تابوت کھولا تو سولہ سترہ سال کی مخصوصہ سی لڑکی کی لاش اس میں رکھی تھی۔ اس نے سیاہ اباس پہننا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ بیانے وہ دونوں زنجیریں اس کی کلاں میں میں ڈال دیں۔ ہم نے تابوت بند کر دیا اور اس جگہ سے پک آئے۔ بیانہ کہ رہے تھے۔

”یہ سب کچھ کرنے کی تحریک سورن سنگھ نے دی تھی۔ وہ اپنے انعام کو پہنچ چکا ہے ضایع“۔

”کیا مطلب؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”وہ اب دنیا میں نہیں ہے۔“

”اس نے یہ سوچ کر تمہیں نہیں بتایا کہ تم اس سے بدگمان ہو جاؤ گے۔ جاؤ بیٹا! اسے ہمدردی کی ضرورت ہے۔ اسے تم سے پیار ہے، وہ بھی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا۔ وہ ولسا کی عیاریوں اور شالی کی بداعملیوں سے جذبی گئی تھی۔ اب سب تھیک ہے۔ جاؤ، خدا تمہیں خوش رکھے۔“

پھر میری آنکھ کھل گئی۔ بی جان میرے سہانے پیشی رو رہی تھیں۔ میں اچھل کر ٹھیٹا۔ ”مگر..... کیا ہوابی جان؟“

”بیٹا! مجھے ایتا نے سب کچھ بتا دیا۔ تو کیوں دل میں لئے پھر تارہا۔ پگلا..... میں یا لیقین نہ کرتی!“

”اوہ، بی جان.....! آپ کیا..... شاید میرے ساتھ ہونے والے حادثوں پر لوئی بھی لیقین نہ کرے۔“

”تو نہ کرے بیٹا! ہمیں کسی سے کیا لیتا ہے؟“

”بی جان! کیا..... کیا آپ فرحت کو.....“ میں دانتہ چپ ہو گیا۔

”ہاں بیٹا! وہ تمہاری امانت ہے۔ اسے لے کر ہی جان۔ مجھ سے اب یہ بوجھ ڈھونیا میں جاتا۔“

☆-----☆-----☆

اور پھر قارئین! میں نے فرحت سے شادی کر لی۔ ہم دلی لوٹ کر آئے تو پتا چلا کہ بیب بھی جاپکا ہے حالانکہ میں یہ سوچ کر پریشان ہوتا رہا تھا کہ طیب کو کیا جواب دوں گا لریاں آکر پتا چلا کہ ناصر پچا اور ان کی بیوی آئے تھے اور طیب کو لے گئے۔ انہوں نے

”اس کی تم دونوں فکر مت کرو۔“ آواز دروازے کے قریب سے آئی تھی۔ ایتا دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

فرحت گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ باہر جانے لگی۔ زیو سانے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ قھام لئے اور بولی۔ ”فرحت! تم عورت ہو، میرا دکھ سمجھ سکتی ہو۔ پلیز.....! مجھے غلط مت سمجھو۔ ضیاء تمہارا ہے اور تمہارا رہے گا۔ اس کے لئے میں بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔ مجھے تم بھی اتنی ہی پیاری ہو جتنا خود فیض! اس لئے کہ اس کے دل دماغ میں تم بستی ہو۔ بی جان سے آج رات میں بات کرلوں گی۔“

فرحت نے سراٹا کر کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں بیکھی ہوئی تھیں۔ ”کہتی ہو کہ میں عورت ہوں، دکھ سمجھ سکتی ہوں پھر بھی مجھ سے توقع رکھتی ہو کہ میں تمہارے راستے میں آؤں گی؟ جسے تم نے اتنی مشکلوں سے حاصل کیا ہے۔ اسے تم سے کیسے چھین لوں؟ میری فکر مت کرو زیو سا.....! بس یہ سب کچھ جو ہوتا رہا اور جو ہو رہا ہے اسے.....! اسے ٹھیک کر دو۔ ضیا کو عذابوں سے نجات دلا دو۔ یہی میرے لئے کافی ہے۔“

زیو سانے آگے بڑھ کر فرحت کو سینے سے لگالیا۔ فرحت رو دی۔ میں عجیب سی کیفیت میں بیٹا ہو گیا۔ مجھے پہلی بار زیو سا سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ یوں تو اس نے اب تک کے حالات کی جو تفصیل بتائی تھی، اس نے میرا دل صاف کر دیا تھا مگر پھر بھی میں رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔

اسی رات میں نے وہی خواب دیکھا جو بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا۔ وہی قبرستان تھا۔ وہی سیاہ دین تھی اور اس میں بیان کے ساتھ دوسرے دوست بھی تھے مگر اب باقی دوست یعنی رابرٹ، پاس ٹریگو، جینو بیا ریکو اور سورن سنگھ چاروں دین کے قریب کھڑے تھے۔ صرف بیان آگے بڑھے۔ میں ویسے ہی درختوں کی اوٹ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ اچانک بیان میری طرف رخ کر کے مکرائے اور انہوں نے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں ڈرتے ڈرتے ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے کہا۔

”ضیاء! زیو سا ٹھیک کہتی ہے۔ تم نے اسے زنجیر دے کر اچھا کیا۔ آؤ دوسری زنجیر میرے پاس ہے۔ میں رابرٹ سے لے چکا تھا۔ آؤ، ہم یہ دونوں زنجیریں ایں کے تابوت میں رکھ دیں۔“

پھر بیانے بڑی آسانی سے قبر کی تمام مٹی ہٹا دی۔ میرے سامنے منتشی تابوت تھا۔

سکھ کا سانس نہیں لیا تھا اس نے۔

آخری لمحوں میں فرحت نے مجھے بلا کر کھاتھل۔ ”جانتے ہیں مجھے کیا دکھ ہے؟“

”نہیں فرحت! میں نہیں جانتے۔ پلیز، تم کیوں دکھ پال رہی ہو۔ اب کیا کمی ہے، کیا بات ہے، میں تو ہر لمحہ تمہاری نذر کچکا ہوں۔“

”یہی دکھ ہے مجھے۔ زیوسانے آپ سے پیار کیا، وہ کمال سے کمال آئی، اس نے کتنی بڑی قربانیاں دیں اور..... اور آپ اس سے بات تک نہیں کرتے۔ زیوسا نے مجھے کما تھا تاکہ تم عورت ہو۔ میرا دکھ جان سکتی ہو تو خیا..... وہی دکھ ہے جو مجھے انتبا اور آپ کے درمیان حائل ہونے سے روکتا ہے۔ مگر آپ..... آپ عدالت نہیں کرپاتے۔ انصاف نہیں دے پاتے۔ پلیز خیا! اس کا خیال رکھئے گے۔ آپ کو..... آپ کوپتا ہے کہ وہ..... ماں بننے والی ہے؟“

”یہ سن کر میں اچھل پڑا تھا۔“ کہک..... کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”ہاں! آپ نے تو اس پر نگاہ ڈالنا بھی گناہ سمجھ لیا ہے۔ وہ آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس کو آپ کے پیار کی ضرورت ہے۔ خیاء! اب میں..... میں حائل نہیں رہوں گی۔ اس کا خیال رکھئے گے۔“

یہ آخری گفتگو تھی ہمارے درمیان پھر فرحت اسی رات پہنچ کے سے ہماری راہ پھوڑ گئی۔ عجیب ہو جاتی ہے کبھی کبھی یہ عورت دیوارین جاتی ہے اور بھی.....

فرحت کی موت کے بعد زیوسانے مجھے کما تھا کہ فرحت کے جسم کو نہ دناؤ۔ اس نے کما کہ وہ اس کی حفاظت کرے گی مگر مجھے یہ بات بہت فضول گئی تھی۔ میں یہ تو سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ غم کی انتہائی حد پر ہے اس لئے ایسا کہہ رہی ہے اور پھر یہ کب ہوا ہے کہ جو مر گیا ہو، اسے گھر کے کسی کرے میں محفوظ کر کے رکھا گیا ہو۔ یہ بات مذہب کے بھی خلاف تھی میں نے زیوسا کے اصرار کے باوجود اسے دقا دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے بعد زیوسا بہت غم زدہ رہنے لگی تھی۔ فرحت کی جداگانی میرا سب سے بڑا غم تھا مگر زیوسانے اسے بہت جلدی کم کر دیا۔

وہ اب بھی مجھے یہ بتانے پر تیار نہ تھی کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے مگر اب میں جان گیا تھا۔ جب میں نے اسے کما کہ میں یہ بات جانتا ہوں تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور بولی۔

اس کی شادی کسی موئینکا نامی لڑکی سے طے کردی تھی۔ طیب یہ سن کر ایک منٹ بھی نہیں رکا اور خوشی خوشی بسمی چلا گیا۔

انہی دنوں پاکستان بن گیا۔ میں انتبا، زیوسا، اماں، عصمت آپا اور منے دادا، منی دادی کو لے کر پاکستان میں چلا آیا۔ منے دادا اور منی دادی فرحت کو میرے ساتھ دیکھ کر حیران ضرور ہوئے تھے مگر جب میں نے انہیں بتا دیا تو وہ خاموش ہو گئے۔ منے دادا نے شالی بیبا سے رابطہ توڑ لیا تھا کیونکہ بقول ان کے شالی بیبا نے انہیں ایک عمل بتایا تھا جس سے انتبا مکڑی میں تبدیل ہو جاتی اور اس مکڑی کو پکڑ کر شالی بیبا کے حوالے کرنا تھا۔ جب انہیں میں نے سب کچھ بتایا تو وہ یقین نہیں کر رہے تھے مگر انتبا نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ غلط نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہوا، اس میں سراہمروں تسلیا کا ہاتھ تھا۔ ہاں، تو میں بتا رہا تھا کہ ہم پاکستان پلے آئے۔ کچھ عرصے بعد ناصر پچا وغیرہ بھی سب

کو لے کر پاکستان آبے۔ اماں کا میساں آنے کے تیرے برس انتقال ہو گیا۔ وہ بہت بیمار رہیں اور ان کی خدمت میں انتبا نے دن رات ایک کر دیتے۔ فرحت اب بھی بھجی بھجی تھی حالانکہ انتبا بہت محظا طریقی تھی مگر پتا نہیں اسے اب کیا غم تھا کہ جو اندر ہی اندر اسے گھلرا رہا تھا۔ اماں کے انتقال کے فوراً بعد ہی فرحت بیمار پڑ گئی۔ انتبا اس کی خدمت میں لگ گئی۔ عصمت آپا کی میں نے پاکستان آتے ہی ایک بھرے شادی کر دی تھی جو اسی محلے میں رہتا تھا جس ہم نے آکر قیام کیا تھا۔ وہ مگر عصمت آپا کو دے دیا تھا اور خود یہاں چلا آیا تھا۔ یہ مکان انتبا نے..... سوری! اب میں اسے زیوسا کوں گا۔ تو یہ مکان زیوسا نے پسند کیا تھا۔ منی دادی اور منے دادا بڑا عرصہ ہمارے ساتھ رہے پھر ناصر پچا آکر انہیں لے گئے۔ ان کے انتقال کو بھی اب برسوں گزر چکے تھے۔ پی جان تو شاید فرحت کے بیانہ کے انتظار میں تھیں۔ پاکستان بننے سے پہلے ہی ہم سے منہ موڑ گئیں۔ غالباً یہ ان کے پیچھے ہی روانہ ہو گئیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ فرحت کی موت تھی۔ ہاں.....! فرحت کھل کھل کر مر جانے کے لئے نہ آتے نہ توٹ کر چلا تھا۔ ہر لمحہ اسے خوش پہنچانے کی سعی کرتا رہا مگر..... ممکن ہے، وہ زیوسا کو الازم دیتی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ زیوسا نے اپنا حق ادا کر دیا۔ اس نے واقعی جو غم دیتے تھے، ان کا ازالہ کر دیا تھا میرے گھر کے ہر معاملے کو سنبھالا۔ عصمت آپا کی شادی کی۔ منی دادی اور منے دادا کی خدمت کی۔ اماں کی خدمت کی، پھر فرحت کی تمام دیکھ بھال کرتی رہی۔ ایک پل کو بھی

قارئین! وہ کمالی سا کر گمرا سانس لے کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے۔ ”میں سیاہی! کہئے؟ کیسی لگی یہ طویل کمالی۔ ویسے قارئین کیا کہتے ہیں اس بارے میں؟“

”قارئین تو بہت پسند کر رہے ہیں شاہ بابا! لیکن یہ بتائیے کیا میں زیوسا سے بات بھی نہیں کر سکتی؟“

”ہوں.....! بات تو کر سکتی ہیں بلکہ میرے بیٹے سے بھی بات کر سکتی ہیں۔ مگر پلی! ان سے کمالی نہ پوچھنے بیٹھ جائے گا۔ دوسری بات یہ بھی کہ اگر آپ میری کمالی کو غلط یا جھوٹ بکھ کر زیوسا سے ملنا چاہتی ہیں تو آپ اپنا اطمینان کر لیں مگر.....“

”نہیں شاہ بابا! میں قطعی اسے جھوٹ نہیں سمجھ رہی کیونکہ میں نے ابھی..... اور شروع میں بھی زیوسا کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ ممکن ہے دوسرے لوگ اس کی صداقت کو نہ سمجھیں۔“

”بھجے اصرار بھی نہیں ہو گا۔ یہ تو حسین نے آپ کو میرے پیچھے لگا دیا ورنہ میں اپنی دنیا میں مگن ہوں۔ آپ بیٹھیں، میں زیوسا کو بلا کر لاتا ہوں۔“

پکھ دیر بعد خیا صاحب المعروف شاہ بابا کمرے میں واپس آئے۔ ایسا لگ رہا تھا ہے انہوں نے اپنی گود میں کسی کو انھیا ہوا ہے۔ ان کا بازو ہوا میں بالکل اسی ڈھب سے مڑا ہوا تھا جیسے ہمارا بازو پچ کو گود میں لیتے ہوئے مڑا ہوتا ہے۔

”آؤ زیوسا! انہوں نے اپنے پیچھے خلا میں دیکھتے ہوئے کہ۔

میرے بدن میں چیزوں نیاں سی رینٹنے لگیں۔ میں سخت ہر اس بھی تھی اور خود کو بت ہمت دلا رہی تھی کیونکہ آج میرے ساتھ میری زندگی کا سب سے اہم واقعہ ہونے والا تھا۔ میں ایک ایسی ہستی سے ہمکلام ہونے والی تھی جو یوں ان کی دیوبھی کی حیثیت سے کارخ کے صفات پر محفوظ تھی اور ہے اور وہ نظروں سے او جھل تھی۔ کسی لگاہ سے او جھل ہستی سے بات کر لینے کا خیال برا خوفناک بھی اور برا ایکسانشگ بھی تھا۔

خیا صاحب میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئے پھر ان کی لگاہ مجھ پر پڑی۔ شاید میرا نگ فق ہو رہا تھا۔ وہ چوکے۔

”آپ ڈر رہی ہیں کیا؟“

”ن..... نہیں تو.....“ میں نے تھوک نگل کر خٹک حلق کو ترکرنے کی

”پھر ضیا! آپ نے فرحت کی بادی کیوں نہیں رکھ لی؟“  
میں حیران رہ گیا۔ ”اس بات سے فرحت کی بادی کا کیا تعلق؟“  
”ہے ضیا! ہے تعلق۔ میں اس کے روپ میں ساری زندگی آپ سے محبت پاتی رہتی۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے رہتی۔“  
”مگر اس کے لئے تمہیں فرحت کا روپ لینے کی ضرورت نہیں۔ تم اب بھی میرے سامنے ہو۔“

”نہیں! صرف چند دن اور ہیں ضیا! میں نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ میں اینتا کے جسم کو زیادہ عرصے استعمال نہیں کر سکتی۔ اس کی مدت پوری ہونے والی ہے۔ وہ کرچکن تھی جبکہ میں مسلمان ہو چکی ہوں۔ اب مجھے یہ جسم چھوڑتا ہے اور اگر مجھے وقت پر کوئی جسم نہ ملا تو میں کبھی پھر کسی کا روپ اختیار نہیں کر سکوں گی۔ تب..... آپ کا پچھہ بھی..... کسی انسانی روپ میں نہیں آسکے گا۔“

یہ بات میرے لئے پریشان کن تھی مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ زیوسا کا کہنا تھا کہ زمین کو سونپ دیئے جانے والی وہ کوئی میت استعمال نہیں کر سکتی اور وقت بہت کم ہے کہ کسی ایسی عورت کے مرنے کا انتظار کیا جاسکے جو میرے ساتھ بھیثت یوں کے رہ سکے اور اس کی یہ بھیثت کسی کے لئے مسئلہ پیدا نہ کرے۔ اگر زیوسا مجھے پہلے ہی یہ بات بتا دیتی تو شاید میں سنجیدگی سے سوچتا مگر زیوسا کی بات بھی ٹھیک ہے کہ وہ فرحت کی زندگی میں ایسی بات کیسے کر سکتی تھی۔

تو پھر یہ ہوا کہ ایک اذیت ناک رات آئی اور زیوسا کو اینتا کا جسم چھوڑنا پڑا۔ وہ سب کی لگاہوں سے او جھل ہو گئی۔ اینتا کا مردہ جسم دفتار دیا گیا۔ لوگ سمجھے میری دوسری یوں بھی مر گئی مگر زیوسا میرے ساتھ ہے میرا ایک بیٹا بھی ہے، جسے میں تو دیکھ سکتا ہوں مگر وہ اور زیوسا..... میرے علاوہ کسی کو دکھائی نہیں دیتے۔ لوگ مجھے خوش و خرم، بنتا مکرتا دیکھ کر پاگل سمجھتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ کیے بعد دیگرے دو یوں کی موت نے مجھے پاگل کر دیا ہے مگر نہیں جانتے کہ زیوسا نے مجھے ہر غم سے دور کر دیا ہے۔ فرحت کی موت کا صدمہ یقیناً برا خوفناک تھا اور ایک عرصے تک میں حواس باختہ بھی رہا تھا مگر زیوسا نے دھیرے دھیرے مجھے دکھ کے اس بھنوڑ سے نکال لیا۔“

☆-----☆-----☆

"زیوسا! یہ تم سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" انہوں نے اپنے برادر میں ایسے دیکھا جیسے کسی سے مخاطب ہوں۔

"کیسی ہیں آپ؟" ایک مترنم اور عجیب ہفتتی سی آواز نے مجھے ساکت کر دیا۔ میرے روئے کھڑے ہو گئے پھر مجھے اس کی بھی کی آواز سنائی دی۔ "میں..... ٹھیک ہوں۔ میں..... آپ کو دیکھنا چاہتی تھی۔" بمشکل میرے منہ سے نکلا۔

"اس پر مجھے دسترس نہیں ہے ورنہ میں آپ کی خواہش ضرور پوری کرتی۔" "یہ لیں سیما! ہمارے بیٹے سے ملیں۔" اتنا کہہ کر ضیا صاحب نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے ایسے فرش کی طرف ہاتھ کے جیسے اپنی گود سے بچے کو اتار کر قالین پر بٹھا رہے ہوں۔ "جاوہینا آئی کو سلام کرو۔"

میرے بدن میں چیزوں کی تعداد بڑھ گئی۔ ریڑھ کی ہڈی میں سناہت ہونے لگی۔ چند ہی لمحے بعد دونخے نئے ہاتھوں نے میرے گھٹنے تھام لئے اور وہ ہاتھ زور دے کر یوں میرے ہاتھوں تک آئے جیسے گھٹنے چلے والا پچھہ میرے گھٹنوں پر زور دے کر کھڑا ہو گیا ہوا اور میرے ہاتھ تھامنے کی کوشش کر رہا ہوتا۔

"لیکن کبھی،" میرا دل چاہا کہ میں ایک زور دار جیخ مار کر باہر کی طرف بھاگ پڑوں گر حسین بھائی جو میرے ساتھ تھے مجھے گھورنے لگے اور میں نے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے ہے دونخے میں ہاتھوں نے تھام لیا۔ ضیا صاحب کی بھتی کے علاوہ ایک اور ہفتتی ہوئی بھی گوئی اور بڑی مخصوص سی "میں غوں، آ..... پا۔" کی آواز بھی آئی اور پچھے قلقاری مار کر ہنس پڑا جیسے ماں باب کا ساتھ دے رہا ہو۔

یہ آخری سطرس لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کا نپ رہے ہیں۔ یہ میری زندگی کا عجیب ترین لمحہ تھا۔ جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس میں کال بیتل کا کیا ذکر تھا جو میں نے کہانی کا عنوان رکھ دیا وہ بھی سن لیجھے کیونکہ یہ بات مجھے شروع شروع میں ضیا صاحب نے کسی تھی کہ اس کا عنوان کال بیتل رکھتے گا۔ میں نے ان سے آخری ملاقات کے اختتام پر پوچھا تو

انہوں نے جواب دیا۔

"اس لئے کہ جو دائیں ہاتھ پر نی کال بیتل آپ نے دبائی تھی، صرف وہی دبانے پر آپ کی ہم سے ملاقات ہوئی ہے اور آج حسین کو میں پہلی مرتبہ بتا رہا ہوں۔ شاید یہ اتفاق تھا کہ اس نے بیشہ یہی کال بیتل استعمال کی ہے ورنہ بائیں جانب دوسری کال بیتل ہے جو عام استعمال میں آتی ہے۔ اگر بائیں ہاتھ کی کال بیتل باتیں تو آپ کی اس فیملی سے ملاقات ہوتی جو اس گھر میں رہتی ہے۔ ہم نہ ملتے۔"

"کیا مطلب؟" میں جیران ہوئی۔ حسین بھی چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔

"مطلوب یہ کہ بی بی! آج میں ایک سو میں برس کا ہو چکا ہوں۔ ایک سو برس پورے کرنے کے بعد ہی زیوسا کی طاقت سے میں نے اپنا جسم دوبارہ حاصل کر لیا۔ ضیاء، یعنی میں، ضیا کے جسم کو ترسال کی عمر میں ہی چھوڑنے پر بجور ہو گیا تھا کیونکہ میری موت واقع ہو چکی تھی مگر زیوسا نے میرے جسم کو محظوظ کر لیا تھا۔ میں ٹھیک ایک سو برس کے بعد وہ جسم دوبارہ حاصل کر سکتا تھا۔ آج مجھے یہ جسم حاصل کئے ہوئے بارہ برس گزرے ہیں اور میں اس پر دسترس رکھتا ہوں کہ جسم کے ہوتے ہوئے بھی سب سے اپنے آپ کو مخفی رکھ سکوں۔ تو دائیں ہاتھ کی کال بیتل میری فیملی سے ملا دیتی ہے اور بائیں ہاتھ کی کال بیتل اس گھر میں رہنے والی دوسری فیملی سے۔ یعنی یوں سمجھ لیں کہ ہم لوگ دنیا میں نہیں ہیں۔"

میں کا نپ اٹھی۔ حسین بھائی کے چڑے پر بھی زور لے کے سے آثار پیدا ہوئے۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ضیاء صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"خدا حافظ حسین! تم جب بھی ملنا چاہو، اسی کال بیتل کے بجانے کے بعد مل سکتے ہو اور آپ بھی آئیے گا سیما!"

مگر ہم لوگ انہیں خدا حافظ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ مطلق خشک تھے اور ٹانگیں کاٹپ رہی تھیں۔ دیے مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ شاید ضیا صاحب مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔ یہ خیال جب میں نے حسین بھائی کو بتایا تو وہ بھی چونکے مگر اس وقت تک ہم گیٹ تک پہنچ پکے تھے۔ ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ ضیا صاحب ہاتھ ہلارہے تھے۔ ہم لپک کر گیٹ سے باہر آگئے۔ حسین بھائی نے سب سے پہلے دائیں طرف دیوار پر دیکھا۔ وہ کال بیتل کی میں اُن پتوں کے پیچے چھپی ہوئی تھی اور دائیں بائیں طرف بھی ایک کال بیتل کا بُش

تھا جو صاف ستمہ اور چمکدار تھا۔ حسین بھائی نے بے اختیار وہ بٹن دبادیا۔ چند ہی لمحوں بعد ایک نوجوان میں بائیس برس کا لڑکا ہمارے سامنے تھا۔ ”جی! کس سے ملنے گا؟“

”وہ یہاں..... ضیاء صاحب رہتے ہیں؟“ حسین بھائی نے کہا۔

”جی! ضیاء صاحب؟ نہیں..... تو..... یہاں ملک اشرف محمود صاحب رہتے ہیں۔ میرے والد.....“ اور میں حسین بھائی کا بازو کپڑا کر انہیں گھستی ہوئی گاڑی تک لے آئی۔

☆-----☆-----☆

قارئین! میں نہیں جانتی کہ اس ملاقات کے بعد مجھے میں ایسی کیا بات پیدا ہو گئی تھی کہ لوگ مجھے دیکھ کر چونک اٹھتے تھے مگر ایسا صرف تھوڑے عرصے تک رہا پھر سب نارمل ہو گیا مگر میں..... ابھی تک نارمل نہیں ہوں۔

ختم شد